اقبال اور قادیانیت

تحقیق کے نئے زاویے

بشیر احمد ایم۔ اے

(فلیچر سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی یو ایس اے)

مجلسِ علم ودانش

پوسٹ بکس نمبر 639 راولپنڈی

اقبال اور قادیانیت

تحقیق کے نئے زاویے

بشیر احمد ایم۔ اے
(فلیچر سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی یو ایس اے)

مجلسِ علم ودانش
پوسٹ بکس نمبر 639 راولپنڈی

انتساب

صدیقی العزیز

شکیل عثمانی

کے نام

جن کی تحریک پر یہ کتاب لکھی گئی اور جنھوں نے اس کی ترتیب و تدوین
اور اس کے لئے بعض نکات کی تفہیم و تعبیر میں مدد کی

مجلسِ علم ودانش

مجلسِ علم ودانش ایک آزاد تحقیقی ادارہ ہے۔اس کا کسی سیاسی یا مذہبی جماعت، تنظیم یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ کوئی این جی او ہے۔

مجلس کا بنیادی مقصد پاکستان کی سلامتی، استحکام اور ترقی کے لیے معاشرے میں امن، یک جہتی اور باہمی یگانگت کو فروغ دینا ہے۔اس کے روح رواں جناب بشیر احمد ہیں جو ''قادیان سے اسرائیل تک''، ''بہائیت، اسرائیل کی خفیہ سیاسی تنظیم''، "Ahmadiyyah Movement: Brithish- Jewish Connections"، ''تحریک احمدیہ: سامراجی ویہودی گٹھ جوڑ (مترجم احمد علی ظفر)''، ''فری میسنری، اسلام دشمن خفیہ یہودی تنظیم'' اور ''بائبل کا تحقیقی جائزہ'' جیسی فکر انگیز کتابوں کے مصنف ہیں۔

ناشر

تقدیم

ڈاکٹر سفیر اختر

احمدی تحریک کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس تحریک کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (1835ء۔ 1908ء) نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز ایک مناظر کے طور پر کیا تھا۔ انہوں نے مسیحی پادریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں کے اعتراضات کے جواب میں اسلام کی حقانیت پر سینکڑوں دلائل دینے کا دعویٰ کیا تھا، اور جب مخالفینِ اسلام کو مرزا صاحب نے ان ہی کے جارحانہ لہجے میں مخاطب کیا تو مرزا صاحب کے لیے بہت سے دلوں کے دروازے وا ہو گئے تھے۔ پچاس جلدوں میں ''براہینِ احمدیہ'' کی تالیف کے دعوے (جو پانچ جلدوں سے آگے نہ بڑھ سکی) اور ''سرمۂ چشم آریہ'' نے ان کی شہرت کو پنجاب کے ایک گمنام قصبے ''قادیان'' سے نکال کر برصغیر کے ایک بڑے حصے تک پھیلا دیا تھا۔ مرزا صاحب نے ابتداء میں جو کچھ لکھا، وہ ان کے معاصر مسلم اہلِ قلم کی تحریروں سے زیادہ مختلف نہ تھا، بلکہ ان کے ہاں مولوی چراغ علی اور بعض دوسرے بزرگوں سے استفادے کی واضح شہادتیں موجود ہیں، تاہم مرزا صاحب کے لب و لہجے میں ماموریت من اللہ کی تعلّی بہت نمایاں تھی جس نے انہیں ملہم، محدث، مسیح موعود، مہدی معہود اور نبی کے دعووں تک پہنچا دیا، اور یوں امتِ مسلمہ کی نمائندگی کرنے کے بجائے انہوں نے اس کے بالمقابل ایک نئی امت کھڑی کر دی جس کی اطاعت کا مرکز و محور مرزا صاحب کی ذات تھی۔

مرزا صاحب کے ان دعووں کا ذمہ دار علمائے کرام نے بروقت نوٹس لیا، اور انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔ علمائے کرام کے اس فتوے یا فیصلے کو ان لوگوں نے تو اہمیت دی جو مرزا صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرتے تھے، مگر ان افراد کے ہاں، جو مرزا صاحب کی تحریروں کے قاری نہ تھے، یہ فتویٰ اولاً اس لیے پذیرائی حاصل نہ کر سکا کہ ان کے ہاں، علمائے کرام کا تاثر ''جھگڑالو مولوی'' کا تھا جو شیعہ۔سنی، مقلد۔غیر مقلد، وہابی۔غیر وہابی اختلافات میں عدم برداشت کا اظہار کرتے رہتے تھے، ثانیاً مرزا صاحب اور ان کے پیرو کار سماجی سطح پر خدمتِ اسلام کا امیج برقرار رکھے ہوئے تھے، اور غالباً انسانی خصائل کے اعتبار سے وہ نسبتاً بہتر افراد تھے۔

علامہ اقبال (1877۔ 1938ء) کا شمار بھی ان ہی آخر الذکر لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک عرصے تک مرزا صاحب کی تحریروں کا مطالعہ نہ کیا، علمائے کرام کی تنگ نظری کے شاکی رہے، اور مرزا

صاحب کے پیروکاروں کے ساتھ اپنے سماجی تعلقات کے تحت احمدی تحریک سے اچھی توقعات وابستہ رکھیں۔ مرزا صاحب جن دنوں (1864ء۔1868ء) سیالکوٹ میں مقیم تھے، ان کی علامہ اقبال کے والدِ گرامی، شیخ نور محمد اور استادِ محترم، مولوی سید میر حسن کے ہاں نشست رہتی تھی۔ مولوی سید میر حسن کے چچازاد بھائی میر حسام الدین اور پھر میر حسام الدین کے صاحبزادے میر حامد شاہ مرزا صاحب کے پیروکاروں میں سے تھے۔ اسی طرح مرزا صاحب کے ایک بڑے جذباتی مرید مولوی عبدالکریم سیالکوٹی، علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کے احباب میں سے تھے۔ علامہ اقبال کے بچپن کے ساتھیوں اور ہم جماعتوں میں بھی چند نمایاں احمدیوں کے نام آتے ہیں۔ اس سماجی تناظر میں علامہ اقبال نے مرزا صاحب اور احمدی تحریک کے بارے میں اچھی رائے قائم کی اور خطبۂ علی گڑھ (1910ء) The Muslim Community: A Sociological Study میں یہ کہا کہ ''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں''۔

علامہ اقبال کو احمدی جماعت کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا، جب 1931ء میں انہوں نے اس جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد (1889ء۔1965ء) کے ساتھ آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں کام کیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم پر کام کرتے ہوئے علامہ اقبال پر واضح ہوا کہ احمدی جماعت اسلام اور کشمیری مسلمانوں کے درد کے نام پر اصلاً اپنے گروہی مقاصد کے لیے کوشاں ہے، چنانچہ انہوں نے احمدی تحریک کا سنجیدہ مطالعہ شروع کیا، جس کا اظہار ان تحریروں کی شکل میں ہوا جن کی چبھن احمدی جماعت آج تک محسوس کرتی ہے۔ علامہ اقبال نے احمدی جماعت کے وکیل صفائی پنڈت جواہر لال نہرو کو جو اپنی قوم پرستی کے سبب معروف تھے، دوٹوک الفاظ میں لکھا:

''میں اس بات میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں''۔

علامہ اقبال کی رائے سے احمدیوں کا اختلاف تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات عجیب لگتی ہے کہ وہ علامہ کی اس رائے کو ان کی آخری اور حقیقی رائے کیوں نہیں سمجھتے؟ اور بار بار علامہ کے اُن اکادکا جملوں کا ذکر کرتے ہیں جن پر انہوں نے خود خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے۔ غالباً یہ مرزا صاحب کی اس مناظرانہ روایت کا تسلسل ہے کہ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اختلاف نظر رکھنے والوں کو مسلسل چیلنج دیتے چلے جایئے، اس

روایت کا ایک مظہر ڈاکٹر جاوید اقبال کی تالیف ''زندہ رود'' کی اشاعت پر سامنے آیا۔ جاوید اقبال صاحب نے علامہ اقبال کی زندگی کے آخری برسوں پر لکھتے ہوئے احمدی تحریک کے بارے میں ان کے فکر و نظر کا حاصل پیش کیا ہے۔ اُن سے بہت پہلے 36-1935ء کے واقعات کے حوالے سے احمدی جماعت کے سرکاری مورخ دوست محمد شاہد ''تاریخ احمدیت'' میں اپنے سارے زورِ قلم کے ساتھ احمدی نقطۂ نظر بیان کر چکے تھے۔ ''زندہ رود'' نہ احمدی تحریک کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی تھی، اور نہ علامہ اقبال کے افکار کے حوالے سے احمدی نقطۂ نظر پردۂ خفا میں تھا، مگر مناظرے کے خوگر احمدی قلم کاروں نے ''زندہ رود'' کو موضوع بحث بنالیا، اور شیخ عبدالماجد صاحب نے یکے بعد دیگرے دو کتابیں تالیف کر دیں۔

شیخ عبدالماجد صاحب نے بانی تحریک کی روایت کے مطابق بھرپور تعلّی سے کام لیا، اور ''زندہ رود'' کے مصنف کو دعوتِ مبارزت دی۔ بعض اہلِ قلم نے شیخ عبدالماجد صاحب کی کتابوں کا جائزہ لیا ہے، مگر جس دقیقہ رسی سے ان کا جائزہ لیا جانا چاہیے تھا، یہ وطنِ عزیز کے معروف مصنف جناب بشیر احمد کے لیے مقدر تھا، جنہوں نے احمدی تحریک کا مطالعہ ایک مورخ اور سماجی علوم کے ماہر کی حیثیت سے کیا ہے، اور اس میں ان کا کوئی معاصر، ان کا حریف نہیں۔ اُن کی احمدی لٹریچر پر جتنی گہری نظر ہے، اس کی جھلکیاں ان کی سابق تالیف Ahmadiyya Movement: British-Jewish Connections (اردو ترجمہ: تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ) کے ساتھ زیرنظر کاوش میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جناب بشیر احمد کی زیرنظر کاوش سے شیخ عبدالماجد صاحب کے ہم عقیدہ دوست مطمئن ہو جائیں گے، اور وہ احمدی تحریک کے بارے میں علامہ اقبال کی آخری رائے ہی کو اُن کی اصل رائے مان لیں گے، تاہم غیر جانب دار قاری پر یہ بات ضرور واضح ہو جائے گی کہ احمدی قلم کار علامہ اقبال کی 36 -1935ء کی تحریروں کو کیوں بھلا نہیں سکتے؟ نیز یہ امر بھی واضح ہو جائے گا کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حق کو حق سمجھنے اور باطل کو باطل سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اسلام آباد

6 جون 2005ء

دیباچہ

شکیل عثمانی

راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی 24، 25 مارچ 2005 میں لکھا تھا ''اقبال شکنی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ صرف دہلی اور لکھنو کی اردو کو مستند سمجھنے والوں' غالی وحدت الوجودیوں اور نام نہاد روشن خیالوں کے علاوہ بائیں بازو کے دانشور بھی اس روایت کے علمبردار رہے ہیں، قادیانیوں کو اس ضمن میں پانچویں سوار کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں قادیانیت سے اختلاف کا اظہار کرتے رہے لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر (جو ایک مفصل اور مبسوط تحریر کی متقاضی ہیں) انہیں بہ اِمعان نظر قادیانیت کے مطالعے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ اُس بھرپور رائے کا اظہار نہیں کر سکے جو انہوں نے 1935ء میں کی کہ حکومت قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ جماعت تسلیم کرے''۔ اب راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ زیرنظر تصنیف میں جناب بشیر احمد نے اس حسن وخوبی سے ان وجوہ کو بیان کیا ہے کہ بحث ونظر کا یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اقبال کو بوجوہ قادیانی تحریک کا بہ امعان نظر جائزہ لینے کا موقع نہیں مل سکا۔ اِس کا اظہار اُس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے 13 نومبر 1915ء کو ہفت روزہ ''پیغام صلح'' لاہور کے ایڈیٹر کو لکھا۔ اِس خط میں اِقبال نے اپنے اُس خط کو بھی درج کردیا ہے جو انہوں نے اس سلسلے میں اپنے دوست سید بشیر احمد کو لکھا تھا۔ اقبال لکھتے ہیں:

> ''انعام اللہ شاہ سیالکوٹی نے مجھ سے یہ منسوب کیا ہے کہ میں نے کسی محفل میں کہا کہ عقائد کے لحاظ سے [جماعتِ احمدیہ] قادیان والے سچے ہیں لیکن مجھے ہمدردی [جماعتِ احمدیہ] لاہور والوں سے ہے۔ اختلافِ سلسلہِ احمدیہ کے متعلق وہی رائے دے سکتا ہے جو مرزا [غلام احمد قادیانی] صاحب کی

تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں''

(کلّیاتِ مکاتیبِ اقبال جلد اول مرتبہ مظفر حسین برنی ص 431)

اسی خط میں اقبال لکھتے ہیں''اتنی بات ضرور ہے کہ میں نے کتاب حقیقت النبوۃ [مصنفہ امامِ جماعتِ احمدیہ مرزا بشیرالدین محمود] کی بہ لحاظ اسکی ترتیب کے تعریف کی تھی''۔ اقبال کے اس جملے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا کہ انہوں نے اس کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا کیونکہ اقبال جیسا عبقری کسی کتاب کو سرسری طور پر دیکھ کر یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ بہ لحاظِ ترتیب یہ کیسی ہے۔

اس کے علاوہ 11 اپریل 1916ء کے روزنامہ الفضل قادیان میں اقبال کے ایک مضمون کا اقتباس اس طرح شائع ہوا ہے:

''لمعات میں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہے جس کا انکار مستلزمِ کفر ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے''

(قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ از پروفیسر الیاس برنی ص 61 مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کا ایڈیشن)

اس اقتباس میں لفظ''اگر'' قابل غور ہے۔ اس اقتباس کے مطابق اُس وقت اقبال کے سامنے ایسے واضح شواہد نہیں تھے کہ قادیانی بنی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کی آمد کے قائل ہیں جس کا انکار مستلزم کفر ہے۔

اقبال کی عام سوانح عمریوں میں انکی مرزا غلام احمد قادیانی سے ملاقات کا ذکر نہیں ملتا۔ اس ملاقات کا انکشاف غالباً سب سے پہلے جماعتِ احمدیہ لاہور کے امیر مولانا محمد علی لاہوری نے کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں اکتوبر 1934ء میں ڈاکٹر اقبال کی عیادت کو گیا۔ دورانِ گفتگو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ اور [سر] فضل حسین 1904ء میں مرزا غلام احمد قادیانی سے سیالکوٹ میں ملے تھے۔ [سر] فضل حسین نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں تو مرزا صاحب نے جواب دیا ہرگز نہیں''

(Sir Muhammad Iqbal's statement regarding Qadianis, Maulana Muhammad Ali, Page 6,7)

زیرِ نظر کتاب کے مصنف جناب بشیر احمد نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اقبال کے ذہن پر مرزا صاحب سے اس ملاقات کے نقوش تا دیر قائم رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عرصے تک قادیانیوں کے ساتھ نہ تو بحث و مباحثہ کیا اور نہ انکی تکفیر کی۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب خود بانیِ سلسلہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ حقیقی نبوت کے مدعی نہیں ہیں۔ جناب بشیر احمد آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کے جانشین حکیم نور الدین نے مسلمانوں سے تعاون بڑھانے کے لیے اعتدال پسندانہ روش اختیار کی۔ انہوں نے مرزا صاحب کی نبوت اور ان کے دعووں پر ایمان نہ لانے والوں کی تکفیر پر زور نہیں دیا بلکہ خواجہ کمال الدین کی سرگرمیوں کی سرپرستی کی جنہوں نے برصغیر کے طول و عرض میں صرف اسلام کے موضوع پر لیکچر دیے، عام مسلمانوں سے میل جول بڑھانے کا سلسلہ شروع کیا اور نفرتوں کی وہ خلیج پاٹنے کی کوشش کی جو مرزا صاحب کے الہامات، پیش گوئیوں اور اشتعال انگیز تحریروں نے پیدا کر دی تھی۔ یاد رہے

کہ حکیم نورالدین کے ہاں ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جن سے مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت اور تکفیرِ مسلمین کی تائید ہوتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کے دور میں احمدی جماعت کی پالیسی معتدل رہی اور نبوتِ مرزا اور تکفیرِ مسلمین پر زور نہیں دیا گیا۔ بہر حال جناب بشیر احمد نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ مرزا صاحب نے سر فضل حسین اور اقبال سے ملاقات کے دوران اپنے اصل موقف کو انتہائی عیاری سے چھپایا اور تحریک احمدیت کی حقیقی روح وہ ہے جو مرزا بشیر الدین محمود کی تحریروں سے سامنے آتی ہے۔

جولائی 1908ء میں جب اقبال یورپ سے وطن واپس آئے تو مرزا صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اقبال کی لاہور آمد پر مرزا صاحب کے پیروکاروں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان پیروکاروں میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ، مولانا محمد علی لاہوری، خواجہ کمال الدین اور ڈاکٹر بشارت احمد نمایاں تھے۔ یہ لوگ ذاتی سطح پر اچھے اخلاق و کردار کے حامل تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ اقبال کے سماجی مراسم بھی تھے۔ ''یہ علامہ سے علمی موضوعات پر تقریریں کراتے اور انہیں سماجی تقریبات میں آگے آگے رکھتے''۔ (ملفوظاتِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص 88-87)۔ اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ یہ اقبال سے مرزا صاحب کی خدمتِ اسلام کا ذکر کرتے اور انہیں بانیِ تحریک کے دورِ اول کے معتقدات سناتے جن میں دعویٰ نبوت سے انکار اور آنحضرت ﷺ کے آخری نبی ہونے کا اقرار ہے۔

اقبال کو جب 32-1931ء کے دوران مرزا بشیر الدین محمود کے ساتھ آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں کام کرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا کہ مسئلہ چاہے اجتماعی یا قومی کیوں نہ ہو، قادیانی اپنے گروہی مفادات کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتے اور وہ صرف اپنے امام کی اطاعت کے پابند ہیں اس لئے اقبال 1933ء کے وسط میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔ اسی سال پروفیسر الیاس برنی کی کتاب ''قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ'' شائع ہوئی (مقدمہ قادیانی مذہب، ص78) اور کثیر تعداد میں ملک کے اہل علم کو بھیجی گئی۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے اقبال قادیانیوں

کے عقائد سے مکمل طور پر واقف ہوئے۔ انہوں نے اس کے دوسرے ایڈیشن پر (جو جلد ہی شائع ہوا) یہ رائے دی کہ یہ کتاب ملک میں وسیع پیمانے پر شائع ہونے کے قابل ہے۔ (افسوس کہ اقبال کی یہ رائے ان کی تحریروں یا خطوط کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ میں نے اسے پروفیسر برنی کی مذکورہ کتاب کی تمہید چہارم مطبوعہ 1935ء سے نقل کیا ہے) بہرحال اقبال کے اس کتاب کے مطالعے کا سال1934ء متعین کیا جا سکتا ہے۔ اسی سال انہوں نے قادیانیوں کی اصل کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعے کا اظہار 1935ء کے اُس تاریخی بیان کی صورت میں کیا کہ حکومت قادیانیوں کومسلمانوں سے الگ جماعت تسلیم کرے۔ اپنے اِس موقف کی تائید میں راقم الحروف جسٹس (ر) عطاالله سجاد کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتا ہے۔ جسٹس صاحب لکھتے ہیں:

> ''1935ء کی بات ہے کہ میں روزنامہ احسان (لاہور) کے چیف ایڈیٹر مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کے ہمراہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں میں''احسان''میں رکنِ ادارہ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ دوران گفتگو سب سے زیادہ نمایاں موضوع قادیانیوں کے بارے میں حضرت علامہ کا بیان تھا۔ میں نے حضرت علامہ سے دریافت کیا کہ آپ قادیانیوں کے اخبار میں لکھتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ بعض معاملات میں تعاون بھی کرتے رہے ہیں تو پھر اچانک آپ کا رویہ ان کے بارے میں اسقدر شدید کیوں ہوگیا کہ آپ نے مطالبہ کیا ہے کہ قادیانیوں کو عالم اِسلام سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ حضرت علامہ نے کہا کہ میں ان کی جماعت کو اچھا سمجھتا تھا اور مسئلہ کشمیر کے متعلق انہوں نے جو جماعت بنائی تھی، میں اس کا سکریٹری بھی رہا۔ لیکن میری بیماری| جو 10

جنوری 1934ء کو شروع ہوئی] میرے لیے باعثِ رحمت بن گئی
کہ خدا نے مجھ پر حق و صداقت کے دروازے کھول دئے۔
انہوں نے کہا کہ میں نے الیاس برنی کی ایک کتاب جو
قادیانیوں کے عقائد کے خلاف تھی پڑھی اور پھر اس کے بعد
قادیانیوں کی اصل کتابیں منگوا کر ان کا مطالعہ کیا کیوں کہ میرے
پاس کافی وقت تھا۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ مسلمانوں کے مختلف
فرقے ایک دوسرے سے بعض معاملات میں شدید اختلاف
رکھتے ہیں لیکن ختم نبوت کے معاملے میں امت میں کوئی
اختلاف نہیں ۔۔۔۔۔ اس کے بعد فصاحت اور علم قرآنی کا
ایک دریا بہہ نکلا اور علامہ اقبال نے حضور ﷺ کی ختم المرسلینی
اور امتِ اسلامیہ کے وجود اور اتحاد سے اس کے تعلق کو اس طرح
جوڑا کہ علم و آگہی کے موتی بکھرنے لگے اور میں اور مولانا میکش
وہ موتی سمیٹتے رہے''

(روزنامہ نوائے وقت، 21 اپریل 1999ء)

پروفیسر الیاس برنی کے بقول مرزا غلام احمد قادیانی، حکیم نور الدین اور دوسرے قادیانی اساطین کی کتابوں میں اس درجہ تکرار، تضاد، ابہام اور التباس ہے کہ اکثر مباحث بھول بھلیاں نظر آتے ہیں (قادیانی مذہب، تمہید اول، ص 17)۔ عربی اور اردو کے صاحبِ طرز ادیب، مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ قادیانی لٹریچر حسنِ انشا، حلاوتِ تحریر اور عمقِ فکر سے یکسر خالی ہے (ماہنامہ سیارہ لاہور، ستمبر 1965ء)۔ اس تضاد اور التباس کے پیشِ نظر ملک کے ممتاز ادیب اور صحافی شورش کاشمیری نے مرزا صاحب اور دوسرے قادیانی اساطین کی تحریروں اور تعبیروں کو دوشیزہ کی کہہ مکرنیاں قرار دیا ہے اور راقم الحروف کی رائے میں ان تحریروں اور تعبیروں پر یہ مصرعہ پوری

طرح صادق آتا ہے۔

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بہرحال یہ اقبال کی ہمت تھی کہ انہوں نے علم و ادب کے حوالے سے اپنے ذوق پر جبر کر کے نام نہاد سلطان القلم (مرزا غلام احمد قادیانی) اور دوسرے احمدی رہنماؤں کی کتابیں پڑھیں اور صحیح نتائج اخذ کئے۔

جناب بشیر احمد نے ''اسلام اینڈ احمد ازم'' کے زیرِعنوان علامہ اقبال کے مشہورِ زمانہ مضمون کے بارے میں روزنامہ الفضل ربوہ کے ایک شوشے کا ذکر کیا ہے۔ ممتاز صحافی اور علامہ کے نیاز مند خواجہ عبدالوحید کے بیان کے مطابق پچاس کی دہائی کے اوائل میں الفضل نے اداریوں کے طویل سلسلے میں داخلی شواہد کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ یہ مضمون اقبال کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ جناب بشیر احمد نے خواجہ صاحب کی ڈائری کے حوالے سے بتایا ہے کہ کس طرح قادیانیوں کا یہ دعویٰ بے بنیاد ثابت ہوا اور کس طرح اس سلسلے میں انکا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ خواجہ عبدالوحید کے بیان کے مطابق سب سے بڑی دلیل جو الفضل کے اداریوں میں دی گئی وہ یہ تھی کہ اقبال ایک مدت تک تحریک احمدیت کے حامی رہے ہیں، لیکن اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کیوں کہ اقبال خود یہ کہہ چکے ہیں:

> ''مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک [احمدیت] سے اچھے نتائج کی امید تھی۔............................ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہوجاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے اسے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستے پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں

اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ، بانی اسلام سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا''

(حرف اقبال ص 112)

اس سلسلے میں یہ دلچسپ چیز قابل ذکر ہے کہ خود مرزا غلام احمد قادیانی کے بیانات اور دعووں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعویٰ کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجال نہیں ہوسکتا''

(تریاق القلوب ص 130)

دوسری جگہ ان کا ارشاد ہے:

''خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا کہ ہر وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے''

(تذکرہ مجموعہ الہامات ص 600)

حیات ونزول مسیح علیہ السلام کے حوالے سے بھی مرزا صاحب کے ارشادات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ قرآن مجید کی سورۃ الصّف کی نویں آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ آیت جسمانی اور سیاستِ ملکی کے طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں پیش گوئی ہے اور جس غلبہء کاملہِ دینِ اسلام کا (اس آیت میں) وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہ مسیح علیہ السلام کے ذریعہ ظہور میں آئے گا اور جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ

اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو انکے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع
آفاق و اقطار میں پھیل جائے گا"

(براہین احمدیہ ص 499,498 حاشیہ در حاشیہ 3)

براہین احمدیہ کی اشاعت کے بارہ سال بعد مرزا صاحب نے اپنا موقف تبدیل کرلیا اور اپنی تالیفات ازالہِ اوہام اور توضیحِ مرام میں لکھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور انکی آمدِ ثانی کا عقیدہ قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ انہوں نے ضمیمہ حقیقت الوحی میں یہ بھی لکھا کہ حیاتِ عیسیٰؑ کا عقیدہ شرکِ عظیم ہے۔ یہاں قادیانیوں کا یہ گھڑا گھڑایا جواب نہیں چل سکتا کہ براہین احمدیہ میں مرزا صاحب نے رسمی طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی کا ذکر کیا ہے اور جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا تو انہوں نے اعلان کردیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام فوت ہو گئے۔ سوال پیدا ہوتا کہ جب مرزا صاحب بقولِ خود براہین احمدیہ کی تالیف کے وقت رسول تھے تو وہ اپنی کتاب میں کس طرح ایک خلافِ قرآن اور شرکیہ عقیدہ بغیر اختلافی نوٹ کے درج کر سکتے تھے۔ مرزا صاحب نے براہینِ احمدیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب آنحضرت ﷺ کے دربار میں رجسٹری ہو چکی ہے اور آپ ﷺ نے اسکا نام قطبی رکھا یعنی قطب ستارہ کی طرح غیر متزلزل و مستحکم اور یہ کتاب خدا کے الہام اور امر سے لکھی گئی ہے۔ (براہین احمدیہ ص 249,248)۔ یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکار رسالت مآب ﷺ کس طرح اُس کتاب کی تصدیق کر سکتے ہیں جس میں ایک خلافِ قرآن اور شرکیہ عقیدہ بغیر کسی اختلافی نوٹ کے درج ہو۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں اور بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے اور انہوں نے اپنے بنیادی عقیدے میں تبدیلی کی۔ اس حقیقت کا اعتراف خود ان کے صاحبزادے اور دوسرے خلیفہ مرزا محمود احمد نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 1901ء میں آپ [مرزا غلام
احمد قادیانی] نے اپنے عقیدے میں تبدیلی کی ہے اور 1900ء

ایک درمیانی عرصہ ہے جو دونوں خیالات کے درمیان برزخ کے
طور پر حدِ فاصل ہے............ پس یہ ثابت ہے کہ 1901ء
سے پہلے کے حوالے جن میں آپ [مرزا غلام احمد قادیانی] نے
نبی ہونے سے انکار کیا ہے، اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت
پکڑنی غلط ہے''

(حقیقت النبوت، ص 121)

مجددیت اور نبوت کے دعووں کے باوجود اگر مرزا صاحب کے بنیادی عقائد میں تبدیلی آ سکتی ہے تو اقبال (جنہوں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا) کے نقطۂ نظر میں اگر تبدیلی آ گئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے بیان پر پنڈت نہرو کے ردعمل نے کئی نئے سوالات کو جنم دیا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں پنڈت نہرو سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس ردعمل کا اظہار کریں گے کیوں کہ ایک بیدار مغز، سامراج دشمن اور قوم پرست رہنما کی حیثیت سے وہ احمدی جماعت کے کردار سے بخوبی واقف تھے۔ راقم کے اس دعویٰ کا ثبوت خود احمدی جماعت کے امام مرزا بشیر الدین محمود نے فراہم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خطبہ جمعہ میں کہا:

''پھر یہ خیال کہ جماعت احمدیہ انگریزوں کی ایجنٹ ہے
لوگوں کے دلوں میں اسقدر راسخ تھا کہ بعض بڑے بڑے سیاسی
لیڈروں نے مجھ سے سوال کیا کہ ہم علیحدگی میں آپ سے پوچھتے
ہیں کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کا انگریزی حکومت سے اس قسم کا تعلق
ہے۔ ڈاکٹر سید محمود جو اس وقت کانگریس کے سکریٹری ہیں، ایک
دفعہ قادیان آئے اور انہوں نے بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو
جب یورپ کے سفر سے واپس آئے تو انہوں نے اسٹیشن پر اتر کر

جو باتیں سب سے پہلے کیں، ان میں ایک یہ تھی کہ میں نے اس سفرِ یورپ میں یہ سبق حاصل کیا ہے کہ اگر انگریزی حکومت کو ہم کمزور کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس سے پہلے احمدیہ جماعت کو کمزور کیا جائے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کا یہ خیال تھا احمدی جماعت انگریزوں کی نمائندہ اور انکی ایجنٹ ہے"

(الفضل نمبر 31، جلد 23, 6 اگست 1935ء)

پنڈت نہرو کی سوانح حیات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ 1927ء کے اواخر میں یورپ سے ہندوستان واپس آئے اور اقبال کے بیان پر انہوں نے 1936ء میں تنقید لکھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ احمدی جماعت کے سیاسی کردار سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود انہوں نے اس جماعت کے وکیلِ صفائی کا کردار کیوں ادا کیا۔ اس سوال پر اقبال نے اپنے اُس مضمون میں بہت خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے جو انہوں نے پنڈت نہرو کے مضامین کے جواب میں لکھا۔ وہ کہتے ہیں:

"...... میں اس حقیقت کو پنڈت نہرو اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کردیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں، میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ وہ جن سوالات کو سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ [خواہش] بالکل خلوص پر مبنی ہے تاہم جس طریقے سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ میں اس خیال کی

طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصول کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اُس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ایک ہندوستانی قوم پرست جس کے سیاسی آئیڈل ازم نے احساسِ حقائق کو عملاً ختم کردیا ہے یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں حق خودارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔.................................. یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں، کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہوجائے گا کہ پیغمبرِ عرب ﷺ کی اُمت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی اُمت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری اس کوشش نے کہ مُسلمانانِ ہند کو اس امر پر متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے جو اصلاحی تحریکات کا روپ دھارتی ہیں، پنڈت جی کو یہ موقع دیا ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔

(اسلام اور احمدیت، مترجم شکیل عثمانی)

جماعت احمدیہ کی وکالت کے سلسلے میں پنڈت نہرو کے محرکات کا تجزیہ کرنے کے بعد اقبال آغا خان کے بارے میں پنڈت جی کے اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ کیا اپنے عقائد کی رو

سے انکی اسماعیلی جماعت، اسلامی وحدت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

> '' ہز ہائینس آغا خاں کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت نہرو نے آغا خاں پر حملے کیوں کیئے۔ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں شامل ہیں۔ وہ اس بات سے بداہتہً بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسل امامت کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک امام حامل وحی نہیں ہوتا وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔''

(حرف اقبال ص 148)

خوش قسمتی سے قادیانیت کے بارے میں اقبال کے بیان کی اشاعت سے ایک سال قبل آغا خاں نے اپنے پیروؤں کو چند ہدایات دی تھیں جن کا مقصد امت مسلمہ سے یک جہتی کا اظہار تھا۔ اقبال نے ان ہدایات کو اپنے مضمون میں شامل کر کے پنڈت جی سے کہا ہے کہ اب انہیں اس امر کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ آیا آغا خاں اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں یا نہیں۔ یہ ہدایات درج ذیل ہیں:

> '' گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمانوں سے السلام علیکم کہہ کر ملو۔ اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو۔ پابندی سے روزے رکھو۔ اسلامی قانون نکاح کے مطابق اپنی شادیاں

کرو۔ تمام مسلمانوں سے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو''

(روزنامہ اسٹار الہ آباد 21 مارچ 1934ء)

یہاں یہ بات قارئین کی دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوگی کہ ''حاضر امام'' ہز ہائی نیس آغا خان نے 1929ء میں کپورتھلہ کی جامع مسجد کے امام مولانا سید جعفر شاہ پھلواروی ندوی کی اقتداء میں نماز ادا کی (مجلہ جریدہ۔29، ص 145، مرتبہ سید خالد جامعی/عمر حمید ہاشمی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی)۔ شریعت میں ظاہر کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کو یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ وہ آغا خان کا دل چیر کر دیکھتے۔

اس کے برعکس مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے احمدی رہنماؤں نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل ہدایات دیں:

مرزا غلام احمد قادیانی نے ارشاد فرمایا:

''یہ جو ہم نے دوسرے مدعیانِ اسلام سے قطع تعلق کیا ہے اول تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی طرف سے دوسرے وہ لوگ ریا پرستی اور طرح طرح کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور ان لوگوں کو ان کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا ان سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دیں جو سڑ گیا ہے اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں اس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح ان سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور نہ ہمیں ایسے تعلق کی حاجت ہے''

(رسالہ تشحیذ الاذہان قادیان جلد 6 عدد 8 ص 311)

مرزا صاحب کہتے ہیں:

''صبر کرو اور اپنی جماعت کے غیر کے پیچھے نماز مت پڑھو۔

بہتری اور نیکی اس میں ہے اور اسی میں تمہاری نصرت اور فتح عظیم ہے۔ دیکھو دنیا میں روٹھے ہوئے اور ایک دوسرے سے ناراض ہونے والے بھی اپنے دشمن کو چار دن منہ نہیں لگاتے اور تمہاری ناراضگی اور روٹھنا تو خدا کے لئے ہے۔ تم اگر ان میں رلے ملے جارہے ہو تو خدا تعالیٰ جو خاص نظر تم پر رکھتا ہے وہ نہیں رکھے گا، پاک جماعت جب الگ ہو تو اس میں ترقی ہوتی ہے''۔

(ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار الحکم، قادیان جلد 5، نمبر 29)
منقول از کتاب ''ملفوظات'' مرتبہ منظور الٰہی ص 265

مرزا بشیر الدین محمود، امامِ جماعتِ احمدیہ قادیان نے اپنے خطبہ جمعہ میں کہا:

''حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول اکرم ﷺ، قرآن مجید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے''

(الفضل قادیان ج19، عدد 13، مورخہ 30 جولائی 1931ء)

مرزا بشیر الدین محمود لکھتے ہیں:

''کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا ہو، کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں''

(آئینہ صداقت ص 35)

مولانا محمد علی لاہوری، امیر جماعت احمدیہ لاہور لکھتے ہیں:

''تحریکِ احمدیت اسلام کے ساتھ وہی رشتہ رکھتی ہے جو
عیسائیت کا یہودیت کے ساتھ تھا''

(ریویو آف ریلیجنز عدد 5، جلد 5، ص 163)

مولانا محمد علی کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح عیسائیت اور یہودیت الگ الگ مذہبی اکائیاں ہیں اسی طرح اسلام اور احمدیت بھی الگ الگ مذہبی اکائیاں ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور احمدی رہنماؤں کے مندرجہ بالا بیانات اقبال کے قادیانیت کے بارے میں 1935ء کے بیان کی صحت کو ثابت کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف جناب بشیر احمد اس سے قبل '' قادیان سے اسرائیل تک'' اور "Ahmadiyya Movement: British- Jewish Connections" (اردو ترجمہ ''تحریک احمدیت : یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ'') جیسی معرکہ آرا کتابیں لکھ چکے ہیں ۔ وہ قادیانی تحریک پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی قادیانی مآخذ تک براہ راست رسائی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اقبالیات کے بھی ایک سنجیدہ طالب علم ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے مسئلہ اقبال اور قادیانیت کا نئے زاویوں سے جائزہ لیا ہے اور اقبال پر قادیانیوں کے اعتراضات کے مسکت جوابات دیئے ہیں- امید ہے کہ اس کتاب سے اقبال شناسی کی ایک نئی جہت متعین ہوگی۔

راولپنڈی

13 جولائی 2005ء

تعارف

ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ

جناب بشیر احمد سے میری طویل عرصے سے شناسائی ہے۔ ان کو اچھوتے موضوعات پر تحقیق کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کی تالیفات، بہایت۔ اسرائیل کی خفیہ سیاسی تنظیم، احمدیہ موومنٹ: برٹش۔جیوش کنکشنز، فری میسنری اور بائبل کا تحقیقی جائزہ منظر عام پر آچکی ہیں جن کی اہل علم نے پذیرائی کی ہے۔

راقم اسے اپنی عزت افزائی سمجھتا ہے کہ جناب بشیر احمد نے اپنی ہر کتاب کی تالیف و تدوین کے دوران اس سے تبادلہ خیالات کیا۔ راقم نے خصوصاً ''بہایت''، ''احمدیہ موومنٹ'' اور ''بائبل کا تحقیقی جائزہ'' کے مسودات کا مطالعہ کیا اور ان پر اپنی آراء دیں۔ بعض حصوں کو از سر نو مرتب کرنے اور کچھ ابواب کا جدید تحقیقات کی روشنی میں جائزہ لینے کا مشورہ دیا۔ جناب بشیر احمد نے میری اکثر آراء اور تجاویز سے اتفاق کیا اور ان کی روشنی میں اپنے مسودات میں اہم اور بنیادی تبدیلیاں کیں۔ میرے بے لاگ تبصروں اور تجاویز پر انہوں نے کبھی ناراضی کا اظہار نہیں کیا بلکہ میرا شکریہ ادا کر کے میری قدر افزائی کی۔

زیر نظر تصنیف اقبال اور قادیانیت کے سلسلے میں راقم نے جناب بشیر احمد کو اپنی ذاتی لائبریری سے قادیانیت پر نہایت اہم کتب، رسائل اور جرائد کے علاوہ مختلف جگہوں سے ''الفضل'' قادیان، ''پیغام صلح'' لاہور، ''لائٹ'' لاہور اور ''ریویو آف ریلیجنز'' قادیان وغیرہ کے 1935ء اور دیگر سالوں کے بعض اہم فائل مہیا کیے تاکہ اس عہد میں علامہ اقبال کے بیانات پر قادیانی نقطۂ نظر کی تفہیم میں مدد ملے۔ انہوں نے اس مواد کی روشنی میں کتاب کے آخری ابواب مدون کیے۔

جناب بشیر احمد کی زیر نظر علمی کاوش اقبال اور قادیانیت کے موضوع پر بعض نئے گوشوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ ان کے اندازِ تحقیق اور منفرد طرزِ استدلال نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ البتہ راقم اقبال شناسوں کی توجہ بعض سوالات کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہے جو اس

تصنیف میں اٹھائے گئے ہیں:

۱- قادیانی علامہ اقبال سے ایک نظم منسوب کرتے ہیں جو انہوں نے مبینہ طور پر 1883ء میں سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف لکھی جب وہ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے- یہ نظم اس زمانے میں کس اخبار یا رسالے میں پہلی دفعہ شائع ہوئی-

۲- علامہ اقبال نے 1900ء میں عبدالکریم جیلی کے نظریہ انسان کامل پر ایک مقالہ لکھا جسے جون 1959ء میں پہلی دفعہ جماعت احمدیہ لاہور کے ہفت روزہ ''لائٹ'' نے شائع کیا- اس کے بعد یہ 21 اپریل 1960ء کو روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور میں چھپا- اقبال شناس اس کی تاریخِ اشاعت پر روشنی ڈالیں- کیا برٹش میوزیم آرکائیوز میں یہ مقالہ موجود ہے؟ ممتاز ماہر اقبالیات ڈاکٹر سلیم اختر اس کا انکار کرتے ہیں جبکہ ہفت روزہ ''لائٹ'' کا دعویٰ ہے کہ اس نے وہاں سے حاصل کر کے اسے شائع کیا-

۳- رسالہ لمعات مطبوعہ 1916ء کے ایک مضمون میں علامہ اقبال نے ختم نبوت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اظہار کیا- اس مضمون کے اقتباس کو پروفیسر الیاس برنی نے اپنی کتاب قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ میں روزنامہ الفضل کے حوالے سے نقل کیا ہے- لمعات کے اس شمارے کو تلاش کیا جانا چاہیئے جس میں یہ مضمون شائع ہوا تھا-

۴- علامہ اقبال اور حکیم نورالدین کے درمیان بعض فقہی اور دیگر امور پر خط و کتابت ہوئی- قادیانیوں نے ان خطوط کے متن کو شائع نہیں کیا- ان خطوط کے متن کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے-

۵- گورداسپور اور لاہور میں احمدیہ جماعت کے وفود نے 1928ء میں سائمن کمیشن کو الگ الگ میمورنڈم پیش کئے- قادیانی مؤرخ دوست محمد شاہد کا دعویٰ ہے کہ ان پر پانچ لاکھ افراد نے دستخط کئے- ان یاداشتوں کی تاریخی

اہمیت کے پیش نظر انہیں شائع ہونا چاہیئے۔

۶۔ کشمیر کمیٹی کے قیام سے قبل علامہ اقبال نے خلیفہ قادیان مرزا محمود احمد کے خط کے جواب میں 5 ستمبر 1930ء کو جو خط ارسال کیا تھا قادیانی لٹریچر میں اس کی مفید مطلب دو سطریں شائع کی جاتی ہیں۔ قادیانی جماعت کو چاہیئے کہ یہ پورا خط شائع کرے۔

علامہ اقبال کا عقیدۂ ختمِ نبوت پر کامل ایمان تھا۔ انہوں نے کبھی مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت نہ کی، نہ وہ قادیانیوں کے بارے میں کوئی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ البتہ ابتداء میں انہوں نے ان کی تکفیر سے احتراز کیا کیونکہ وہ مذہبی مباحث، تکفیر اور باہمی منافرت کو ہوا دینے کے خلاف تھے۔ علامہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کے زمانے میں قادیانیوں کے مذہبی عقائد، ان کے سیاسی افکار اور حقیقی کردار کو پوری طرح سمجھنے کا موقع ملا اور اس عملی مشاہدے کے بعد انہوں نے مئی 1935ء میں ان کے بارے میں اپنا پہلا بیان جاری کیا۔

جناب بشیر احمد نے قادیانیوں اور سیکولر عناصر کے ان اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے کہ علامہ اقبال سر ظفر اللہ کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے پر احساس محرومی کا شکار ہوئے اور اس احساس محرومی کے نتیجے میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ جماعت تسلیم کرے۔ مصنف نے علامہ اقبال کے فکری ارتقاء کو قادیانیت کی تاریخ کے تناظر میں بہت عمدگی سے پیش کیا ہے اور قادیانیوں کی اقبال دشمنی کا بھرپور محاسبہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اقبالیات میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

پروفیسر ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ
صدر شعبہ تاریخ و مطالعہ پاکستان
کلیۂ اصول الدین
انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی
اسلام آباد

اسلام آباد
31 جولائی 2005ء

عرضِ مصنف

بشیر احمد

1991-92ء میں جب میں اپنی انگریزی کتاب ''احمدیہ موومنٹ'': برٹش - جیوش کنکشنز (مطبوعہ 1994ء) مرتب کرر ہا تھا تو میں نے اقبال اور قادیانیت پر کچھ اہم مواد اکٹھا کیا تھا اور مختصر طور پر کتاب میں اس پر بحث کی تھی- دوسری کتابوں کی تالیف میں مصروفیت کے سبب میں اس کو مرتب کر کے شائع نہ کر سکا- گذشتہ برسوں میں ایک قادیانی اہل قلم شیخ عبدالماجد کی دو کتابیں، اقبال اور احمدیت (زندہ رود پر تبصرہ) اور فکر اقبال اور تحریکِ احمدیہ منظر عام پر آئیں- اس سے قبل علامہ اقبال کے بھتیجے. شیخ اعجاز احمد اسی موضوع پر ایک کتاب مظلوم اقبال لکھ چکے تھے- میں نے یہ کتاب ان کتابوں کے جواب کے طور پر نہیں لکھی ہے کیونکہ شیخ عبدالماجد کی کتابوں میں خاصا رطب و یابس اور قادیانیت کا پروپیگنڈہ ہے اور شیخ اعجاز احمد کی کتاب قیاسات اور اصل مسئلہ سے اعراض پر مبنی ہے- اصل مسئلہ یہ ہے کہ قادیانی مرزا غلام احمد کو ایسا نبی مانتے ہیں جس کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے- اسی بنیاد پر علامہ اقبال نے ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا- راقم نے اس کتاب میں علامہ اقبال پر قادیانیوں کے عمومی اعتراضات کا جواب دیا ہے- امید ہے کہ اقبال شناس اس سلسلے میں مزید تحقیقی کام کریں گے-

یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان میں اب تک قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے بیان پر پنڈت نہرو کے مضامین شائع نہیں ہوئے- اس کتاب میں نہ صرف ان مضامین کا انگریزی متن دیا گیا ہے بلکہ ان کی تلخیص اور ترجمہ پیش کر دیا ہے تا کہ پنڈت جی کا نقطۂ نظر بھی قارئین کے سامنے آ جائے-

محترم ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے اپنے مقدمے میں اس کتاب پر جن گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے میں انکا انتہائی ممنون ہوں-

مکرم ڈاکٹر ظفر اللہ بیگ صاحب نے حسبِ سابق اس کتاب کی تصنیف میں بھی بہت مدد کی۔ انہوں نے روزنامہ الفضل قادیان کے پرانے شمارے اور قادیانیوں کی بعض کتابیں مہیا کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے نہایت مفید مشورے دیئے جن کی روشنی میں راقم نے بعض مقامات پر نظر ثانی کی۔ میں ان کا انتہائی شکر گذار ہوں۔

اس کتاب کی تصنیف و اشاعت کا سارا کریڈٹ صدیقی العزیز شکیل عثمانی صاحب کو جاتا ہے۔ ان ہی کی تحریک پر اس کا مسودہ تیار کیا گیا اور انہوں نے اس کی ترتیب و تدوین نیز بعض حواشی لکھنے میں از حد محنت کی اور متن میں اہم اضافے کئے جس کے لیے میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جناب مسعود اختر اور جناب محمود اختر نے کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت میں پر خلوص تعاون کیا، اس کے لئے میں ان کا انتہائی مشکور ہوں۔

راولپنڈی

3 جولائی 2006ء

فہرستِ مندرجات

باب 1

خاندانِ اقبال اور قادیانیت

مئی 1935ء کے بعد سے قادیانی خاندانِ اقبال پر جو الزامات لگاتے چلے آرہے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ محمد اقبال کے والد گرامی احمدی تھے، ان کے بڑے بھائی شیخ عطامحمد احمدی تھے اوران کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد احمدی ہیں۔ (واضح رہے کہ شیخ اعجاز احمد چند سال قبل فوت ہو گئے۔ مصنف) ان کا ایک اور الزام یہ ہے کہ خود اقبال ابتداء میں اپنے آپ کو احمدیہ جماعت میں شمار کرتے تھے۔

آیئے ہم ان الزامات کا جائزہ لیں۔

شیخ محمد اقبال 9نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی شیخ نور محمد ٹوپیوں کی سلائی کا کام کرتے تھے۔ سیالکوٹ پنجاب کا اہم علاقہ تھا۔ یہ سکاچ مشن کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ شیخ نور محمد 1837ء میں سیالکوٹ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سکھوں کا آخری دور اور انگریزوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ شیخ نتھو ٹوپیاں والے کے نام سے مشہور تھے اور نہایت نیک سیرت اور صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کے ملنے والوں میں مرزا غلام احمد قادیانی بھی شامل تھے جو اس وقت (1864-1868) سیالکوٹ کچہری میں اہل مد تھے اور ان دنوں ان کو کوئی خصوصی اہمیت حاصل نہ تھی۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف

مرزا غلام احمد قادیان تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے مغل خاندان کے ایک جاگیردار مرزا غلام مرتضٰی کے فرزند تھے۔ مرزا غلام مرتضٰی نے پہلے سکھ فوج میں ملازمت اختیار کی اور ہزارہ اور شمالی ہند میں سکھوں کے خلاف مسلمانوں کی بغاوتوں کو کچلنے میں ان کی مدد کی۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت کے خاتمے (1849) کے بعد وہ فوراً انگریزوں سے مل گئے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں انہوں

نے پچاس گھوڑے مع سوار بہم پہنچا کر انگریزی حکومت کی مدد کی (1) ان کے بیٹے مرزا غلام قادر نے دہلی میں حریت پسندوں کو قتل کیا اور جنرل نکلسن سے پروانہ خوشنودی حاصل کیا (2) قادیان کے اس مغل خاندان کی انگریز کے لیے خدمات کا تفصیلی ذکر سر لیپل گرفن کی کتاب پنجاب چیفس میں موجود ہے۔ انگریز نے ان کی خدمات کے صلے میں اس خاندان کو نوازنے کے وعدے کئے اور خوشنودی کے خطوط لکھے جن کے عکس مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کئی تصانیف میں دیئے ہیں۔(3)

مرزا غلام احمد 13 فروری 1835 کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1864ء میں مرزا غلام مرتضٰی نے انگریزوں سے درخواست کر کے ان کو سیالکوٹ کچہری میں ملازم کرا دیا جہاں وہ اہل مد متفرق کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں ان کا شیخ نور محمد سے تعارف ہوا۔

مرزا صاحب پہلے محلہ کشمیریاں میں عُمرا کشمیری کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے۔ بعد میں سیالکوٹ کی جامع مسجد کے سامنے ایک بیٹھک میں حکیم منصب علی وثیقہ نویس کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کے دوستوں میں مولوی محبوب عالم اور لالہ بھیم سین وکیل شامل تھے۔ ان کے سکاچ مشن کے پادری بٹلر سے قریبی تعلقات تھے جن کے ساتھ وہ عیسائیت پر بحثیں کرتے تھے۔ جب وہ ولایت واپس جانے لگا تو خاص طور پر مرزا صاحب سے ملنے کچہری گیا(4)1868ء مین مرزا صاحب نے ملازمت سے استعفٰی دے دیا اور قادیان واپس جانے لگے تو سیالکوٹ کچہری کے ڈپٹی کمشنر ایچ ای پرکنس (H.E.Perkins) نے ''آپ کی مشایعت کے اعزاز میں کچہری میں عام تعطیل کر دی کہ ایسا پاکباز شخص ان کے عملے سے جا رہا ہے''۔(5) کچہری میں کلرکوں کی آمد، استعفے اور ریٹائرمنٹ ایک معمول ہوتا ہے، نہ جانے ڈی سی صاحب نے مرزا صاحب کو اتنا اعزاز کیوں بخشا اور انہیں کونسا مشن سونپ کر سیالکوٹ سے روانہ کیا؟ سیالکوٹ کی دیگر اہم شخصیات سے بھی مرزا صاحب کے تعلقات تھے جن میں اقبال کے استاد سید میر حسن، حکیم حسام الدین، میر حامد علی، مولانا غلام حسن، مولوی عبدالکریم وغیرہ شامل تھے۔(6) ان میں سے اکثر لوگ بعد میں احمدی ہو گئے۔

1868ء کے بعد مرزا صاحب قادیان میں سکونت پذیر رہے۔ 1876ء میں ان کے والد مرزا غلام مرتضیٰ انتقال کر گئے اور قادیان کی جاگیر پر ان کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر کا تصرف ہو گیا۔ یہ زمانہ مرزا صاحب نے نہایت تنگ دستی اور مالی پریشانیوں میں گزارا۔ وہ 1877ء میں ایک بار سیالکوٹ ایک مقدمے کے سلسلے میں گئے اور اپنے پرانے احباب سے ملے۔

مرزا صاحب کے دعاوی

1880ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب براہین احمدیہ کے پہلے دو حصے شائع کیے، تیسرا حصہ 1882ء میں اور چوتھا 1884ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی وحی، الہامات اور کشوف و رویاء درج کئے اور آریوں اور عیسائیوں کو الٰہی نشان دکھانے کے دعوے کیے۔ انہوں نے اس مواد کو بعد میں اپنے دعاوی کے ثبوت کے لئے ڈھال بنایا جو اس زمانے میں انہوں نے اسلام کی تائید کے لیے پیش کئے تھے۔ 1884ء میں انہوں نے میر ناصر نواب کی صاحبزادی محترمہ نصرت جہاں صاحبہ سے دوسری شادی کی۔

مرزا صاحب نے 1885ء میں مجددیت کا دعویٰ کیا۔ 1886ء میں ہوشیار پور میں چلہ کاٹا اور 20 فروری کو ایک آنے والے مصلح موعود کا اعلان کیا (7) 1888ء میں انہوں نے اعلان کیا کہ خدا نے انہیں بیعت لینے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے 23 مارچ 1889ء کو لدھیانے میں با قاعدہ بیعت لینے کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے حکیم نورالدین نے بیعت کی۔

1890ء کے آخر میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ مسیح ناصری وفات پا گئے ہیں اور وہ ہی آنے والے مسیحِ موعود ہیں۔ 1891 میں دو رسائل توضیح مرام اور فتح اسلام تصنیف کئے جن میں دعویٰ کیا کہ وہ مقام محدثیت پر فائز ہیں۔ اس کو انہوں نے جزوی نبوت کہا اور دعویٰ کیا کہ انہیں خدا سے مکالمے اور مخاطبے کا شرف حاصل ہے۔ 1885ء تک عام مسلمان مرزا صاحب کے اصلاح خلق کے لئے مامور ہونے اور مجددیت کے دعوؤں کے باوجود ان کے غیر مسلموں سے مناظرے کرنے کی وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے لیکن وفاتِ مسیح کے اعلان، مسیح موعود اور ظلی و جزوی نبوت

(محدثیت) کے دعوؤں کے بعد ان کی سخت مخالفت شروع ہوگئی اور ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ مخالفت کی ایک وجہ ان کی انگریزی حکومت کی حمایت اور جہاد کی مخالفت میں تحریریں بھی تھیں۔ 1891 میں انہوں نے اپنی کتاب ازالہِ اوہام میں اپنے سابقہ دعاوی کی وضاحت کی۔

مرزا صاحب نے 1901ء میں نبوت کا دعویٰ کیا- انہوں نے خود کو لغوی معنی میں نبی نہیں کہا بلکہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی جس میں انہیں رسول اور نبی کہا گیا- وہ لکھتے ہیں:

> ''چند روز ہوئے ایک صاحب پر ایک مخالف کی طرف سے یہ اعتراض پیش ہوا کہ جس سے تم نے بیعت کی ہے وہ نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اسکا جواب محض انکار کے الفاظ سے دیا گیا، حالانکہ ایسا جواب صحیح نہیں ہے۔حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے اس میں ایسے الفاظ رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں، نہ ایک دفعہ بلکہ صدہا دفعہ پھر کیوں کر یہ جواب صحیح ہوسکتا ہے''

(ایک غلطی کا ازالہ، ص 1)

مرزا صاحب نے اپنے آخری خط میں جو ٹھیک ان کے انتقال کے دن اخبار عام لاہور میں شائع ہوا واضح الفاظ میں لکھا:

> ''میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں اور اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو کیوں کر انکار کرسکتا ہوں؟ میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک کہ اس دنیا سے گذر جاؤں''

(اخبارِ عام، 26 مئی 1908ء منقول از حقیقت النبوۃ از مرزا محمود احمد، ص 271)

واضح رہے کہ یہ خط 23 مئی 1908ء کو لکھا گیا اور 26 مئی کو اخبار عام میں شائع ہوا اور ٹھیک اسی دن مرزا صاحب کا انتقال ہوگیا-

مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ بھی کہا کہ جو انکے دعوے کو نہ مانے کافر ہے- وہ لکھتے ہیں:

''خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا کہ ہر وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے''۔

(تذکرہ مجموعۂ الہامات، ص 600)

سیالکوٹ میں جو لوگ مرزا صاحب کے دعاوی پر ایمان لائے ان میں میر حامد سیالکوٹی، مولوی فیض الدین، مولوی عبدالکریم، غلام محمد، حکیم حسام الدین اور (ڈاکٹر) بشارت احمد زیادہ مشہور تھے۔ اقبال کے استاد میر حسن نے مرزا صاحب کے دعاوی کو نہ مانا البتہ وہ ان کی اور حکیم نورالدین کی عزت کرتے تھے۔ مرزا صاحب قیامِ سیالکوٹ کے دوران عیسائیوں کے ساتھ مناظروں میں میر حسن کو حکم بناتے تھے(8)

مرزا صاحب سے شیخ نور محمد کی مبینہ بیعت

مئی 1935 میں جب علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف مضامین لکھے تو ان مضامین کے شائع ہوتے ہی قادیان کی سرکاری ٹکسال میں ان کے اور ان کے خاندان کے بعض افراد کے احمدی ہونے کے بارے میں روایات ڈھلنے لگیں۔ شاید سب سے پہلے مرزا محمود احمد نے 24 مئی 1935 کو علامہ اقبال کے خلاف جو خطبہ دیا اس میں یہ الزام لگایا کہ سر محمد اقبال کے والد احمدی تھے، ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی ہیں اور ان کا بھتیجا شیخ اعجاز احمد سب جج احمدی ہے۔ (9) شیخ نور محمد 1930ء میں وفات پا چکے تھے اور ان کے قریبی دوست سید میر حسن 1929 میں انتقال کر گئے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس الزام کا خود جواب دیتے۔

اس کے چار سال بعد 1939 میں ہمیں 'سیرت المہدی' میں ایک روایت ملتی ہے کہ شیخ نور محمد احمدیہ جماعت میں شامل ہوئے لیکن بعد میں اقبال کے کہنے پر جماعت سے الگ ہو گئے۔ مرزا غلام احمد کے فرزند مرزا بشیر احمد (والد گرامی ایم ایم احمد) نے مرزا صاحب کے پیروکاروں (قادیانی اصطلاح میں صحابہ اور تابعین) کی روایات کو سیرت المہدی کے نام سے تین جلدوں میں جمع کیا۔ اس کی پہلی جلد 1923ء میں دوسری 1927ء میں اور تیسری 1939ء میں چھپی۔ انہوں نے یہ

روایات ہمارے حدیث کے مجموعوں کی طرز پر جمع کی ہیں یہ سلسلہِ احمدیہ کی تاریخ اور مرزا صاحب کی شخصیت کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ ہیں۔ مرزا بشیر احمد جن کو قمرالانبیا (نبیوں کا چاند) کہا جاتا ہے نے مرزا صاحب کی نبوت، مسلمانوں کو کافر قرار دینے اور ان سے معاشرتی تعلقات منقطع کرنے جیسے قادیانی معتقدات کو مرزا صاحب کے احکام اور ان کی وحی کی روشنی میں پیش کیا۔ ان عقائد کو تقویت دینے کے لئے انہوں نے یہ روایات جمع کیں۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ مرزا صاحب کی ذات کو اسوہ حسنہ قرار دیا جائے۔

سیرت المہدی کی روایت میں کہا گیا ہے کہ شیخ نور محمد نے میر حامد شاہ اور مولوی عبدالکریم کی تحریک پر 1891ء یا 1892ء میں مرزا صاحب کی بیعت کی لیکن چند سال بعد جب اقبال کالج میں پہنچے (1893ء۔1895ء) تو انہوں نے انہیں سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ پوری روایت درج ذیل ہے۔

> ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:۔منشی محمد اسمٰعیل صاحب سیالکوٹی نے مجھ سے بیان کیا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا جن کو عام لوگ شیخ نتھو کہہ کر پکارتے تھے۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالبا 1891ء یا 1892ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے ہی شعروشعری (شاعری) کا شوق تھا اس لئے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو انکے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور

انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ سیالکوٹ کی جماعت چونکہ نوجوانوں کی جماعت ہے اور میں بوڑھا آدمی ان کے ساتھ چل نہیں سکتا لہٰذا آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا جس میں لکھا تھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیویں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں۔ اس کے بعد شیخ نور محمد صاحب نے بعض اوقات چندہ وغیرہ دینے کی کوشش کی لیکن ہم نے قبول نہ کیا۔

خاکسار عرض کرتا ہے کہ مجھ سے میاں مصباح الدین صاحب نے بیان کیا کہ ان سے کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر بشارت احمد صاحب نے بیان کیا تھا کہ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام 1891ء یا 1892ء میں سیالکوٹ تشریف لے گئے تھے اور آپ نے وہاں ایک تقریر فرمائی تھی جس میں کثرت کے ساتھ لوگ شامل ہوئے تھے اور ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر بھی ہجوم ہو گیا تھا تو اس وقت ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی وہاں موجود تھے اور کہہ رہے تھے کہ دیکھو شمع پر کس طرح پروانے گر رہے ہیں۔

نیز خاکسار عرض کرتا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بعد میں سلسلہ سے نہ صرف منحرف ہو گئے تھے بلکہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں شدید طور پر مخالف رہے ہیں اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈا تھا۔ مگر سر محمد اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب درمیان میں کچھ عرصہ علیحدہ رہنے کے بعد حال ہی میں پھر سلسلہ میں شامل ہو گئے ہیں اور ان کے صاحبزادے

یعنی سر محمد اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب سب جج تو سلسلہ کے نہایت مخلص نوجوانوں میں سے ہیں‘‘۔(10)

اس روایت کے مطابق شیخ نور محمد نھو مرحوم نے 1891ء یا 1892ء میں مرزا صاحب کی بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے ہوتی تھی؟ اس زمانے میں بعض لوگ خط لکھ کر بیعت کر لیتے تھے۔ بعض خود حاضر ہو کر بیعت کرتے اور بعض کسی احمدی کے ذریعے مرزا صاحب سے بیعت کی تحریری یا زبانی درخواست کرتے۔ مرزا صاحب نے 23 مارچ 1889ء کو لدھیانہ میں باقاعدہ بیعت کا آغاز کیا اور جماعت احمدیہ کی بنیاد رکھی۔ بیعت کنندگان کے نام اور مختصر کوائف ایک رجسٹر میں درج ہوتے تھے۔(11) ایک بیعت فارم بھی تیار کیا گیا جو نئے احمدی کو پر کرنا ہوتا تھا ان کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ 1891ء یا 1892ء وہ سال ہیں جب علمائے اسلام مرزا صاحب کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ سیالکوٹ میں بھی اہل حدیث علماء ان پر کفر کے فتوے لگا رہے تھے ان حالات میں ہمیں کسی غیر جانبدار ذریعے سے شیخ نور محمد کے احمدی ہونے کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا۔ اس روایت کے مطابق نور محمد مرحوم نے اقبال کے کہنے پر 1893ء سے 1895ء کے درمیانی عرصے میں جب وہ کالج میں پڑھتے تھے ان کو احمدیت سے منحرف کر دیا۔ نور محمد مرحوم نے مرزا صاحب کو ایک خط لکھا کہ سیالکوٹ کی جماعت نوجوانوں کی جماعت ہے اور وہ بوڑھے آدمی ہیں اس لئے ان کے ساتھ چل نہیں سکتے لہٰذا وہ ان کا نام اس جماعت میں شامل نہ کریں شیخ نور محمد نے مرزا صاحب کو جو خط لکھا اس خط کے جواب میں مرزا صاحب نے میر حامد کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا وہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں اسلام سے بھی الگ ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قادیانیوں نے نہ تو کبھی شیخ نور محمد کے مرزا صاحب کے نام مبینہ خط کا عکس شائع کیا ہے اور نہ ہی مرزا صاحب نے میر حامد کے نام جو خط لکھا تھا اس کا متن یا عکس میر حامد نے شائع کیا تاکہ یہ روایت درست ثابت ہو سکے۔ اور پھر اس زمانے کے سلسلہ احمدیہ کے لٹریچر میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال 5-1893 کے دوران احمدیت کے

خلاف تھے اسی لئے انہوں نے اپنے والد گرامی کو احمدیت سے منحرف کیا۔ مرزا محمود احمد کے 1935ء کے علامہ اقبال کے خلاف دیئے گئے خطبے سے پہلے ہمیں کہیں بھی ایسا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ اقبال کے والد احمدی تھے۔ ان کے مسلمان دوستوں نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

1892ء میں مرزا صاحب سیالکوٹ آئے تو انہوں نے میر حامد کے والد میر حسام الدین کے مکان پر قیام کیا۔ ان کے مسیح موعود اور محدثیت کے دعوؤں کی وجہ سے ان کی سخت مخالفت کی جا رہی تھی۔ اگر نور محمد احمدی ہوتے تو وہ باقی عقیدت مندوں کی طرح ان سے ملنے ان کی مجلس میں جاتے لیکن ان کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مصنف کے دادا بدر دین لبانہ اس زمانے میں سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ ہمارا آبائی مکان بازار کھٹیکاں میں تھا۔ وہ درزی کا کام کرتے تھے۔ انہوں نے مصنف کو کئی بار بتایا کہ شیخ نور محمد نتھو مرحوم نہایت نرم دل اور صوفی منش بزرگ تھے۔ بعض مرزائی ان کی دکان پر آتے جاتے تھے لیکن ان کا مرزائی جماعت سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔

مبینہ بیعت کی روایات میں تضاد

ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی شیخ نور محمد مرحوم کے احمدی ہونے کی تردید کی ہے، لیکن شیخ عطا محمد کے لڑکے شیخ اعجاز احمد (مصنف مظلوم اقبال) کہتے ہیں کہ 1902ء میں ان کی منجھلی پھوپھی طالع بی کا انتقال ہوا تھا۔ سیالکوٹ کی احمدی جماعت ان کے جنازے میں شامل نہ ہوئی۔ اس پر میاں جی (نور محمد) نے میر حامد کے ذریعے مرزا صاحب کو پیغام بھیجا کہ میں عمر رسیدہ ہوں اور آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا اس لئے وہ پہلے جماعت میں شامل تھے 1902ء میں علیحدہ ہوئے۔ سیرت المہدی کی روایت میں بیعت توڑنے کے لئے خط لکھنے کا ذکر ہے۔ اس میں میر حامد کے ذریعے زبانی پیغام بھجوانے کا کہا گیا ہے۔ سیرت المہدی کی روایت میں بیعت توڑنے کا سن 1895 کے لگ بھگ بنتا ہے اور اعجاز احمد کی روایت میں 1902ء بتایا گیا ہے۔ اس روایت کا بھی جماعت احمدیہ کے ریکارڈ میں کوئی حوالہ نہیں ہے۔ 1935ء کے بعد گھڑی گئی یہ روایات نا قابل اعتبار ہیں۔ نور محمد مرحوم ہر معاملے میں سید میر حسن سے مشورہ کرتے تھے۔ جب سید میر حسن احمدیت کے خلاف

پڑھنا حرام ہے۔ اس کے خلاف سیالکوٹ سے حضرت مسیح موعود کی اپنی تحریر
پیش کی گئی جس کے ماتحت سیالکوٹ کی جماعت حضرت مسیح موعود کی زندگی
میں غیر احمدیوں کا جنازہ پڑھتی رہی میاں صاحب نے یہ کہہ کر اسے پس
پشت پھینک دیا ہے کہ ایسی تحریر ملی ہے، اس پر بعد میں غور کیا جائے گا مگر
فتویٰ میاں صاحب کا چلے گا چنانچہ سال ہا سال گزر گئے ہیں آج تک اس پر
غور ہو رہا ہے''۔(17)

شیخ عطا محمد کے اہل خانہ کا کہنا ہے کہ آخری عمر میں وہ جماعت احمدیہ سے الگ ہو گئے تھے۔ 22دسمبر 1940 کو انہوں نے وفات پائی۔ امام صاحب کے قبرستان سیالکوٹ میں دفن ہوئے ایک سنی عالم مولوی سکندر خان نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی البتہ ان کے فرزند شیخ اعجاز احمد نے الگ نماز جنازہ پڑھی (18) کیونکہ ان کے نزدیک وہ احمدی تھے اور احمدی غیر احمدی امام کے پیچھے نماز جنازہ نہیں پڑھتے صرف اپنے امام کی اقتداء میں جنازہ پڑھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عطا محمد 1934ء تک احمدی تھے اور مرزا محمود کو خلیفہ مانتے تھے لیکن غیر احمدیوں کا جنازہ پڑھنے کے بارے میں مرزا صاحب کی سیالکوٹ جماعت کو دی گئی ہدایت پر عمل پیرا تھے جیسا کہ اعجاز احمد نے اعتراف کیا ہے کہ ان کا مسئلہِ جنازہ پر اختلاف تھا۔ اس سے ایک تو ان کے بیٹے اعجاز احمد کی یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ 1902ء میں شیخ نور محمد جماعت احمدیہ سے اس لئے الگ ہوئے کہ ان کی پھوپھی طالع بی کا احمدیوں نے جنازہ نہ پڑھا۔ سیالکوٹ کے احمدی غیر احمدی کا جنازہ پڑھ لیتے تھے۔ دوسرے شیخ عطا محمد نے احمدی ہونے کے باوجود مرزا محمود سے مسئلہ جنازہ پر اختلاف کے باعث ان کی 1914ء سے 1934ء تک بیعت نہ کی اور 1934ء میں ظفر اللہ کے ایماء پر انہوں نے قادیان بیعت کا خط لکھا۔ اس کے بعد انہوں نے غالباً دوبارہ احمدیت سے رجوع کر لیا تھا، جیسا کہ ان کے اہل خانہ بیان کرتے ہیں(19)

علامہ اقبال پر احمدی ہونے کا الزام

علامہ اقبال نے 1935ء میں قادیانیت کے خلاف جو باطل شکن مضامین لکھے ان کے جواب میں مرزا محمود نے 24 مئی 1935 کو جو خطبہ دیا اس میں ان کے والد مرحوم اور بھائی کے احمدی ہونے کا ذکر کیا لیکن ان کو احمدی کہنے کی جسارت نہ کی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ خود اس کی تردید کر دیتے۔ خواجہ کمال الدین کے فرزند خواجہ نذیر احمد بار ایٹ لاء لاہور میں وکالت کرتے تھے۔ انہوں نے 1953 کی تحقیقاتی عدالت میں شہادت دی کہ ان کے دوست غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ علامہ اقبال کے ساتھ 1893ء میں قادیان گئے اور مرزا صاحب کی بیعت کی۔ (اس زمانے میں وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ مصنف) پہلے خواجہ نذیر احمد نے سن بیعت 1893ء یا 1894ء بتایا بعد میں قصوری صاحب نے جو اس وقت زندہ تھے انہیں بتایا کہ یہ سن 1893ء نہیں 1897ء ہے۔ (اس وقت وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے طالب علم تھے۔ مصنف) اس پر خواجہ صاحب نے عدالتی ریکارڈ میں تصحیح کرائی۔ (20)

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ جرح کے دوران گواہ نے پہلے تو یہ کہا کہ یہ بیعت 1893ء یا 1894ء میں ہوئی پھر کہا کہ 1897ء میں ہوئی تھی بعد ازاں گواہ نے اپنی شہادت کے کسی اور حصے میں بتایا کہ اقبال 1930ء تک مرزا صاحب کو مجدد مانتے رہے۔ (21) گواہ نے پھر کہا کہ اس نے اپنے بیان میں یہ کہیں بھی نہیں کہا کہ اقبال احمدی تھے (22)۔ خواجہ نذیر احمد نے عدالت کے سامنے یہ وضاحت پیش کی کہ پاکستان ٹائمز لاہور بابت 4 نومبر 1953 میں جو یہ رپورٹنگ ہوئی ہے کہ اقبال 1931 تک قادیانی تھے، یہ ان کی گواہی کو غلط طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ علامہ اقبال قادیانی تھے انہوں نے یہ کہا تھا کہ علامہ اقبال نے بیعت کی تھی۔

سوال پیدا ہوتا ہے مبینہ بیعت چاہے زبانی ہو یا تحریری، مرزا صاحب کی بیعت کر لینے کے بعد انہیں قادیانی کہنے میں کیا تامل ہے؟ بہر حال خواجہ صاحب کا بیان تضاد کا نمونہ ہے۔ خواجہ نذیر احمد اس وقت اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیر مین تھے۔ انہوں

نے تحقیقاتی عدالت کو بتایا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی (جو 1931ء میں قائم ہوئی۔مصنف) کے صدر مرزا بشیر الدین محمود احمد اور علامہ اقبال کمیٹی کے ممبروں میں شامل تھے جب ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے (1933ء۔مصنف) تو انکے والد (خواجہ کمال الدین) اقبال سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گئے۔اس ملاقات میں وہ (خواجہ نذیر احمد) ان کے ہمراہ تھے۔ان کے والد صاحب نے علامہ اقبال سے بے تکلفی سے پنجابی زبان میں کہا۔

اوے یار تیری بیعت دا کی ہویا (اے یار تمہاری بیعت کا کیا ہوا)

علامہ اقبال نے جواب دیا

اوو یلا ہورسی اے ویلا ہوراے (وہ وقت اور تھا یہ اور ہے)

یہ واقعہ 1933 کا ہے (23)

خواجہ کمال الدین 29 دسمبر 1932 کو وفات پا چکے تھے۔(24) 1933ء میں وہ خواجہ نذیر احمد کے ساتھ علامہ اقبال سے ملنے کیسے گئے؟

شیخ عبدالماجد کے والد شیخ عبدالقادر (سابق سوداگرمل) نے 1966ء میں تاریخ احمدیت لاہور لکھی۔ وہ اس میں بابو غلام محمد (م۔1946) کی ایک روایت درج کرتے ہیں کہ مارچ 1897ء میں لاہور کے بعض تعلیم یافتہ افراد جن میں مولوی محمد علی، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر محمد اقبال، مولوی غلام محی الدین قصوری، چوہدری شہاب الدین، مولوی سعدالدین بی۔اے ایل ایل بی وغیرہ شامل تھے مرزا صاحب سے ملنے قادیان گئے۔ ملاقات کے بعد مولوی محمد علی، چوہدری شہاب الدین، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولوی غلام محی الدین قصوری اور خاکسار (بابو غلام محمد) نے ان کی بیعت کرلی۔بعض اور لوگوں نے بھی بیعت کی تھی مگر ان کے نام انہیں یاد نہیں رہے (25)

بابو غلام محمد قادیانی جن کی گواہی پیش کی گئی ہے راقم کی تحقیق کے مطابق فورمین تھے اور ریلوے میں ملازم تھے۔ان کی جماعت لاہور کے اکابر سے دوستی رہی لیکن مرزا محمود کے غالی مرید تھے۔انہوں نے مرزا صاحب کی بیعت کی تھی۔ایسے غیر معروف غالی قادیانی کی روایت کو کوئی

حیثیت نہیں دی جا سکتی نہ ہی ایسی جعلی روایات بیان کرنے کے قابل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اتنے افراد نے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے مرزا صاحب کی بیعت کی لیکن قادیانی لٹریچر میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس زمانے میں قادیانی اخبار الحکم امرتسر سے شائع ہوتا تھا، 1897ء میں قادیان سے شائع ہونے لگا۔ اس میں نئے بیعت کرنے والوں کا ذکر ہوتا تھا لیکن اس اہم واقعے کا کوئی ذکر نہیں نہ ہی مرزا صاحب نے اپنی کسی تصنیف میں فخریہ طور پر اتنے تعلیم یافتہ افراد کی ایک وقت میں بیعت کا ذکر کیا ہے نہ ہی ان کے ملفوظات میں اقبال اور دیگر افراد کی بیعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ 1897ء میں جن لوگوں نے مرزا صاحب کی بیعت کی ان میں مولوی محمد علی، مولوی شیر علی، غلام رسول راجیکی اور قاضی ظہور اکمل کے نام ملتے ہیں اور یہ نام سلسلہ احمدیہ کے لٹریچر میں موجود ہیں۔ (26)

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں۔ یہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں بہر حال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلے میں مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کچھ تعلق رہا تھا (27) یا وہ مرزا صاحب کے کسی بھی دعوے کو مانتے تھے۔

شیخ اعجاز احمد بھی تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کی بیعت کرنے کی بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ (28)

سر ظفر اللہ اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں۔

'ڈاکٹر اقبال نے جہاں تک میرا علم ہے بیعت نہیں کی ان کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شاید انہوں نے بیعت کی تھی تاہم ان کے بڑے بھائی نے بیعت کی تھی۔ (29)

سر ظفر اللہ نے اپنے ایک اور انٹرویو میں بھی اقبال کے مرزا صاحب سے بیعت کرنے کا انکار کیا ہے۔ (30)

ڈاکٹر بشارت احمد نے مجدد اعظم کے نام سے تین جلدوں میں مرزا صاحب کی سوانح لکھی ہے۔ وہ مجدد اعظم جلد اول میں جو 1939ء کے آخر میں شائع ہوئی لکھتے ہیں کہ فروری 1892ء میں

مرزا صاحب سیالکوٹ آئے (اس زمانے میں ان کے مسیح موعود اور محدثیت کے دعاوی کی وجہ سے ان کی مخالفت زوروں پر تھی۔ مصنف) انہوں نے میر حسام الدین کے مکان پر قیام کیا۔ انہوں نے نماز ظہر کے بعد ایک تقریر کی۔ لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ (ڈاکٹر) اقبال مشہور شاعر اس زمانے (1892ء) میں میرے ہم جماعت تھے (میٹرک میں سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے۔ مصنف) یہ مسجد کی ڈیوڑھی کی چھت پر چڑھے بیٹھے تھے۔ مجھے (بشارت احمد کو) دیکھ کر کہنے لگے دیکھو شمع پر پروانے گر رہے ہیں۔ ان دنوں انہیں حضرت اقدس (مرزا صاحب) سے بہت ارادت تھی چنانچہ شہر سیالکوٹ کے ایک شاعر نے جو جلوہ تخلص کرتا تھا جب ایک نظم حضرت اقدس کی ہجو میں لکھی تو ڈاکٹر اقبال نے اس کا جواب نظم میں ہی لکھا اور اس میں حضرت اقدس کی بڑی تعریف لکھی۔(31)

ڈاکٹر بشارت احمد 1891ء میں نویں جماعت کے طالب علم تھے 1892ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ان کے انٹرنس (میٹرک) پاس کرنے کا ذکر نہیں ملتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انٹرنس میں یا تو فیل ہو گئے یا تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے گئے اور کسی اور سکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ اسکاچ مشن سکول کنک منڈی سیالکوٹ میں پڑھتے تھے۔ 1904ء میں پنڈی گھیب (اٹک) میں اسسٹنٹ سرجن تھے(32)اپریل 1943 میں وفات پائی۔ وہ لاہور جماعت کے ممتاز رکن تھے اور مولوی محمد علی کے رشتہ دار تھے۔

یہ روایت بھی علامہ اقبال کی زندگی میں شائع نہ ہوئی البتہ 1939ء میں شائع کی گئی۔ میٹرک میں زیر تعلیم بشارت احمد کی اس روایت سے 15 سالہ اقبال احمدی ثابت نہیں ہوتے جو محض میٹرک کے طالب علم تھے۔خود بشارت احمد نے 1902ء میں مرزا صاحب کی بیعت کی۔(33)

انہوں نے جس شاعر جلوہ کا ذکر کیا ہے ان کا نام میراں بخش جلوہ تھا اور وہ سیالکوٹ کچہری میں وثیقہ نویس تھے۔ ان کے مجموعہ کلام گلشن نعت، جلوہ حق، تحفہ جلوہ، دیوان جلوہ، نوحہ جات جلوہ وغیرہ میں نہ تو مرزا صاحب کی کوئی ہجو درج ہے اور نہ علامہ اقبال کی کسی جوابی نظم کا ذکر ہے جو انہوں

نے مبینہ طور پر مرزا صاحب کی مدح میں کہی۔ احمد یہ لٹریچر میں بھی ایسی کسی نظم کا سراغ نہیں ملتا۔

علامہ اقبال سے منسوب ایک نظم

نومسلم سعد اللہ لدھیانوی مرزا صاحب کے سخت مخالف تھے مرزا صاحب نے ان کو ہندو زادہ، دین فروش، ملعون، شیطان فطرت وغیرہ کہا ہے اور ان کے خلاف ایک نظم کہی ہے جس کا مصرع اولیٰ ہے۔ اک سگ دیوانہ لدھیانے میں ہے۔ قادیانی کہتے ہیں کہ اقبال نے 1893ء میں جب وہ سکاچ مشن سکول سیالکوٹ میں ایف اے کے طالب علم تھے سعد اللہ کے خلاف ایک ہجو کہی جس کا پہلا شعر ہے:

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
مہتروں میں خوب ہو گی قدر دانی آپ کی (34)

اس ہجو کے آخر میں الراقم شیخ محمد اقبال ایف اے کلاس سکاچ مشن سکول سیالکوٹ لکھا ہے۔ شیخ یعقوب علی قادیانی نے اپنی تصنیف آئینہ حق نما (1912) کے صفحہ 107 پر اس کو درج کیا ہے۔ قادیانیوں کا کہنا ہے کہ یہ شیخ محمد اقبال علامہ اقبال تھے۔ البتہ قادیانیوں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ نظم ان کے کسی مجموعہ کلام میں نہیں۔ (35)

قادیانیوں نے علامہ اقبال کی زندگی میں یہ بات بیان نہیں کی۔ شیخ یعقوب علی نے 1912ء میں مرزا صاحب کی صداقت پر مبنی مواد اکٹھا کرتے وقت اس نظم کو اپنی تالیف میں درج کیا ہے۔ لیکن علامہ اقبال سے منسوب نہیں کیا ہے۔ یہ سلسلہ قادیانیوں نے ان کی وفات کے بعد شروع کیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ مبینہ نظم 1893ء میں کہاں چھپی جہاں سے شیخ یعقوب علی نے نقل کی۔ اس کا ماخذ قادیانیوں نے کبھی نہیں بتایا تا کہ اس پر تحقیق کی جا سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے 1893ء میں انٹرنس پاس کر کے سکاچ مشن کالج میں ایف اے کلاس میں داخل لے لیا تھا اس میں ایف اے کلاس سکاچ مشن سکول لکھا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس میں مہتروں، خاکروبوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سعد اللہ لدھیانوی سے

خوش ہوں گے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظم نگار کا اشارہ مرزا صاحب کے پادری عبداللہ آتھم سے مناظرہ (جنگ مقدس) اور ان کی موت کی پیش گوئی کی طرف ہے۔ یہ مباحثہ امرتسر میں 22 فروری 1893 سے 5 جون 1893ء تک ہوا جس کے بعد مرزا صاحب نے بذریعہ الہام آتھم کے پندرہ ماہ کے اندر مرنے کی پیشین گوئی کی جو پوری نہ ہوسکی۔

اس نظم کے متن سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ سعد اللہ نے پیش گوئی کے پورا نہ ہونے اور آتھم کے ستمبر 1894 تک وفات نہ پانے کے بعد مرزا صاحب کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ مرزا صاحب نے واضح طور پر اس پیش گوئی کے جھوٹا ہونے کے باوجود اس کے عظیم الشان طور پر پورے ہونے کا دعویٰ کیا۔ سعد اللہ مرزا صاحب کے سخت خلاف تھا اور اس نے ایک کتاب ''شہاب ثاقب بر مسیح کاذب'' لکھی اور 16 ستمبر 1894 کو ان کے خلاف ایک نہایت سخت الفاظ میں اشتہار شائع کیا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے اپنی کتاب انوار الاسلام کے ایک اشتہار مورخہ 5 اکتوبر 1894 میں اسے عدو اللہ اور ابتر کہا۔ شاید اس زمانے (1894ء) میں یہ نظم لکھنے والے نے مرزا صاحب کی پادری آتھم کے متعلق پیش گوئی کا دفاع کرنے کے لئے سعد اللہ کو برا بھلا کہا اور بتایا کہ اس کے اس طرز عمل سے عیسائیوں، مہتروں اور خاکروبوں میں اس کی عزت افزائی ہوگی کیونکہ وہ آتھم کے پیش گوئی کے مطابق وفات نہ پانے پر خوش ہیں اس نظم کا یہ مصرعہ کہ اشتہار آخراک آنت ہے شیطان کی 16 ستمبر 1894 کے اشتہار کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے داخلی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم ستمبر 1894 کے بعد کی ہے کیا ایسی نظم سکاچ مشن کالج کے کسی جریدے میں شائع ہوسکتی تھی جس کو پریسبٹیرین چرچ سیالکوٹ چلا رہا تھا اور کیا اس میں عیسائیوں کے لئے ایسے نازیبا الفاظ استعمال کئے جا سکتے تھے؟۔ قادیانی اس نظم کا نہ تو اصل ماخذ اور نہ ہی اس کا درست پس منظر بتاتے ہیں۔

اقبال 1894ء میں سکاچ مشن کالج میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ سکول سے میٹرک کر لیا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 1935 کے بہت بعد قادیانیوں نے یہ جعل سازی کی کہ مبینہ نظم

کے آخر میں کسی اور شخص کے نام کی جگہ شیخ محمد اقبال لکھ دیا، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی اور صاحب ہوں۔ بہر حال علامہ اقبال کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کے کسی غیر مطبوعہ کلام میں اس کا ذکر ہے۔ یہ نظم اتنی گھٹیا، سوقیانہ اور پھسپھسی ہے کہ علامہ اقبال کے ابتدائی کلام سے اس کو نسبت دینا ہی حماقت ہے۔ علامہ کا اسلوب بیان ان کی ابتدائی شاعری سے عیاں ہے جو رنگ تغزل لئے ہوئے ہے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم کہتے ہیں یہ نظم خود ساختہ ہی نہیں بلکہ پھسپھسی ہونے کے علاوہ لغو ہے، اس قسم کے شوشے چھوڑنا مرزائیوں نے اپنا وظیفہ حیات بنالیا ہے۔(36)

علامہ اقبال سے منسوب نظم

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی — خوب ہوگی مہتروں میں قدر دانی آپ کی

بیت ساری آپ کی بیت الخلا سے کم نہیں — ہے پسندِ خاکروباں شعر خوانی آپ کی

تیلیاں جاروب کی لیتے وہ خامہ کے عوض — کھینچتے تصویر گر بہزاد و مانی آپ کی

اِن دنوں کو فصلِ گُل کہیے دیا دِن پھول کے — ہر طرف ہوتی ہے سعدی گلفشانی آپ کی

آپ کے اشعار موتی ہیں مگر تی کے بغیر — گوشِ عالم تک یہ پہنچے ہیں زبانی آپ کی

گوہرِ بے آب جھڑتے ہیں آپکے منہ سے سبھی — جان سے تنگ آگئی ہے مہترانی آپ کی

ہر طرف سے آ رہی ہے یوں جو دُر دُر کی صدا — بھاگئی اہلِ سخن کو دُر فشانی آپ کی

آپ سے بڑھکر عروضیہ کوئی دنیا میں نہیں — واہ صاحب شعر خوانی شعر دانی آپ کی

خاک کو ہم چاٹ کر یہ بات کہدیتے ہیں آج — تلخ کامی ہوگی یہ شیریں دہانی آپ کی

جب ادھر سے بھی پڑینگے آپکو سابن کے مول — آپ پر کھل جائے گی رنگیں بیانی آپ کی

کھاؤ گے فرانسی سے پلپلا ہو جائے گا — پھر نکل جائیگی سر سے شعر خوانی آپ کی

دین اور ایمان کی دُم میں واہ نمدہ دیدیا — سارے عالم کی زباں پر ہے کہانی آپ کی

آفتابِ صدق کی گرمی سے گھبراؤ نہیں — حضرتِ شیطاں کرینگے سائبانی آپ کی

اشتہارِ آخری اِک آفت ہے شیطان کی — سر بسر حق سے عیاں ہے خوش بیانی آپ کی

وہ مثل ہے طویلے کی بلا بندر کے سر — ہوگیا ہم کو یقیں شامت ہے آئی آپ کی

خر گماروں کا مواد دھوبن سے ہوتی ہے مفت — ہے مگر قومِ نصاریٰ یارِ جانی آپ کی

رانڈ کے چرخے کی صورت کیوں چلے جاتے ہیں آپ — اہلِ عالم نے سبھی بکواس جانی آپ کی

نیلے پیلے یوں نہ ہو پھر کیا کروگے اُس گھڑی — جب خبر لیویگا قہرِ آسمانی آپ کی

بات رہجاتی ہے دنیا میں نہیں رہتا ہے وقت — آپ کو نادم کرے گی بد زبانی آپ کی

قوم عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل — واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی

(آئینۂ حق نما صفحہ ۱۰۷ اور ۱۰۸ مؤلفہ ۱۹۱۲ء)

باب 1:

حوالے وحواشی

(1) مرزا غلام احمد، ستارہ قیصریہ 24 اگست 1899ء، قادیان ص 6

(2) A.R. Dard, Life of Ahmed, Lahore, 1948 p.13

(3) مرزا غلام احمد، کشف الغطاء، قادیان، دسمبر 1898 ص 8

(4) مرزا محمود احمد، سیرت مسیح موعود، ربوہ ص 15

(5) مولوی نورالدین کے فرزند مولوی عبدالمنان عمر کا سالانہ جلسہ 1977 لاہور سے خطاب، احمدیہ انجمن لاہور فروری 1978، ص:12

(6) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، 1977ء ص:186

(7) تبلیغ رسالت جلد اول، مولفہ میر قاسم علی، قادیان، ص:58

(8) عبداللہ چغتائی، روایات اقبال، ص:45

(9) الفضل قادیان، 30 مئی 1935ء

(10) سیرت المہدی، جلد سوم قادیان 1939، ص:250-249

(11) ایضاً، ص:9

(12) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت، زندہ رود پر تبصرہ، لاہور 1991، ص:36

(13) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ، لاہور 1996، ص:178

(14) ایضاً

(15) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت، ص:36

(16) مرزا محمود احمد، حقیقت الامر، قادیان 1918، ص:18-17

(17) ڈاکٹر بشارت احمد، مراۃ الاختلاف، لاہور 1936ء، ص:85

(18) زندہ رود، حصہ سوم، ص:57

(19) ایضاً

(20) ایضاً

(21) وہ جمال الدین افغانی کو مجدد قرار دیتے تھے ان کے نزدیک یہ اگر کوئی دینی منصب تھا۔

(22) جاوید اقبال، زندہ رود جلد سوم، ص: 570

(23) ایضاً، پاکستان ٹائمز لاہور، 15 نومبر 1953ء

(24) دعوت نامہ جلسہ سالانہ 1980 انجمن احمدیہ لاہور، ص: 7

(25) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت، ص: 39

(26) سووینیر کراچی مجلس خدام الاحمدیہ، کراچی 1987ء، ص: 21

(27) زندہ رود حصہ سوم، ص: 570

(28) اعجاز احمد، مظلوم اقبال، ص: 191

(29) ماہنامہ انصار اللہ ربوہ نومبر دسمبر 1985ء، ص: 102 سر ظفر اللہ نمبر

(30) پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور، مئی 1981، ص: 34

(31) ڈاکٹر بشارت احمد، مجدد اعظم جلد اول انجمن احمدیہ لاہور دسمبر 1939ء، ص: 333

(32) سید سلطان محمود، حوالہ سابق، ص: 188

(33) ممتاز احمد فاروقی، مجاہد کبیر، لاہور، 1962 ص 249

(34) پوری نظم اس باب میں درج ہے۔

(35) عبدالماجد فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 446

(36) مرزائیل انجمن طلباء اسلام چنیوٹ 1968ء ص 124

باب 2

بانیِ قادیانیت کے متعلق علامہ اقبال کی ابتدائی تحریر

مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں علامہ اقبال کا ایک مضمون بمبئی کے ایک علمی رسالے میں چھپا جس میں انہوں نے مرزا صاحب کو ہندی مسلمانوں کا عظیم دینی مفکر کہا۔ ہم اس کے پس منظر پر گفتگو کرتے ہیں۔

1890ء سے 1900ء تک مرزا غلام احمد قادیانی مجدد، مسیح موعود اور جزوی نبی (محدَّث) ہونے کے مدعی تھے۔ محدثیت کو وہ جزوی نبوت کہتے تھے اور حقیقی نبوت کے دعویدار کو ختم نبوت کا منکر اور کافر قرار دیتے تھے۔ وہ خدا سے کلام کرنے کے دعویدار تھے اور تصوف کی اصطلاحات فنا فی اللہ، فنا فی الرسول اور ظل و بروز کی آڑ میں اپنی نبوت اور مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ کا دعویٰ پیش کرتے تھے۔ (1) وہ محی الدین ابن عربی کے نظریہ نبوت کے قائل تھے اور دیگر صوفیاء کی تحریرات کو اپنے دعوے کا جواز بناتے تھے۔ ابن عربی کی فصوص الحکم اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی آڑ میں وہ خدا سے ہمکلامی اور ولایت کے اعلیٰ ترین مقام محدثیت (جزوی نبوت) کے حصول کا ذکر کرتے تھے۔(2)

علامہ اقبال نے 1895ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے 1897ء میں بی اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کی رہنمائی میں ایم۔اے فلسفہ کیا۔ 13 مئی 1899ء کو انہوں نے اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عریبک ریڈر کا عہدہ قبول کیا۔ 1898ء یا 1899ء میں انہوں نے مشہور صوفی عبدالکریم جیلی کے نظریۂ انسانِ کامل اور توحیدِ مطلق کے موضوع پر ایک تحقیقی مضمون لکھا۔ یہ تحقیقی مضمون یا تو ایم اے فلسفہ پنجاب یونیورسٹی کے آخری پرچے کے لئے تیار کیا یا 1898ء میں قاہرہ سے عبدالکریم جیلی کی تصنیف انسان کامل آرنلڈ کے پاس لندن پہنچی تو انہوں نے اقبال کو روانہ کر دی تاکہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں۔ یہ مضمون اپنے مزاج اور اسلوب کے اعتبار سے اسی قسم کا تبصرہ معلوم ہوتا ہے۔(3)

بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں کہ اقبال زندگی کے اس دور میں وحدت الوجودی فلسفے سے متاثر تھے اور روایتی تصوف کے دلدادہ تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی اپنے افکار کی تائید میں ابن عربی اور فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ سے استفادہ کرتا تھا اس لئے اگر اقبال نے اس مضمون میں جیلی کے فلسفے سے بحث کرتے ہوئے مرزا غلام احمد کی تعریف کی تو کوئی اچنبھا نہیں۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ جس مسئلے کا اقبال یہاں ذکر کر رہے تھے وہ مسئلہ نور محمدی ہے۔ یہ نظریہ تنزلات ستہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اقبال اس نظریہ کے حامی تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ ایسا نظریہ ہے جس کی تائید بہترین حکمائے اسلام نے کی ہے اور موجودہ دور میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اس کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ (4)

علامہ اقبال کا یہ مضمون بمبئی کے مشہور جریدے انڈین انٹی کیوری Indian Anti quary کے ستمبر 1900ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس تحقیقی مضمون کے بعض حصوں میں ترمیم و تنسیخ کے بعد 1907ء میں علامہ اقبال نے اسے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے (فلسفہ عجم) Development of Metaphysics in Persia میں شامل کیا۔ مقالہ کا عنوان تھا

The Doctrine of the Unity as Expounded by Al-Jili - by Sheikh Muhammad Iqbal (Mcleod Arabic Reader Oriental College Lahore)

اس زمانے میں علامہ اقبال روایتی تصوف اور نظریہ وحدت الوجود کے قائل ہونے کی وجہ سے ابن عربی اور الجیلی کو بلند پایہ صوفی قرار دیتے تھے لیکن مثنوی اسرار خودی لکھتے کرتے وقت 1915ء میں ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور وہ مروجہ تصوف اور حافظ شیرازی کے خلاف ہو گئے۔ الجیلی نے ابن عربی سے انسان کامل کا تصور لیا تھا۔ علامہ اقبال نے الجیلی کے نظریات کا جرمن فلسفیوں کے نظریات سے تقابل پیش کیا اور ان میں یک گونہ مماثلت اور مشابہت بتائی۔ (5)

قاضی جاوید لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی ذہنی زندگی کا آغاز فلسفہ وحدت الوجود اور اس کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور مذہبی نتائج کو قبول کرنے سے ہوا۔ اس دور میں علامہ نے ہندی عوام کے

مختلف ثانوی گروہوں کے درمیان یک جہتی اور یگانگت پیدا کرنے کا پیغام دیا اس پیغام کی اساس وحدت الوجود کی مابعد الطبیعات پر رکھی گئی۔ علامہ اقبال کی اس دور کی شاعری میں نوافلاطونی اور صوفیانہ مابعد الطبیعیات کے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں۔ انہوں نے اس کا خود اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کے قائل رہے جو صوفیا کے ساتھ خاص ہیں جو بعد میں قرآن پر تدبر کرنے سے غلط ثابت ہوئے مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح کاملہ، مسئلہ وحدت الوجود، یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب انسان کامل میں کیا ہے۔(6)

علامہ اقبال نے اپنے تحقیقی مضمون (7) میں بتایا ہے کہ ہستی مطلق باوجود خالص ہونے کے اپنی مطلقیت کو چھوڑنے کے بعد تین منازل سے گزرتی ہے 1)احدیت 2)غیریت 3)ذاتیت۔ پہلی منزل میں تمام اغراض و علائق کا فقدان ہوتا ہے پھر بھی اس کو واحد ہی کہتے ہیں۔ اس لئے احدیت مطلقیت سے ایک قدم ہٹ جاتی ہے۔ دوسری منزل میں ہستی خالص تمام مظہر سے آزاد رہتی ہے اور تیسری منزل یعنی ذاتیت خود غیریت ہی کا ایک خارجی مظہر ہے جیسا کہ ہیگل اس کی تعبیر کرتا ہے۔ یہ انفعال ذات باری ہے یہ تیسری منزل اسم اللہ کا دائرہ ہے یہاں ہستی خالص کی ظلمت کو منور کیا جاتا ہے۔ فطرت اس کے سامنے آجاتی ہے۔ ہستی مطلق ذی شعور ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد الجیلی کہتا ہے کہ اسم اللہ ایک چیز ہے جس سے الوہیت کے مختلف پہلو کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ہستی خالص کی ترقی کی دوسری منزل میں انفعال ذات ربانی کا جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ اسی اسم ذات کی گرفت میں بالقوہ موجود تھا جس نے ارتقاء کی تیسری منزل میں آ کر خارجیت اختیار کر لی اور ایسا آئینہ بن گیا جس میں خدا نے اپنے آپ کو منعکس کیا اس طرح اسم اللہ نے اپنے آپ کو شفاف کر کے ہستی مطلق کی تاریکی کو دور کر دیا(8)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس وضاحت سے الجیلی نے جدلیات ہیگل(9) (یعنی ہستی مطلق ہی حقیقت اولیٰ ہے۔مصنف) کے مرکزی خیال کی پیش بینی کی ہے اس

طرح سے اس نے لوگوس یعنی کلام (الٰہی) کے نظریے (10) پر زبردست طریق سے زور دیا ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ یہ نظریہ (لوگوس) ہمیشہ ہی اسلام کے بڑے دینی مفکرین کی نظر میں پسندیدہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ (11) اس کے معا بعد فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں اس نظریہ لوگوس یا کلام (الٰہی) کا قادیان کے مرزا غلام احمد نے دوبارہ پرچار کیا ہے جو غالباً جدید ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم دینی مفکر ہیں۔

یہ پیراگراف جس میں مرزا صاحب کو ہندوستانی مسلمانوں کا غالباً عظیم دینی مفکر کہا گیا ہے، پورے مضمون کے حوالے سے ان کے خیال پر رائے زنی کئے بغیر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب غالباً اس لحاظ سے عظیم دینی مفکر کہے جا سکتے ہیں کہ انہوں نے قدیم صوفیاء کے بعد نظریہ لوگوس کلام یا کلمہ الٰہی کا ازسرنو پرچار کیا۔ انہوں نے خدا سے کلام اور مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ کا دعویٰ کیا اور فنافی اللہ اور نبی کریمؐ کے ظل وبروز ہونے کی آڑ میں انسان کامل کے منصب پر فائز ہونے کی سعی کی۔ (12) مرزا قادیانی کا دعویٰ تھا کہ خدا پہلے بھی کلام کرتا تھا اب بھی کرتا ہے اور کرتا رہے گا اس کی صفت تکلم معطل نہیں ہوئی اور الہام خداوندی کے نزول کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو اسلام ایک مردہ مذہب قرار پاتا ہے۔ خدا کی ہستی کا ثبوت اس کا اپنے بندوں سے ہم کلام ہونے سے ملتا ہے۔ (13)۔ 1900ء تک مرزا صاحب نے اپنی کتابوں میں مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ کے موضوع پر جو مباحث کیے ہیں اور جس طرح اپنی ذات کو متصوفانہ رنگ میں مہبط وحی والہام بتایا ہے اس کی بنیاد پر علامہ اقبال کی یہ عمومی رائے تھی۔ علامہ اقبال نے نہ تو کوئی قطعی اور حتمی رائے دی ہے نہ ہی وہ مرزا صاحب کو دعوؤں میں سچا سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں چونکہ مرزا صاحب ہندوستان میں اس نظریے کا پرچار کر رہے تھے اور جزوی نبوت (محدثیت) اور خدا کے ساتھ ہم کلام ہونے کے مدعی تھے اس لئے غالباً وہ اس زمانہ (1899-1900) میں ہند کے جدید مسلمانوں کے عظیم ماہر دینیات قرار دیئے جا سکتے تھے۔ انہوں نے ابھی نبوت کاملہ تامہ کا دعویٰ نہیں کیا تھا، یہ دعویٰ 1901 میں کیا۔

علامہ اقبال نے جب میونخ یونیورسٹی میں 1905ء میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ پیش کیا تو اس حصے کو

جس میں مرزا صاحب کو غالباً عظیم دینی مفکر کہا گیا تھا حذف کر دیا اور مضمون میں کئی ترامیم کیں جو ان کے فکری ارتقاء کی مظہر ہیں۔ اب علامہ اقبال روایتی تصوف، وحدت الوجود اور جیلی اور ابن عربی کے نظریات کے خلاف ہو چکے تھے۔

آغا شورش کاشمیری مرحوم رقم طراز ہیں علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ مرزا غلام احمد جدید ہندی مسلمانوں کے اغلباً سب سے بڑے دینی مفکر ہیں تو اس سے بھی یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا کہ وہ مرزا غلام احمد کو مسیح موعود ظلی و بروزی نبی مانتے ہیں۔ یہ تو ایک عمومی تاثر تھا جو اس وقت کے مباحث سے پیدا ہو گیا تھا۔ جب مرزا صاحب مار آستین نکلے یا اس وقت کی صورت حال سے ان کا دماغ خراب ہو گیا تو معترفین نے اپنی رائیں تبدیل کر لیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس زمانے (1900) کی یہ تحریریں پیش کی جا رہی ہیں اولاً تو ان تحریروں کو علامہ اقبال نے اپنے فکری و نظری ارتقاء کے بعد لائق اعتناء نہ سمجھا، یہ ان کی ابتدائی تحریری مشقیں تھیں ثانیاً جب ان کا اسلامی شعور اور دینی تجربہ پختہ ہو گیا تو ان کے خیالات روشن ہو کر قوم کے لئے سنگ میل ہو گئے اور یہی افکار و نظریات ہیں جن کی صداقت پر انہیں حکیم الامت، شاعر مشرق اور ترجمان اسلام کہا جاتا ہے۔

1899ء میں حضرت علامہ نے ایم اے کیا، 1900ء میں ان کی عمر صرف 23 برس کی تھی۔ اس وقت تک وہ ایک شاعر تھے اور ان کی فکر کا آغاز نہ ہوا تھا۔ اس عہد کی تحریروں کے اقتباس تو قادیانی امت اپنی روایتی سچائی کے لئے بطور سند استعمال کرتی ہے لیکن جس عمر میں وہ پختہ ہو کر مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے تھے اس عمر کی متاع فکر سے فرار غایت درجہ کی بوالعجبی ہے، کوئی سا استدلال بھی اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ اقبال کبھی طالب علم بھی تھے تو کیا اس عمر کے اقوال کو حجت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک انہوں نے مشق سخن کے ابتدائی دور میں بہت سے اشعار لکھے جنہیں خیالات کی تبدیلی اور نظریات کی صحت کے بعد حذف کر دیا تو کیا ہم اس کلام کو بھی ان کے مستقل کلام پر فوقیت دے سکتے ہیں۔(14)

1902ء میں علامہ اقبال کا ختم نبوت کے متعلق عقیدہ:

فروری 1902ء میں علامہ اقبال کی ایک نظم شائع ہوئی جس میں ختم نبوت کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے اس زمانے میں مرزا صاحب قادیاں میں مشق نبوت فرما رہے تھے۔

1901ء میں رسالہ ایک غلطی کا ازالہ شائع کرنے کے بعد مرزا صاحب محدثیت کے مقام سے گزر کر نبوت کاملہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا'' خدا کی وحی میں انہیں بار بار نبی و رسول کہا گیا ہے اس لئے وہ اس منصب کا انکار نہیں کر سکتے۔ ایسے الفاظ اس زمانے (1901)ء میں پہلے زمانہ کی نسبت سے بہت تصریح اور توضیح کے ساتھ موجود ہیں۔'' فنافی الرسول کی کھڑکی کھلی ہے اور جو اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے اس پر ظلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے اس طرح محمدﷺ کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی گو بروزی طور پر اس طرح ان کی نبوت باعتبار محمد اور احمد ہونے کے ہے، ان کے نفس کی رو سے نہیں یہ نام انہیں فنافی الرسول کی حیثیت سے ملا وہ بروزی طور پر نبی و رسول ہیں۔ غیب کی خبریں پانے والا نبی کہلاتا ہے۔ اگر اسے محدث کہا جائے تو بتائیں کس لغت کی کتاب میں تحدیث کے معنی اظہار غیب ہیں مگر نبوت کے معنی اظہار امر غائب ہے''۔(15)

اس رسالے کی اشاعت کے بعد وہ لوگ جو ان کو محدث یا جزوی نبی مانتے تھے اور زمرہ اولیا میں شمار کرتے تھے ظلی بروزی رنگ میں حقیقی نبی ماننے لگے۔ 23 فروری 1902ء کو علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں ایک نظم پڑھی۔ یہ نظم اجلاس کی روائیداد کے صفحہ 32 پر بعنوان 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو' شائع ہوئی جس کے دیگر اشعار(16) میں سے ایک شعر یہ ہے

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنورِ شمع عرفاں کردہ ای

علامہ اقبال نے اس شعر میں ہر مفہوم۔ ظلی، بروزی، امتی، عکسی وغیر، میں مطلق نبوت کو ختم مانا

ہے۔ اس ایک شعر سے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کے تمام متصوفانہ فلسفے کی نفی ہو جاتی ہے اور اجرائے نبوت کا نظریہ چاہے کسی رنگ حیثیت یا توجیہہ کے ساتھ پیش کیا جائے اور اس کی آیت خاتم النبیین سے تطبیق کی کوشش کی جائے شرک فی النبوۃ قرار پاتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ اس کی ضرورت مرزا غلام احمد کے دعویٰ بروزیت کی بنا پر ہوئی یعنی علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تیرے (نبی کریمؐ) کے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوۃ ہے۔ خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی ظلی، بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔ (17)

یہ اشعار ان کے عقیدہ ختم نبوت پر کامل ایمان اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کی مکمل تردید کے لئے کافی ہیں اور اسی عقیدہ کا اظہار بعد میں انہوں نے اپنے کلام اور خطبات مدراس میں کیا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے دعویٰ نبوت (1901) سے پہلے اسی انداز کے شعر کہے، فرماتے ہیں۔

ہست او خیر الرسل خیر الانام
ہر نبوت را برو شد اختتام
ختم شد برنفس پاکش ہر کمال
لا جرم شد ختم ہر پیغمبرے

یعنی آنحضرت ﷺ ہی خیر الرسل اور خیر الانام ہیں ہر نبوت آپؐ پر ختم ہے۔ آنحضرت ﷺ کے پاک نفس پر ہر کمال ختم ہوگیا اس لئے ہر پیغمبر بھی ختم ہوگیا۔

علامہ اقبال کو بیعت کی دعوت (مئی 1902ء)

میر حامد سیالکوٹی علامہ اقبال کے استاد میر حسن کے چچازاد بھائی سید حسام الدین کے بڑے لڑکے تھے۔ 1877ء میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر سیالکوٹ میں ملازم ہوئے۔ 1915ء میں سپرنٹینڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انگریز ڈی سی ایبٹ ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ (18) وہ سیالکوٹ میں مرزا صاحب کے دعاوی کا پرچار کرتے رہے۔ تبلیغ احمدیت اور مرزا صاحب کی سچائی

کے اظہار کے لئے انہوں نے سادہ زبان میں نظمیں کہیں گو کہ ان میں شعری خوبی اور حسن کلام کا فقدان ہے۔ مثلاً 1892ء میں انہوں نے ایک نظم صدائے عاجزانہ (19) کے عنوان سے کہی، فرماتے ہیں۔

نذیر آیا ہے دنیا میں وہ دیکھو۔رہے آگاہ بیگانہ یگانہ
جو تھا اک آنے والا وہ یہی ہے۔ہے بدقسمت وہی جس نے نہ مانا
مسیحا کے مثل اترے وہ اترے۔کیا دعویٰ انہوں نے ملہمانہ
دیا وعدہ رسولؐ حق نے جس کا۔ امام اپنا وہ آیا ہم نے مانا

شاید اقبال کی انجمن حمایت اسلام کی روئیداد میں چھپنے والی نظم کو دیکھ کر میر حامد نے انہیں مرزا غلام احمد کی بیعت کی دعوت دی اس دعوت بیعت کا جواب 40 اشعار پر مشتمل اقبال کی نظم بعنوان 'خط منظوم پیغام بیعت کے جواب میں' شیخ عبدالقادر کے رسالے مخزن لاہور بابت مئی 1902ء اور منشی محمد دین فوق کے اخبار پنجہ فولاد مورخہ 11 جون 1902ء میں شائع ہوا۔ اس کے دو بند تھے پہلا 20 شعر اور دوسر 21 شعر کا تھا۔ نظر ثانی میں پہلا بند حذف کر دیا گیا اور دوسرے کے 21 شعروں میں سے 13 باقی رہ گئے اور یہ نظم بانگ درا میں عقل و دل کے عنوان سے چھپی۔ اس نظم کے عنوان سے عیاں ہے کہ بقول محمد عبداللہ قریشی علامہ اقبال پر احمدیت قبول کرنے کے لئے ڈورے ڈالے گئے۔ یہ نظم اور میر حامد سیالکوٹی کا منظوم جواب قادیانی اخبار الحکم نے 17,10 اور 24 جنوری 1903ء کے شماروں میں شائع کیا۔ اس نظم کی تمہید میں میر حامد نے لکھا کہ وُہ شیخ صاحب (اقبال) سے تعلق خاطر کی بناء پر انہیں نیک نیتی سے سچی نیکی اور اصل خوشی اور حقیقی تسلی کی راہ پر لانا چاہتا ہے۔ یہ میرے آئینہ دل کا عکس ہے جو میں شیخ صاحب پر ڈالنا چاہتا ہوں میں ان کو جانتا ہوں وہ مجھے جانتے ہیں دل ہی دل کا معاملہ ہے۔ (20)

وہ مزید لکھتے ہیں "مجھے امید ہے شیخ صاحب میرے اس جواب کو اس کے سچے محل پر رکھ کر حق سے توفیق مانگیں گے جس کی میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں بہتر ہوتا کہ وہ اس راہ میں اس

انداز سے قدم رکھتے ہوئے خدا کا خوف کرتے۔طبع آزمائی کے لئے جہان میں اور میدان تھوڑے ہیں اپنی مشغلہ پسند طبیعت کو اسی طرف مصروف رکھتے۔آگے کی خدا جانے مگر اب تک جو آسمانی مرد (مراد مرزا صاحب) کے مقابل میں آیا ہے اس کا نتیجہ آخر کار ایک افسوس ناک حالت پر منبی ہوا ہے۔ ہر رنگ میں خدا نے غلبہ اپنے بندے کو بخشا ہے۔بہتر ہے شیخ صاحب (اقبال) اپنے قلم کو روک لیں اور اپنے زور طبیعت کے لئے اور میدان پسند کریں۔(21)

میر حامد نے اپنے زعم باطل میں یہ شعر بھی کہا:

کیوں نہ ہو خاک پا مرا اقبال

حامدِ نائب خدا ہوں میں

اقبال کی جوابی نظم میں عشق رسول ﷺ، عقیدہ ختم نبوت، حق سے وابستگی، وحدت ملی اور امت کی یک جہتی نمایاں ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ میر حامد جانتے تھے کہ علامہ اقبال (1902) تک مرزا صاحب کے دعاوی پر یقین نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی زبانی یا تحریری بیعت کر کے جماعت احمدیہ میں شامل ہوئے تھے اس لئے انہوں نے ان کو احمدیہ جماعت میں شمولیت کی دعوت دی جو انہوں نے ٹھکرا دی۔ میر حامد نے اس کا بہت برا منایا۔ اس دعوت کے بعد وہ تمام قادیانی روایات جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اقبال فلاں سن میں احمدی تھے یا انہوں نے مرزا صاحب کی بیعت کر لی تھی غلط قرار پاتی ہیں کیونکہ سیالکوٹ ہی کے ایک با اثر احمدی اور مرزا صاحب کے مرید خاص کی طرف سے اس بات کی تحریری تردید ملتی ہے۔(22)

شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس سے پہلے بیعت نہیں کی ہوئی تھی اگر کی ہوتی تو یہ پیغام کیوں بھیجا جاتا؟(23)

علامہ اقبال کی 1903ء کی نظم

مارچ 1903ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں فریاد امت کے نام سے اقبال نے ایک نظم پڑھی جس کا دوسرا عنوان ابر گوہر بار تھا۔اس کا ایک شعر ہے

مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

مرزا صاحب مہدویت کا دعویٰ بھی کرتے تھے اور مثلِ محمدؐ کے بھی مدعی تھے اقبال نے اس کو رد کیا۔

علامہ اقبال کی مرزا غلام احمد قادیانی سے ملاقات (1904ء)

مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور بیان کرتے ہیں کہ اکتوبر 1934ء میں وہ ڈاکٹر اقبال کی عیادت کو گئے ڈاکٹر صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ اور (سر) فضل حسین 1904ء میں مرزا غلام احمد قادیانی سے ملے تھے۔ فضل حسین نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں تو مرزا صاحب نے جواب دیا ہرگز نہیں۔ 1935ء میں مولوی محمد علی نے اس سلسلے میں ایک اشتہار بھی شائع کیا۔ (24)

ڈاکٹر بشارت احمد نے بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ مجدد اعظم حصہ دوم میں لکھتے ہیں

''2 نومبر 1904ء کو مرزا غلام احمد سیالکوٹ گئے اور سرائے مہاراجہ جموں میں لیکچر دیا۔ (یہ لیکچر سیالکوٹ کے نام سے طبع شدہ ہے اور اس میں انہوں نے سری کرشن ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ مصنف) سٹیج پر مرزا صاحب، مولوی عبدالکریم، بعض احمدی اکابر اور بعض عمائدین رونق افروز تھے جن میں میاں فضل حسین بیرسٹر بھی تھے جو بعد میں سر فضل حسین کے نام سے مشہور ہوئے۔ 1904ء میں وہ سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کا بیان ہے کہ ایک دن میاں فضل حسین صاحب مرحوم حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ میاں صاحب نے مرزا صاحب سے دریافت کیا کہ آپ ان مسلمانوں کو جو آپ کی جماعت میں شامل نہیں کیا کافر سمجھتے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب نے اس کا جواب انکار میں دیا۔ (25)

1905ء میں ڈاکٹر اقبال لندن چلے گئے۔ جولائی 1908ء میں جب واپس آئے تو مرزا

صاحب وفات پا چکے تھے۔ ان کے ذہن پر مرزا صاحب سے اس ملاقات کے نقوش تا دیر قائم رہے شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قادیانیوں کے ساتھ نہ تو بحث مباحثہ کیا اور نہ ہی ان کی کھل کر تکفیر کی۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب خود بانیِ سلسلہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ حقیقی نبوت کے مدعی نہیں ہیں۔ حکیم نورالدین نے 1908ء سے 1914ء تک مسلمانوں سے تعاون بڑھانے کیلئے اسی اعتدال پسندانہ پالیسی کو اختیار کیا۔ علامہ اقبال کا لاہور جماعت کے جلسوں میں جانا اور 1911ء میں جماعت احمدیہ قادیان کوٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ کہنا اس واقعے کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے جیسا کہ ہم آگے بتا رہے ہیں کہ مرزا صاحب نے دراصل مسلمانوں کی تکفیر کے مسئلہ پر اپنے اصل موقف کو عیارانہ رنگ میں چھپایا اس لئے اصل قصو۔ دار مرزا صاحب ہیں اور یہ ان کا منافقانہ طرزِ عمل تھا جس کے باعث علامہ اقبال نے تحریک احمدیت کے خلاف کھل کر کچھ نہ کہا اور اس مغالطے میں مبتلا رہے کہ شاید احمدی مسلمانوں کے فرقوں کی طرح ایک فرقہ ہیں۔ علامہ اقبال نے جو کچھ خود مرزا صاحب سے سنا بعد میں ان کے فرزند یعنی خلیفہ قادیان مرزا محمود احمد نے اس کی تردید کر کے ان کے اصل موقف کو جس واضح انداز سے پیش کیا، اس سے تحریک قادیانیت کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ درحقیقت 1904ء میں بھی مرزا صاحب کا موقف ان عام مسلمانوں کی تکفیر تھا جو ان کے دعووں پر ایمان نہ لائیں۔

اپنے نہ ماننے والوں کو کافر قرار نہ دینے کے متعلق جو بات مرزا صاحب نے 1904ء میں کہی تھی وہ درست نہ تھی۔ 1915 میں قادیانی جماعت نے بہت سا لٹریچر شائع کر کے اس مسئلہ کو واضح کر دیا۔ مولوی محمد علی، ڈاکٹر بشارت احمد وغیرہ نے مرزا محمود احمد اور ان کے بھائی مرزا بشیر احمد ایم اے کی تصانیف (26) ضرور دیکھی ہوں گی۔ ان کو جانے دیں اس کے چار سال بعد 1908ء میں مسلمانوں کی تکفیر کے بارے میں خود مرزا صاحب نے جو کہا وہ بھی اصل حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اپریل 1908ء میں مرزا صاحب اپنی اہلیہ محترمہ کے علاج کے لئے لاہور میں موجود تھے۔ سر

فضل حسین اس وقت لاہور میں وکالت کرتے تھے انہوں نے ان سے یہی سوال پھر پوچھا کہ اگر تمام غیر احمدیوں کو کافر کہا جائے تو اسلام میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا تو مرزا صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ جب تک یہ لوگ ایک اشتہار نہ دیں کہ ہم سلسلہ احمدیہ کے لوگوں کو مومن کہتے ہیں بلکہ ان کو کافر کہنے والوں کو کافر سمجھتے ہیں تو اس وقت تک وہ انہیں کافر ہی کہیں گے۔ مرزا صاحب کا پورا جواب اخبار ''بدر'' 24 مئی 1908ء میں چھپا۔ اس کا عکس اس باب میں دیا جاتا ہے۔ سر فضل حسین کے ساتھ ایک اور بار ایٹ لاء بھی اسی ملاقات میں موجود تھے جن کا نام پرچے میں درج نہیں لیکن یہ علامہ اقبال نہ تھے وہ اس زمانہ میں یورپ میں تھے۔

کیا حضرت مرزا صاحب اپنے دعوے کا انکار کرنیوالوں کو کافر کہتے تھے

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شہادت

اسوقت جبکہ عام طور پر یہ پروپاگنڈا کیا جارہا ہے کہ حضرت مرزا صاحب نے اپنے دعوے کا انکار کرنے والوں کو کافر کہا ہے اوراس کے بالمقابل آپ کی اپنی شائع شدہ تحریر کی بھی پروا نہیں کی جاتی جس میں آپ نے یہ لکھا ہے:۔

"ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعوے کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجال نہیں ہو سکتا۔" (تریاق القلوب صفحہ ۱۳۰ مطبوعہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۲ء)

میں اپنے مسلمان بھائیوں کے سامنے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شہادت پیش کرتا ہوں جو انہوں نے گذشتہ موسم سرما میں جب میں ان کی عیادت کے لئے گیا خود میرے سامنے بیان کی اور فرمایا کہ:۔

ایک دفعہ جناب مرزا صاحب سیالکوٹ گئے ان ایام میں میاں (سر) فضل حسین وہیں کام کرتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کہیں جارہے تھے تو اتفاق سے رستے میں میاں صاحب سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کدھر جارہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ میں مرزا صاحب کی طرف جارہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ جب ہم آپ کے پاس پہنچے تو اثنائے گفتگو میں میاں صاحب نے جناب مرزا صاحب سے یہ سوال کیا کہ کیا آپ اپنے منکر کو کافر کہتے ہیں تو آپ نے صاف لفظوں میں جواب دیا کہ:۔

"میں اپنے منکر کو کافر نہیں کہتا"

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جناب مرزا صاحب کے یہ الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے یہ بھی فرمایا کہ البتہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعہ کس سال کا ہے لیکن اتنا یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ میاں فضل حسین ان دنوں میں وہاں پریکٹس کرتے تھے سو اس کے متعلق صرف اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے سیالکوٹ تشریف لے جانے کا واقعہ سنہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ خدا ترس مسلمان اس کے بعد کم سے کم اس بات کو حضرت مرزا صاحب کی طرف منسوب نہ کریں گے کہ آپ اپنے دعوے کے انکار کرنے والوں کو کافر کہتے تھے۔

خاکسار:۔ محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور (۲۰ اگست سنہ ۱۹۳۵ء)

کیپٹل لیتھو پرنٹنگ پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور میں باہتمام چودھری محمد اکرم پرنٹر چھپا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تعلیم نسواں

[illegible]

اے کہ بعد از تو نبوّت شد بہر مفہوم شرک

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ کے متروکہ کلام کو بعض دانشوروں نے کوہ کنی و کاہ برآوردن کے مصداق اکٹھا کر کے شائع کیا۔ الف شیدایانِ زر نے ان مجموعوں میں وہ اشعار بہ التزام شریک کئے جو پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء میں انگریزی فتوحات سے متعلق علامہ اقبال کے قلم سے استعمار کے خاندانی جگر گوشوں نے کہلوائے تھے۔ استبداد کا زمانہ تھا اور وہ اشعار محض ابیات کا چربہ تھے علامہ نے اگلا اور ٹھکرا دیا۔ لیکن کسی مرتب کے نظر سے علامہ اقبال کی نظمِ ذیل نہ گذری کہ مجموعہ میں شریک کرتا یا پھر یہ نظم قادیانی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بہر حال مندرجہ تحت اشعار انجمن حمایتِ اسلام کی روئیداد (۱۹۰۲ء) کے صفحہ ۷۱ سے منقول ہیں —— شورش کاشمیری



اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای | سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای

اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو | خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہ ای

اے کہ بعد از تو نبوّت شد بہر مفہوم شرک | بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علمِ تو | اُمّیئے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای

فیضِ تو دشتِ عرب را مطلعِ انظار ساخت | خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ ای

دل نہ نالد در فراقِ ما سوائے نورِ تو
خشک چوبے را ز ہجرِ خویش گریاں کردہ ای

باب2:

حوالے وحواشی

(1) مرزا غلام احمد ازالہ اوہام 1891ء ص532، آئینہ کمالات اسلام 1893

(2) ایضاً نیز مجموعہ اشتہارات جلد چہارم ص333 اور جلد سوم ص223 لاہور جماعت کے احمدی میر مدثر گیلانی نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ کتاب تطہیر الاولیا شائع کی۔

(3) ڈاکٹر صدیق جاوید، اقبال نئی تفہیم ص755-772

(4) بشیر احمد ڈار اقبال اور احمدیت ص14

(5) ڈاکٹر صدیق جاوید نے اقبال نئی تفہیم ص755 تا 772 میں اس مضمون کی تاریخ اشاعت پر بحث کی ہے اور بتایا کہ کس طرح کئی سال تک یہ مضمون ماہرین اقبالیات کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ 1900ء کے بعد پہلی بار پاکستان میں اسے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے 21 اپریل 1960ء کو علامہ اقبال کے یوم وفات پر شائع کیا۔ راقم کی تحقیق کے مطابق یہ مضمون اس سے قبل یکم جون 1959ء کو لاہور جماعت کے پندرہ روزہ جریدے لائٹ لاہور نے شائع کیا۔ اس میں ایک نوٹ دیا گیا ہے کہ اقبال کا یہ علمی مضمون برٹش میوزیم لائبریری کے آرکائیو سے حاصل کیا گیا ہے۔ لائٹ کے فارن ایڈیٹر محمد یعقوب خان تھے جو بعد میں قادیانی جماعت سے جا ملے اور اس کے لوکل ایڈیٹر مرزا معصوم بیگ تھے۔ اس سے قبل شاید یہ مضمون ووکنگ مشن کے رسالے اسلامک ریویو میں شائع ہوا جہاں سے لائٹ نے نقل کیا۔

(6) قاضی جاوید، سرسید سے اقبال تک ص240-267 ماخوذ محمد اقبال، اسرار خودی اور تصوف، اخبار وکیل امرتسر 15 جنوری 1916ء، عبدالواحد معینی، مقالات اقبال ص161

(7) مضمون کے مکمل متن کے لئے دیکھیں Discourses of Iqbal,Comp+edited by Shahid Hussain Razzaqi, Lahore, 1970 اس مضمون کے علامہ اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے سے تقابل کے لئے دیکھیں مقالہ کا اردو ترجمہ فلسفہ عجم از میر حسن الدین بی۔اے ایل ایل بی جونفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا۔ نیز علامہ کے مقالے پر پاکستان ٹائمز لاہور کے 20 اکتوبر 1967ء کے شمارے میں رفعت حسین کا عمدہ مضمون شائع ہوا۔

(8) ہیگل کے فلسفہ پر علامہ اقبال اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں'' لامحدود کا محدود بن جانا اور خود تشکیل کردہ اختلافات کی ترکیب سے گزر کر خود کو دوبارہ پالینا چنانچہ کائنات کی زندگی لازم متضاد قوتوں کے مسلسل تصادم

سے عبارت ہے۔'' لسان العصر اکبرالہ بادی کے کلام میں ہیگلی فلسفے کی چاشنی۔اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات، مترجم اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، 1999 ص:183

(9) عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق ابتدا میں کلام تھا کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں (انجیل یوحنا1:2)

(10) عبدالکریم جیلی ابن عربی کی طرح وحدت الوجود کے قائل تھے وہ کائنات کو خدا سے الگ اور خدا کو کائنات سے الگ قرار نہیں دیتے تھے یہ یونانی فلسفی فلونطیوس Philontus کا پیش رو یہودی فلسفی Philo تھا جس نے لوگوس Logos کلمہ یا آفاقی ذہن کو خدا اور کائنات کے درمیان ضروری واسطہ قرار دیا جو کائنات کی تکوین اور نوع انسان کی تخلیق کا باعث ہوا یہی تصور بعد میں عیسائی الٰہیات میں کلمہ اور ابن عربی کے افکار میں حقیقت محمدیہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ابن عربی نے حقیقت محمدیہ کی صورت میں لوگوس کا تصور پیش کیا جو الجیلی کے انسان کامل میں موجود ہے یہ حقیقت محمدیہ جناب رسالت مآبﷺ کی شخصیت نہیں بلکہ یزدانی قوت ہے جو تکوین عالم اور تخلیق آدم کا باعث بنی نیز ملاحظہ ہو

The Hegelian key to understanding Iqbal by Israr Ahmad Iqbal Review Lahore, 1980.

(11) انڈین اینٹی کیوری، بمبئی، ستمبر 1900، مرزا غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، ضرورۃ الامام1896

(12) ایضاً قادیانی نقطۂ نظر کے مطابق کئی صوفیا نے فنافی الرسول کا درجہ پایا بروز یا نبوت محمدی کا انعکاس صرف مرزا صاحب کی ذات میں ہوا۔

(13) نسیم دعوت 81-82

(14) مرزائیل، حوالہ سابق ص:97

(15) مرزا غلام احمد۔ایک غلطی کا ازالہ، ص4,3

(16) دیگر اشعار اس باب میں درج ہیں

(17) غلام رسول مہر، سرود رفتہ ص30

(18) ظفراللہ خان، تحدیث نعمت، لاہور، ص:123

(19) میر حامد سیالکوٹی۔ القول الفصل، مولوی محمد حسین بٹالوی کے ریویو پر ریویو، پنجاب پریس سیالکوٹ 1892 ص3

(20) الحکم قادیان 17 جنوری 1903ء بحوالہ عبدالماجد اقبال اور احمدیت ص58

(21) ایضاً، ڈاکٹر گیان چند، ابتدائی کلام اقبال، ص: 163

(22) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، اقبال کی ابتدائی زندگی اقبال اکادمی پاکستان ص254

(23) مظلوم اقبال، ص: 191

(24) Molvi Muhammad Ali, Sir Mohammad Iqbal's Statement regarding Qadianis, Ahmadiyya Anjuman, Lahore, 1935 p.6,7

(25) مجدد اعظم جلد دوم دسمبر 1940ء ص990

(26) مرزا بشیر احمد، مسئلہ کفر و اسلام، مسئلہ جنازہ، وغیرہ

مرزا محمود احمد، القول الفصل 1915، حقیقۃ النبوۃ 1915، حقیقۃ الامر 1918 وغیرہ

باب 3

علامہ اقبال پر انگریز نوازی کا الزام

قادیانی علامہ اقبال پر انگریزی حکومت کی مدح وتوصیف میں نظمیں لکھنے اور انگریز سے سیاسی تعاون کرنے کے الزامات لگاتے ہیں۔ یہ الزامات سرکاری سطح پر نہیں لگائے جاتے یعنی قادیان، ربوہ، یا لاہور جماعت نے علامہ اقبال کو اس حوالے سے مطعون نہیں کیا کیونکہ ان کو اپنے گھر کے حالات کا مکمل علم تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ الزامات اپنے کارندوں (1) یا سیکولر اور سوشلسٹ عناصر کے ذریعے لگائے۔ شیخ عبدالماجد نے علامہ اقبال کے خلاف جو دو کتابیں لکھی ہیں انہیں انہوں نے ذاتی حیثیت سے شائع کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔(2) اس طرح انہوں نے اپنی جماعت کو انگریز پرستی کی بحث سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ آیئے ان الزامات کا جائزہ لیں۔

1۔ علامہ اقبال نے ایسی نظمیں اس عہد کے حالات، سیاسی تقاضوں اور بعض انگریز نواز احباب کے ایماء پر لکھیں۔ یہ ان کے سیاسی فکر کے ارتقاء کا ایک حصہ تھیں۔ بعد میں انہوں نے ان کو مسترد کرتے ہوئے اپنے مجموعہ کلام میں جگہ نہ دی۔ شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں۔

''علامہ اقبال نوراللہ مرقدہ کے متروکہ کلام کو بعض دانشوروں نے کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق اکٹھا کر کے شائع کیا۔ ان شیدایان اقبال نے ان مجموعوں میں وہ اشعار بہ التزام شریک کئے جو پہلی جنگ عظیم 18-1914ء میں انگریزی فتوحات سے متعلق علامہ اقبال کے قلم سے استعمار کے خاندانی جگر گوشوں نے کہلوائے تھے۔ استبداد کا زمانہ تھا اور وہ اشعار محض ابیات کا چربہ تھے۔ علامہ نے اگلا اور ٹھکرا دیا''۔(3) ان کے اصل سیاسی افکار ان کے بعد کے کلام اور بیانات سے عیاں ہیں اور وہی ان کے حقیقی افکار ہیں اس لئے ان کی ابتدائی نظموں کو ان کے خلاف تنقید کے لئے جواز بنانا غیر ضروری ہے اور بد دیانتی پر مبنی ہے۔ اگر وہ ہمیشہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے تو واقعی قابل اعتراض بات تھی۔

2۔ پنجاب کے اکثر سیاسی رہنما، جاگیردار اور زمیندار انگریز سے تعاون کر کے ان سے مالی مراعات حاصل کرتے تھے لیکن علامہ اقبال نے ایسا کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور فقیری میں نام پیدا کیا۔ اس عہد کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو سامنے رکھ کر خلوص نیت سے انہوں نے ایک راہ متعین کی۔ اس میں انکے پیش نظر کسی کی خوشنودی یا مخالفت نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی معاشی و سیاسی فلاح تھی۔ وہ انگریز اور ہندوؤں کی سیاسی چالوں کا توڑ اسی میں سمجھتے تھے۔ آج ہم ان سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی سوچ کو غیر دیانتدارانہ نہیں کہہ سکتے۔

ہم نے آئندہ صفحات میں علامہ اقبال کے سیاسی افکار اور ان کی نام نہاد انگریز نوازی کا قادیانیوں کی سیاسی پالیسی اور سامراج نوازی سے تقابل کر کے ان کے درمیان فرق بتایا ہے کیونکہ قادیانیوں کا انگریز سے ایک خصوصی تعلق رہا ہے جو ان کی مذہبی اور سیاسی روش کا ایک مستقل حصہ تھا۔

ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر علامہ اقبال کی نظم 1901ء

قادیانی علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی بعض نظموں کو جنہیں انہوں نے بعد میں درخور اعتناء نہ سمجھا اور اپنے مجموعہ کلام میں جگہ نہ دی ان کی انگریز نوازی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ان میں سب سے پہلے 1901 کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک نظم ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی وفات (22 جنوری، 1901ء) کے موقع پر لکھی یہ 110 اشعار پر مشتمل ایک ترکیب بند ہے جس کا عنوان اشک خون ہے۔ علامہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ Tears of Blood کے عنوان سے بھی کیا۔ حکومت نے اس کی کاپیاں طبع کرا کے تقسیم کرائیں۔ (4) قادیانی علامہ اقبال کی اس نظم کو بنیاد بنا کر انہیں انگریز نواز ہونے کا الزام دیتے ہیں۔ مناسب تھا کہ وہ پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کی ان پچاس الماریوں پر نظر ڈالتے جو مرزا صاحب نے انگریز کی تعریف و توصیف اور برطانوی استعمار کی مدح و ستائش، جہاد کو حرام قرار دینے اور مسلمانوں کو برطانوی غلامی کا خوگر بنانے کے لئے تیار کیں۔ اس الماری سے دو کتب تحفہ قیصرہ اور ستارہ قیصریہ پیش کی جاتی ہیں۔

تحفہ قیصرہ 25 مئی 1897ء کو ملکہ وکٹوریہ کے دور اقتدار کی 60 سالہ جوبلی کے موقع پر تصنیف کی گئی اور اس کی کاپیاں پنجاب کے گورنر، وائسرائے ہند اور دیگر اعلیٰ حکام کو روانہ کی گئیں تاکہ برطانوی حکومت قادیان کے مغل خاندان اور مرزا صاحب کی مذہب کے پردے میں کی گئی سیاسی خدمات جلیلہ کو اچھی طرح جان سکے۔ اس کی ایک کاپی ملکہ وکٹوریہ کو بھجوائی گئی۔ اس رسالے میں کہا گیا' خدا کی جناب میں ہم دعا کرتے ہیں وہ ہماری ملکہ معظّمہ قیصرہ کو جو اپنی رعایا کی مختلف اقوام کو کنار عاطفت میں لئے ہوئے ہے جس کے ایک وجود سے کروڑہا انسانوں کو آرام پہنچ رہا ہے تادیر گاہ، سلامت رکھے اور ایسا ہو کہ یہ جلسہ جوبلی کی تقریب پر (جس کی خوشی سے کروڑہا دل برٹش انڈیا اور انگلستان کے جوش نشاط میں ان پھولوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں جو نسیم صبا کی ٹھنڈی ہوا سے شگفتہ ہو کر پرندوں کی طرح اپنے پروں کو ہلاتے ہیں) جس زور شور سے زمین مبارک بادی کے لئے اچھل رہی ہے ایسا ہی آسمان بھی اپنے آفتاب و ماہتاب اور تمام ستاروں کے ساتھ مبارک بادیاں دیوے۔'(5)

اس رسالے میں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

''اے قیصرہ و ملکہ معظّمہ ہمارے دل تیرے لئے دعا کرتے ہوئے جناب الٰہی میں جھکتے ہیں اور ہماری روحیں تیرے اقبال اور سلامتی کے لئے حضرت احدیت میں سجدہ کرتی ہیں۔ اے اقبال مند اور قیصرہ ہند اس جوبلی کی تقریب پر ہم اپنے دل و جان سے تجھے مبارک باد دیتے ہیں اور خدا سے چاہتے ہیں کہ خدا تجھے ان نیکیوں کی بہت بہت جزا دے جو تجھ سے اور تیری بابرکت سلطنت سے اور تیرے امن پسند حکام سے ہمیں پہنچی ہیں۔ ہم تیرے وجود کو اس ملک کے لئے خدا کا ایک بڑا فضل سمجھتے ہیں اور ہم ان الفاظ کے نہ ملنے سے شرمندہ ہیں جن سے ہم اس شکر کو پورے طور پر ادا کر سکتے۔ ہر ایک دعا جو ایک سچا شکر گزار تیرے لئے کر سکتا ہے ہماری طرف سے تیرے حق میں قبول ہو۔ خدا تیری آنکھوں کو مرادوں کے ساتھ ٹھنڈی رکھے اور تیری عمر اور صحت اور سلامتی میں زیادہ سے زیادہ برکت دے اور تیرے اقبال کا سلسلہ ترقیات جاری رکھے اور تیری ذریت کو تیری

طرح اقبال کے دن دکھاوے اور فتح وظفر عطا کرتا رہے"۔(6)

ملکہ وکٹوریہ کی شصت (ساٹھ) سالہ (ڈائمنڈ) جوبلی کے موقع پر قادیان میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ ایک الگ جلسہ احباب بر تقریب جشن جوبلی بغرض دعا شکر گزاری جناب ملکہ معظّمہ قیصرہ دام ظلہا ہوا جس میں چھ زبانوں ۔عربی، فارسی، اردو، انگریزی، پنجابی، پشتو میں دعا اور شکر گزاری کی تقریریں ہوئیں جس پر لوگوں نے بڑی خوشی سے آمین کے نعرے مارے۔ ان جلسوں میں اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ اس گورنمنٹ کی پناہ اللہ کی پناہ ہے۔(7)

اس رسالہ کے جواب میں ملکہ معظّمہ کی طرف سے اظہار خوشنودی کا کوئی خط نہ پا کر 24 اگست 1899ء کو مرزا صاحب نے ستارہ قیصریہ کے نام سے ایک اور رسالہ تحریر کیا جس میں قیصرہ ہند کے عدل عام، رعایا پروری اور داد گستری کی تعریف کی اور کہا کہ انہیں تعجب ہے کہ ایک حکم شاہانہ سے بھی ممنون نہیں کیا گیا۔ اس بات پر افسوس کے بعد انہوں نے دوبارہ اپنے خاندان کی برطانوی حکومت کے لئے خدمات جلیلہ کا ذکر اور اپنی وفاداریوں کا تذکرہ کیا جو اس محسن گورنمنٹ کے لئے کی جا رہی تھیں جس کی نظیر برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان نہیں دکھا سکا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اے قیصرہ مبارک خدا تجھے سلامت رکھے اور تیری عمر اور اقبال اور کامرانی سے ہمارے دلوں کو خوشی پہنچاوے اس وقت تیرے عہد سلطنت میں جو نیک نیتی کے نور سے بھرا ہوا ہے مسیح موعود کا آنا خدا کی طرف سے یہ گواہی ہے کہ تمام سلاطین میں تیرا وجود امن پسندی اور حسن انتظام اور ہمدردی رعایا اور عدل اور داد گستری میں بڑھ کر ہے۔

سوا ے ہماری پیاری قیصرہ ہند خدا تجھے دیر گاہ تک سلامت رکھے۔ تیری نیک نیتی اور رعایا کی سچی ہمدردی اس قیصر روم (جو مسیح کے وقت تھا) سے کم نہیں ہے۔

اے بابرکت قیصرہ ہند تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں جس پر تیری نگاہیں ہیں۔ خدائی رحمت کا ہاتھ اس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے۔"(8)

یہ رسالہ ایسی دعاؤں، التجاؤں اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح وستائش اور انگریزی راج کی تعریف وتوصیف

سے پُر ہے جس کے سامنے اقبال کا مرثیہ ہیچ دکھائی دیتا ہے۔ علامہ کا مرثیہ شاعری تھا یہ ایک نبی کے دل کی آواز اوراس کے ضمیر کا عکاس ہے۔ وہ محض لفاظی اور شاعرانہ طرز کی مدح سرائی ہے لیکن یہ مرزا صاحب کے تاج برطانیہ کے لئے دل و جان سے نچھاور ہونے کا مرقع ہے۔ ان کے خلوص اوران کی انگریز کے لئے شکرگزاری کا پرتو ہے جواس وقت تک لوح عصر پر جگمگاتا رہے گا جب تک احمدیت باقی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس کلام کو خود مسترد کر دیا اور اپنے مجموعہ کلام میں اس کو کوئی جگہ نہ دی لیکن مرزا صاحب کی خدا کی وحی کی تائید سے لکھی گئی تحریریں آج تک چھپ رہی ہیں، ان کا نام روحانی خزائن رکھا گیا ہے۔ ان میں تبدیلی ممکن نہیں اور نہ ہی ان کو منسوخ سمجھا جا سکتا ہے۔ قادیانی ان کو اصل حالت میں برقرار رکھنے پر اتنے مصر ہیں کہ کسی کتاب میں درج غلط قرآنی آیات کی بھی تصحیح نہیں کرتے جن سے مرزا صاحب کی علمیت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے نیچے محض ایک فٹ نوٹ دے کر کاتب پر تمام الزام ڈال دیتے ہیں لیکن اس کا جواب نہیں دیتے کہ آیات نقل کرنے میں کاتب غلطی کرسکتا ہے لیکن ترجمہ کیوں کر غلط کیا گیا۔

ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر مرزا صاحب نے حکومت برطانیہ کو ایک تار دیا جس میں اپنی اور اپنے پیروکاروں کی طرف سے اس نقصان پر نہایت صدمہ اور دکھ کا اظہار کیا گیا جو ملکہ معظّمہ قیصرہ ہند کی وفات کے نتیجے میں حکومت برطانیہ کو ہوا۔(9)

علامہ اقبال کی دیگر نظمیں اور تقاریر

قادیانی انگریزی حکومت سے علامہ اقبال کے نام نہاد تعاون کے سلسلے میں ان کی 1902ء سے 1911ء تک کی مندرجہ ذیل نظمیں اور ایک تحریر پیش کرتے ہیں۔

1۔ 1902ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال نے ایک نظم میں انگریز حکمرانوں کو قصر عدل کا معمار کہا۔ انہوں نے یہ نظم بعنوان خیر مقدم انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ 23-21 فروری 1902ء لیفٹیننٹ گورنر پنجاب میکورتھ ینگ کی موجودگی میں پڑھی۔

2۔ 1910ء میں پنجاب کے ایک شاعر رحمت علی نے انگریز کی تعریف پر مشتمل اپنا مجموعہ کلام وفائے رحمت شائع کیا اس کے علمی وادبی معاونین میں علامہ اقبال کا نام ٹائٹل پیج پر موجود ہے اوران کی علمی وادبی معاونت پر ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

3۔ برطانوی شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے سلسلے میں یکم اپریل 1911 کو یونیورسٹی ہال لاہور میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی طرف سے 48اراکین نے وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ کوایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اقبال پنجاب مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے وہ اس وفد میں شامل تھے۔

4۔ جشن تاجپوشی کے سلسلے میں 22 جون 1911ء کوشاہی قلعہ لاہور میں ایک جلسہ ہوا جس میں علامہ اقبال نے ایک تقریر کی۔ انہوں نے کہا مسلمان ہندوستان میں باقی ممالک کے مقابلے میں امن وامان کی زندگی بسر کر رہے ہیں صرف مراعات حاصل کرنے کے لئے سرکار کے وفادار نہیں بلکہ وہ مذہباً بادشاہ وقت کے وفادار ہیں۔ مسلمانوں کا آئیڈیل سلطنت نہیں بلکہ اپنے دین کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے اورحکومت انگریزی میں اس کی اجازت ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے افریقہ کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک انگریز افسر نے وہاں کے باشندوں کومہذب بنانے کے لئے ان میں اسلامی واعظ بھیجنے کی ہدایت کی۔(10)

قادیانی، سیکولرسٹ اور ایک زمانے میں کمیونسٹ ان نظموں کو اقبال کی انگریز نوازی پر محمول کرتے تھے۔ دراصل اقبال انگریز سے براہ راست تصادم کومسلمانوں کے مجموعی مفاد اوران کی سیاسی اور معاشی ترقی کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز سے تعاون کی پالیسی سے وہ ہندوؤں کی سیاسی چالوں اوران کی اقتصادی برتری کا مقابلہ کرسکیں گے اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرسکیں گے۔ شروع میں ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کانگرس اور مسلم لیگ کی پالیسی بھی انگریزی حکومت سے تعاون اور سیاسی حقوق ومراعات کے حصول پر مبنی تھی۔ علامہ اقبال ابھی تک باقاعدہ سیاست میں نہ آئے تھے انہوں نے اس عہد کے تقاضوں کوملحوظ خاطر رکھ کر مصلحتاً، مجبوراً اور اخلاقاً ایسے اشعار کہے جو ان کے سیاسی فکر کے ارتقاء کی نشاندہی کرتے تھے بعد

میں ان کے خیالات ونظریات بدل گئے۔ ہمارے نزدیک وہی ان کی سوچ کے اصل عکاس اور ان کا سرمایہ حیات ہیں اور ان ہی کو اہمیت حاصل ہے۔

ہم اب انگریز سے جماعت احمدیہ کے تعاون اور اس کی اطاعت کی سیاسی پالیسی اور علامہ اقبال کی ان اکادکا نظموں کا موازنہ پیش کرتے ہیں جن میں علامہ نے انگریز کے عدل و انصاف اور قیامِ امن کا ذکر کیا ہے۔

1۔ تحریک احمدیت ایک سیاسی تحریک تھی جس نے مذہبی ارتداد کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اس کا مقصد برطانیہ کے سیاسی عزائم کی ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر تکمیل و ترویج تھا خصوصاً مسلمانوں کی اس وقت کی عظیم سلطنت ترکی اس کا نشانہ تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے سامنے اسلامیان ہند کی کسی قسم کی آزادی کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس کا ذکر یا مطالبہ کیا اور نہ اس کے لئے کوئی جدوجہد کی اور نہ ہی وہ ایسی جدوجہد کو پسند کرتے تھے۔ وہ برطانوی حکومت کو خدا کے حکم کے تحت نعمت خداوندی قرار دیتے تھے اور اس کے سایہ تلے ابدالآباد تک رہنا چاہتے تھے۔ وہ مسلم لیگ اور کانگرس کے مخالف تھے۔(11)

2۔ مسلمان اکابر جنہوں نے انگریز سے تعاون کا درس دیا یہ ان کی ذاتی سوچ اور اس وقت کے سیاسی حالات کا پرتو تھا جس کو غلط قرار دینے کا ہمیں حق حاصل ہے اور ان کی اس روش پر ہم تنقید کر سکتے ہیں، لیکن مرزا صاحب نے وحی خداوندی کی رو سے برطانوی سامراج کے ہندوستان میں غلبہ و تسلط کو جائز قرار دیا اور خدا کے حکم کے تحت برطانوی حکومت کی اطاعت کا درس دیا۔ اسی میں ان کی تحریک کی بقا مضمر تھی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انگریز کے تسلط کو الٰہی تقدیر اور مشیت ایزدی قرار دیتے تھے۔

3۔ مرزا صاحب کی جانب سے جہاد کی تنسیخ ایک ایسا امتیازی وصف ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی سیاسی رہنما یا جماعت میں نہیں مل سکتی اس کا خود مرزا صاحب نے اقرار کیا ہے۔ (12) انہوں نے جہاد کو جس کا ایک پہلو برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد تھا مکمل حرام

قرار دیا اور اپنی وحی کی رو سے اس کی تنسیخ کی۔ اگر یہ مانا جائے کہ ہندوستان میں کسی نوع کے دینی جواز کے تحت جہاد منع تھا تو دنیا کے اسلامی ممالک میں جہاں یورپی سامراج مسلمانوں کی آزادی پر ڈاکہ ڈال رہا تھا اور مسلمانوں کی واحد سلطنت عثمانیہ کو تاخت و تاراج کر رہا تھا وہاں جہاد کی ممانعت اور انگریز کی اطاعت اور وفاداری کے درس پر مبنی منوں لٹریچر تقسیم کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

4۔ مرزا صاحب نے ہندوستان کی غلامی اور اسلامی ممالک کی تباہی کو اپنی نبوت اور صداقت کی دلیل بتایا اور دنیا کے مختلف حصوں (جن میں دور دراز افریقہ شامل تھا) میں برطانوی حکمرانی اور تسلط کو اپنی ذات 'بابرکات' اور دعاؤں کا ثمرہ قرار دیا اور اپنے آپ کو سلطنت برطانیہ کی ترقی و سلامتی کا تعویذ قرار دیا اور کہا جس طرف ان کا منہ ہوتا ہے ادھر ہی برطانیہ کو فتوحات حاصل ہوتی ہیں۔(13)

5۔ 1880ء سے 1908ء تک کے 28 سالوں میں مرزا صاحب نے 80 کے قریب کتابیں لکھیں اور اپنی وحی، الہامات، کشوف ورویاء کے انبار لگا دیئے۔ حیرت ہے کہ ان کو کوئی الہام انگریز کی حاکمیت اور ان کے سیاسی تسلط کے خلاف نہ ہوا۔(14) اس سے مرزا صاحب کے دعاوی کی غرض و غایت اور تحریک احمدیت کا سیاسی مزاج عیاں ہو جاتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے انگریز کے سیاسی اقتدار کی بقا کے لئے وحی کی سند مہیا کی۔

قادیانی ایڈریس

جہاں تک قادیانیوں کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ یکم اپریل 1911ء کو پنجاب پروونشل مسلم لیگ کے جن 148 اراکین نے وائسرائے لارڈ ہارنگ کی آمد پر ایک سپاسنامہ پیش کیا علامہ اقبال ان میں شامل تھے تو عرض ہے کہ وہ 1910ء سے صوبائی مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری چلے آ رہے تھے۔(15) اگر شیخ عبدالماجد پسند فرمائیں تو ہم پنجاب کے لیفٹنٹ گورنروں اور وائسیران ہند کے حضور مقتدر قادیانی حضرات کے ایڈریسوں کا متن پیش کر دیں جن میں جماعت

احمدیہ کے تعارف کے علاوہ برطانوی اقتدار کے استحکام میں قادیانیوں کی خدمات کا ذکر ہے۔ یہ ان عرضداشتوں کے علاوہ مواد ہے جو مرزا صاحب اپنے زمانے میں انگریز حکام کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔

علامہ اقبال کی نظم 'پنجاب کا جواب'

جنگ عظیم اول 1914ء تا 1918ء کے آخری سال میں علامہ اقبال نے یونیورسٹی ہال لاہور کے ایک سرکاری مشاعرہ میں 9 بند پر مشتمل ایک مسدس پڑھی جو ''باقیات اقبال'' میں 'پنجاب کا جواب' کے نام سے درج ہے۔ یہ مسدس نواب ذوالفقار علی خان کی وساطت سے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر کی فرمائش پر لکھی گئی۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ 1918ء میں اڈوائر نے اقبال سے خاص نظم لکھنے اور مشاعرے میں آنے کی فرمائش کی تھی تو زمانہ (جنگ عظیم اول) ایسا نازک تھا اور اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہ تھی لہٰذا اقبال نے یہ نظم لکھی اور خود مشاعرے میں جا کر پڑھی اور 11 مئی 1918ء کے اخبار وکیل امرتسر میں شائع ہوئی۔ (17)

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ انگریز کے پشتینی وفاداروں نے علامہ اقبال کے خلوص، ان کی دوستی اور مروت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر یہ نظمیں حاصل کیں۔ اس بات کو قادیانی اچھالتے ہیں جو جنگ عظیم اول کے دوران برطانوی حکومت کے زبردست حامی تھے، جنگی فنڈ میں رقومات جمع کر کے بھجواتے تھے، بھرتی دیتے تھے، جلسے کرتے تھے، دن رات اتحادی افواج کی فتح کے لئے دعائیں کرتے تھے اور یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ جن اسلامی و غیر اسلامی ممالک میں برطانوی راج قائم ہوگا وہاں احمدیت کی تبلیغ کے دروازے کھل جائیں گے۔ زمانہ جنگ میں انہوں نے ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر انگریز کی جاسوسی کا فریضہ انجام دیا اور سقوط بغداد، فلسطین وغیرہ پر جشن منائے۔ (18)

علامہ اقبال کو سر کا خطاب 1923ء

یکم جنوری 1923ء کو علامہ اقبال کو اردو اور فارسی کے عظیم شاعر ہونے اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت نے سر کا خطاب دیا۔ ان کی کتاب ''اسرار خودی'' پر امریکہ اور یورپ میں کئی ریویو شائع ہو چکے تھے اور ان کو عالمی سطح پر شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ علامہ کو ایسے خطابوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ایسے خطابات انگریز حکومت کی تابعداری کے سلسلے میں کئی مسلمانوں نے حاصل کئے لیکن کسی نے کوئی تنقید نہ کی۔ اقبال کو علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے جب سر کا خطاب ملا تو مولانا ظفر علی خان اور عبدالمجید سالک جیسے صحافیوں نے مخالفانہ نظمیں لکھیں۔(19) میر سید غلام بھیک نیرنگ ؒنے علامہ اقبال کو ایک خط لکھا کہ اس خطاب کے بعد شاید اب آپ آزادی اظہار سے کام نہ لے سکیں۔ جس کے جواب میں علامہ اقبال نے 4 جنوری 1923 کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

''میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے ''فروتر'' ہیں سینکڑوں خطوط اور تار آئے اور آرہے ہیں مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا سو قسم خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان بالغیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی انشاء اللہ......اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے''۔(20)

شیخ عبدالماجد علامہ اقبال کو سر کا خطاب ملنے کو انگریز کی خدمات کا صلہ بتاتے ہیں حالانکہ یہ بات غلط ہے لیکن سر ظفر اللہ کو جو سر کا خطاب ملا اور جو ان کی زبردست برطانیہ نوازی، سرکار کے لئے خدمات اور سر فضل حسین کے سیاسی گماشتے کے طور پر ہندوستان اور لندن میں دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ برطانوی سامراج کے نفس ناطقہ سر ظفر اللہ کو سر کا خطاب مئی 1935ء میں ملا تو قادیان میں فتح کے شادیانے بجائے گئے اور اسے حکومت برطانیہ کی طرف

سے جماعت احمدیہ کی قدر افزائی اور ان کی خدمات جلیلہ کا ثمرہ قرار دیا گیا۔ الفضل ''جماعت احمدیہ کا پہلا سر'' کے عنوان سے لکھتا ہے کہ حکومت نے چوہدری ظفر اللہ خان کو نائٹ ہڈ کا خطاب دیا ہے۔ ملک معظم کے یوم ولادت اور سلور جوبلی کی تقریب پر جو خطابات دیئے گئے ان میں نائٹ ہڈ کا خطاب پنجاب سے تعلق رکھنے والے دو معززین کو دیا گیا ایک چوہدری ظفر اللہ خان صاحب ہیں اور دوسرے مسٹر جسٹس ایڈیسن جج ہائی کورٹ لاہور۔ آپ (ظفر اللہ خان) پہلے احمدی ہیں جنہیں خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ (21)

کیا ظفر اللہ کو سر کا خطاب برطانیہ سے بھرپور تعاون اور ان کی پالیسیوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی انتھک جدوجہد کے نتیجے میں نہیں ملا؟ کیا وہ کوئی علمی ادبی شخصیت کے مالک تھے جو اس کے حقدار قرار پائے؟ کیا 1935ء میں ان کی کوئی لافانی تصنیف موجود تھی جسے بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہو؟ کیا انہوں نے کوئی گیتا انجلی تصنیف کی؟ آخر وہ کیا خدمات جلیلہ ہیں جن کا انہیں یہ صلہ انگریز کی طرف سے دیا گیا۔ ان کو سر کا خطاب ملنے پر قادیان میں شکر گزاری کے گیت گائے گئے اور مرزا محمود نے گورنر پنجاب، وائسرائے ہند اور سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند کو شکریہ کے تار دیئے اور اسے جماعت احمدیہ کی عزت افزائی قرار دیا۔

شہنشاہ برطانیہ کی سلور جوبلی 1935ء فنڈ میں چندہ

6 مئی 1935ء کو ہندوستان میں جارج پنجم ملک معظم برطانیہ کی تخت نشینی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن نے ایک سلور جوبلی فنڈ قائم کیا اور اہل پنجاب سے اپیل کی کہ وہ اس میں چندہ دیں۔ علامہ اقبال نے اس فنڈ میں سو روپیہ چندہ دیا۔ شیخ عبدالماجد نے اس بات کو بھی علامہ اقبال کی انگریز نوازی کی دلیل کے طور پر پیش کر کے الزام تراشی کی ہے۔ (22) لیکن وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اسی سلور جوبلی کی تقریبات پر سرکار پرستوں کو ان کی خدمات جلیلہ کے صلے میں خطابات دیئے گئے جن میں ظفر اللہ کو سر کا خطاب ملا اور پھر ملک معظم کی سلور جوبلی منانے والی ہندوستانی جماعتوں میں قادیانی پیش پیش تھے اور انہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہم

الفضل قادیان کے ایک اداریے کا عکس شائع کر رہے ہیں جس میں قادیانیوں سے کہا گیا ہے کہ جیسے مرزا غلام احمد نے ایسے موقعوں پر حکومت برطانیہ کی شکر گزاری، اس کے استحکام و ترقی کے لئے دعائیں کیں اور چندہ جمع کیا تھا ایسے ہی اب کیا جائے۔ الفضل نے اپیل کی کہ ہر احمدی اپنی آمدنی سے جوبلی فنڈ میں چندہ دے اور نظارت بیت المال حتی المقدور اس میں شریک ہو۔ یہ ملک معظم سے اظہار وفاداری کا ایک عمدہ موقع ہے اور یہی حضرت مرزا صاحب کا اسوۂ حسنہ اور طریقہ ہے۔(23)

ہائی کورٹ کی ججی (1925ء) اور علامہ اقبال

علامہ اقبال کے قادیانی نقاد ان کے ہائی کورٹ کا جج نہ بننے کے واقعے کو ان کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ (24) 1925ء میں سر شادی لال ہائی کورٹ کا چیف جج تھا۔ اس زمانے میں ایک مسلمان جج کے ہائی کورٹ میں تقرر کا مسئلہ اٹھا ہندوستان کی اسلامی انجمنوں، ناموروکلاء، اخبارات اور تعلیم یافتہ طبقے نے ڈاکٹر اقبال کی بے نظیر علمی قابلیت اور قانونی معاملات میں ان کی بہترین لیاقت کے باعث ان کا نام تجویز کیا۔ سر شادی لال نے اپنے مذہبی تعصب کی بناء پر کہا کہ وہ اقبال کو محض ایک فلسفی اور شاعر کے طور پر جانتے ہیں، چنانچہ اس نے ان کی جگہ اپنی مرضی کے آدمی یعنی یوپی کے سید آغا حیدر کو جج مقرر کر دیا۔

خالد لطیف گابا (کے ایل گابا) جو ہندو سے مسلمان ہوئے اور خود ایک اعلیٰ درجے کے وکیل تھے، اپنی سوانح عمری میں شادی لال کے تعصب اور کینہ پروری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جج بننا علامہ اقبال کا حق تھا۔(25)

دراصل سر میاں شفیع شادی لال کے مربی تھے لیکن جب وہ لاہور ہائی کورٹ کا جج بن گیا تو ان کے خلاف ہو گیا۔ وہ سر شفیع کے داماد شاہ نواز سے دشمنی نکالنے کے لئے علامہ اقبال کو استعمال کرنا چاہتا تھا جس سے انہوں نے انکار کر دیا اور دل برداشتہ ہو کر انڈین کونسل آف سٹیٹس کے ممبر سر جے پی تھامپسن کو 17 کتوبر 1925ء کو خط لکھا کہ کشمیر سٹیٹ کونسل کی رکنیت دلانے میں ان کی مدد

کی جائے کیونکہ لاہور ہائی کورٹ میں جج کی تقرری کے مسئلہ پر مسلم پریس نے جو احتجاج کیا اور کرے گی اس سے انہیں نقصان کا اندیشہ ہے اور ایک وکیل کی حیثیت سے ان کا کام مشکل ہو جائے گا۔ تھامپسن نے 22 اکتوبر 1925ء کو جواب دیا کہ حکومت کی یہ پالیسی نہیں کہ ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرے، پالن پور کے نواب مہاراجہ کشمیر کے دوست ہیں اگر وہ ان کو کہیں اور پھر حکومت ہند کا مشورہ مانگا گیا تو وہ ان کی درخواست کا خیال رکھے گا۔

ہندوستان کے نابینا مصنف وید مہتہ شادی لال کے دوست تھے انہوں نے اپنی یادداشتوں میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح شادی لال نے علامہ اقبال اور شاہنواز کو ایک دوسرے کے خلاف اکسا کر ان کو ججی کے عہدے سے محروم کیا اور اپنی مرضی کا جج مقرر کر دیا۔ (26)

علامہ اقبال تمام تر اہلیت کے باوجود ایسے منصب کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کے حق میں نہ تھے وہ قناعت پسند تھے۔ انہوں نے عام سیاسی رہنماؤں کی طرح نہ گورنروں اور وائسرائے سے ملاقاتیں کیں نہ ان کی دی گئی ضیافتوں میں شرکت کی اور نہ ہی ان کی کاسہ لیسی کی۔ جج کا عہدہ ان کا حق تھا جس سے انہیں ایک سازش کے تحت محروم کر دیا گیا۔

قادیانی اس واقعہ کا موازنہ سر ظفر اللہ کے جج مقرر کئے جانے کی سرکاری پیش کشوں سے کرتے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو سر ظفر اللہ کا رویہ کہ وہ ہائی کورٹ کی ججی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے جب کہ علامہ اقبال اس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ سر ظفر اللہ لکھتے ہیں کہ 1934ء میں سر شادی لال نے چوہدری شہاب الدین سے کہا کہ وہ اس معاملے میں ظفر اللہ کی رائے لیں کیونکہ ہائی کورٹ میں ایک جج کی اسامی خالی ہو رہی ہے لیکن سر ظفر اللہ نے انکار کر دیا۔ اس زمانے میں وائسرائے نے ان کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بننے کی پیش کش کی لیکن وہ نہ مانے۔ ''تحدیث نعمت'' میں انہوں نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ (27) قادیانی اخبارات و رسائل علامہ اقبال کے جج نہ بننے کے واقعہ (1925ء) سے اس کا تقابل کرتے ہیں (28) جو حقائق کے خلاف ہے۔

شاید قادیانی ناقدین کو معلوم نہیں کہ اس زمانے میں سر ظفر اللہ کی نظر وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر یعنی وزیر بننے پر لگی ہوئی تھی اس کے لئے وہ اندرون خانہ لندن اور دہلی میں لابنگ کر رہے تھے۔ ان حالات میں وہ ان عہدوں کو کیسے قبول کر لیتے؟

قادیانی معترضین کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ راجپال کے مقدمے 1927ء میں سر ظفر اللہ نے آؤٹ لک کے قادیانی ایڈیٹر دلاور بخاری کی وکالت کی۔ ہائی کورٹ کے جج جسٹس دلیپ سنگھ (عیسائی) کے استعفیٰ کے لئے قادیانیوں نے ایک مہم شروع کر رکھی تھی۔ مرزا محمود احمد نے ایک تجویز پیش کی کہ ایک وفد گورنر پنجاب سے ملے جس میں قادیانی زعما سمیت تمام فرقوں کے رہنما شامل ہوں اور بخاری کی رہائی کا مطالبہ کرے دوسرے پنجاب، سرحد وغیرہ کے پانچ لاکھ افراد کے دستخطوں سے ایک میمورنڈم انہیں پیش کیا جائے جس میں کہا جائے کہ جسٹس دلیپ سنگھ کی جگہ پنجاب سے ایک بیرسٹر کو جج بنایا جائے جو مستقل جج ہو اور سر شادی لال کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کو out of turn seniority دے کر چیف جسٹس ہائی کورٹ مقرر کیا جائے۔ (29) یہ تمام تگ و دو سر ظفر اللہ کو لاہور ہائی کورٹ کا جج یا چیف جسٹس بنوانے کے لئے کی گئی۔ لاہور جماعت کے ایک سرکردہ رکن مرزا سلطان احمد نے اسے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ (30)

جماعت احمدیہ کا پہلا نائٹ

جناب چودھری ظفر اللہ خان صاحب کو نائٹ ہڈ کا خطاب

ملک معظم کے یوم ولادت اور سلور جوبلی کی تقریب پر جو خطابات دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے نائٹ ہڈ کا خطاب پنجاب سے تعلق رکھنے والے دو معززین کو دیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک جناب چودھری ظفر اللہ خان صاحب ہیں۔ اور دوسرے مسٹر جسٹس اڈیسن جج ہائی کورٹ لاہور۔

ہم اس عزت افزائی پر جناب چودھری صاحب موصوف کی خدمت میں جماعت احمدیہ کی طرف سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ انہیں بیش از بیش انعامات کا مورد بنائے۔ اور ان کا ہر اعزاز اسلام، مسلمانوں اور ملک کے لئے بابرکت کرے۔

آپ پہلے احمدی ہیں۔ جنہیں خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جناب چودھری صاحب کی ذات جس طرح ترقیات کے دوسرے شعبوں میں ہماری جماعت کے نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اسی طرح ان کا یہ اعزاز بھی نہایت ہی خوش کن [illegible]

[illegible]

آنریبل سر چودھری ظفر اللہ خان صاحب کا وائسرائے کی کونسل میں مستقل تقرر

[illegible] احسان کے [illegible] جناب چودھری ظفر اللہ خان صاحب کے تقرر کے متعلق [illegible] ظاہر کیا ہے۔ کہ ان کا تقرر [illegible] عارضی ہے۔ اور سر [illegible] انگلستان سے واپس آکر اپنے عہدہ کا چارج لے لیں گے [illegible] ۔۔۔ [illegible] کی طرف سے [illegible] چودھری صاحب کو صاف طور پر عہدہ [illegible] چند ماہ کے لئے عارضی طور پر اس منصب پر فائز رکھنے کے بعد انہیں کسی دوسری جگہ [illegible]

[illegible] کی گئی۔ [illegible] اس عارضی تقرر [illegible] حکومت [illegible] اور لکھا [illegible] حکومت نے چودھری صاحب کو مقرر کیا ہے۔ [illegible] اپنے حامیوں کی [illegible] پیدا کر دیا۔ چودھری صاحب کے تقرر کے عارضی ہونے کے باعث مسلمانوں نے [illegible] کوشش [illegible] کر سکے کہ ان کے عارضی تقرر کو مستقل بنوا دیا جائے [illegible] جماعت اور ناعاقبت [illegible] کا نہایت ہی [illegible] مظاہرہ کیا۔ [illegible] عارضی تقرر مستقل نہیں بن سکے گا۔ [illegible] اخباروں نے [illegible] جاری رکھا۔

[illegible] کہ ملک معظم نے جناب چودھری صاحب کو ۱۱ [illegible] سے وائسرائے کی کونسل کا مستقل ممبر مقرر کر دیا ہے [illegible] اعلان [illegible] بلکہ یہ بات [illegible] ثبوت کو پہنچ گئی [illegible] جماعت احمدیہ [illegible] حاصل ہو گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الفضل

نمبر ۱۳۳ | قادیان دارالامان مورخہ ۲ محرم ۱۳۵۴ھ | جلد ۲۲

شہنشاہ معظم کی سلور جوبلی اور جماعت احمدیہ

ہر کہ وہ معلوم و واضح ہو چکا ہے۔ کہ [illegible]
تمام ممالک کے لوگوں کی طرف سے جو حکومت برطانیہ کے جھنڈے
کے نیچے آباد ہیں اور ملک معظم کو اپنا حکمران تسلیم کرتے ہیں
ملک معظم کی تخت نشینی کی پچیسویں سالگرہ کی تقریب خوشی اور
مسرت سے منائی جائے گی۔ جماعت احمدیہ نے اپنے آقا حضرت
مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم اور آپ کے اسوہ حسنہ
کے ماتحت آج تک حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری اور
حقیقی خیر خواہی کا جو ثبوت پیش کیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے
کہ خوشی اور مسرت کی اس شاندار تقریب میں بھی جماعت احمدیہ
حسب استطاعت پورا پورا حصہ لے اور ثابت کرے
[illegible]

اچھوت اقوام کو کیا کرنا چاہیے

[illegible]

باب 3:

حوالے وحواشی

1 ہفت روزہ لاہور، لاہور جس کے ایڈیٹر ثاقب زیروی ہیں اس مہم میں پیش پیش رہا ہے۔

2 شیخ عبدالماجد فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 2

3 چٹان لاہور، 8 اپریل 1974ء

(4) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ: ص 115, 116

(5) مرزا غلام احمد، تحفہ قیصرہ، ٹائٹل

(6) تحفہ قیصرہ، ص 9

(7) جلسہ جوبلی شصت سالہ حضرت قیصرہ، دام ظلہا مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ششم مؤلفہ میر قاسم علی قادیانی قادیان، صفحات 128,129

(8) مرزا غلام احمد قادیانی ستارہ قیصریہ ص 8

(9) بشیر احمد، تحریک احمدیت: یہودی وسامراجی گٹھ جوڑ لاہور ص 72

(10) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ، صفحات 113 تا 144 اور اقبال اور احمدیت باب نمبر 4، صفحات 109 تا 123

(11) مرزا محمود احمد، سیرت مسیح موعود، ربوہ ص: 74

(12) تبلیغ رسالت جلد ششم، مولف میر قاسم علی، قادیان حاشیہ ص 69 مرزا صاحب کا ایڈریس بنام ملکہ وکٹوریہ، وائسرائے ہند، لیفٹیننٹ گورنر پنجاب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد سوم ص 196

(13) مرزا غلام احمد، نور الحق، ص: 33

(14) بعض قادیانی کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا ایک الہام ہے سلطنت برطانیہ تا ہشت سال یعنی آٹھ سال بعد سلطنت برطانیہ میں ضعف واختلال آجائے گا لیکن مرزا صاحب نے ایسے الہام کی موجودگی کی نہایت سختی کے ساتھ اپنے رسالے کشف الغطاء 1898ء میں تردید کی ہے، بلکہ یہ رسالہ اسی غرض کے لئے لکھا گیا تھا۔

(15) شیخ عبدالماجد،فکر اقبال اورتحریک احمدیہ ص113-114

(16) تبلیغ رسالت، جلد اول تا دہم، مؤلفہ قاسم علی قادیان

(17) غلام رسول مہر، سرود رفتہ، 1959ء ص:55-57

(18) الفضل قادیان، 7دسمبر 1918ء، اور 9مارچ 1918ء۔ بشیر احمد،تحریک احمدیت: یہودی وسامراجی گٹھ جوڑ باب پنجم

(19) سالک نے ذکر اقبال میں اس پر اظہار ندامت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے چند دن بعد جب وہ اقبال سے ملے تو انہوں نے ویسا ہی محبت آمیز سلوک کیا۔ ص:22

(20) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، ص:266

(21) الفضل، قادیان 5جون 1935ء

(22) شیخ عبدالماجد،فکر اقبال اورتحریک احمدیہ،ص:120

(23) الفضل قادیان، 7اپریل 1935ء

(24) ہفت روزہ لاہور، لاہور 13اکتوبر، 1982ء

(25) کے ایل گابا، فرینڈز اینڈ فوز، پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور، 164

(26) زندہ رود حصہ دوم ص:286، نیو یارکر، 23جولائی، 1979ء

(27) سر ظفر اللہ، تحدیث نعمت، 345

(28) ہفت روزہ لاہور، لاہور 13اکتوبر، 1982ء

(29) الفضل، قادیان، 5جولائی اور 22جولائی، 1927ء

(30) مرزا سلطان احمد، انکشاف حقیقت، احمدیہ انجمن پشاور، 1929ء ص:7

باب 4

علامہ اقبال کے حکیم نورالدین اور جماعتِ احمدیہ لاہور سے تعلقات

علامہ اقبال کے حکیم نورالدین بھیروی خلیفہ قادیان اور جماعت احمدیہ لاہور کے سرکردہ افراد خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر بشارت احمد، مولوی محمد علی، ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ وغیرہ سے دوستانہ تعلقات کا بہت چرچا کیا جاتا ہے۔ قادیانی ان تعلقات کی بناء پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ علامہ اقبال اگر مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوؤں کی صداقت پر یقین نہ رکھتے تھے تو ان کی تکذیب و تکفیر بھی نہیں کرتے تھے اور اپنے دل میں تحریک احمدیت کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے اور اس تحریک کے بعض پہلوؤں سے متاثر تھے جیسے تبلیغ اسلام۔ ہم ان امور کا جائزہ لیتے ہیں۔

جولائی 1908ء میں جب علامہ اقبال یورپ سے واپس وطن لوٹے تو اسی سال 26 مئی 1908ء کو مرزا صاحب وفات پا چکے تھے اور حکیم نورالدین قادیانی جماعت کے خلیفہ بن گئے تھے۔ حکیم صاحب علامہ اقبال کے استاد میر حسن کے قریبی دوست تھے اور میر صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ (1) اس لحاظ سے علامہ اقبال بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

حکیم نورالدین کا تعارف

حکیم نورالدین (1841-1914) کا تعلق بھیرہ سرگودھا سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ دینی تعلیم رامپور، دہلی اور لکھنؤ میں حاصل کی، 6-1865ء میں حج کیا اور بھیرہ میں مطب کھولا۔ طب یونانی اور تشخیص علاج میں وہ ماہر تھے ان کی بیاض آج بھی اطباء میں مقبول ہے۔ 1877ء میں دہلی دربار میں شرکت کی جس میں ملکہ وکٹوریہ کو قیصرہ ہند کا خطاب دیا گیا۔ نارمل سکول (موجودہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول) باغ سرداراں راولپنڈی میں مدرس رہے پھر کشمیر میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ (2) 1885ء میں مرزا صاحب کا ایک اشتہار پڑھ کر قادیان گئے اور 23 مارچ 1889ء کو جب مرزا صاحب نے بیعت لینے کی ابتداء کی تو انہوں نے سب سے پہلے بیعت کی۔

انہوں نے عیسائیت کے رد میں ایک کتاب 'فصل الخطاب' لکھی اور 1890ء میں پنڈت لیکھرام آریہ کی کتاب 'تکذیب براہین احمدیہ' کا رد 'تصدیق براہین احمدیہ' لکھا۔ 1892ء میں ان پر سیاسی سازش کا الزام لگا کہ وہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو اقتدار سے ہٹا کر امر سنگھ کو برطانوی ریذیڈنٹ مقیم کشمیر کے اشارے پر برسر اقتدار لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ (3) ان کو ریاست سے نکال دیا گیا۔ ریاست سے نکلتے وقت ان کے ذمہ دو لاکھ روپے کا قرضہ تھا۔ راجہ امر سنگھ نے ان کو ایک بڑا سرکاری کنٹریکٹ دلوا کر اس قرضے کو ادا کر دیا۔ 1892ء میں حکیم صاحب قادیان آ گئے ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں بہت نادر اور نایاب کتب تھیں وہ تحریک احمدیت سے وابستہ ہو گئے۔ مرزا صاحب نے ان کی اطاعت شعاری اور شخصی خلوص مندی کی بہت تعریف کی ہے اور کہا کہ وہ دو فرشتے جن کے کندھوں پر مسیح موعود کے نزول کا احادیث میں ذکر ہے ان میں ایک حکیم نورالدین اور دوسرے مولوی احسن امروہوی ہیں۔ امروہوی صاحب 1917ء میں لاہوری جماعت کے ساتھ مل گئے تھے۔ مرزا صاحب حکیم صاحب کو صدیقیت کے درجے پر فائز قرار دیتے تھے اور ان کو خدا کی آیات میں سے ایک آیت کہتے تھے (4)

انہوں نے مرزا صاحب کی زندگی میں نہایت خلوص سے ان کا ساتھ دیا اور ان کے ہر حکم پر لبیک کہا اس لئے مرزا صاحب نے ان کے متعلق ایک فارسی شعر کہا ہے جس کا مطلب ہے اگر میری جماعت کا ہر فرد نوردین بن جائے تو کیا ہی اچھا ہو یہ تبھی ہو سکتا ہے جبکہ ہر ایک دل نوردین کی طرح یقین کے نور سے بھر جائے۔ حکیم صاحب مرزا صاحب کی کتب کے پروف پڑھنے اور انکے لیے حوالے تلاش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی اس کاوش کا مرزا صاحب کی کتب کے عموی معیار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حکیم صاحب کی ہدایت پر انگریزی میں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کا کام مولوی محمد علی مدیر ریویو آف ریلیجنز کو سونپا گیا وہ ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ انگریزی وہ جانتے نہیں تھے اس لئے جہاں کہیں ضرورت پڑتی وہ اردو میں تفسیری نوٹ لکھا دیتے یا زبانی ہدایات دے دیتے۔ ترجمہ کا زیادہ اور اصل کام مولوی محمد علی نے خود کیا جو 1917 میں لاہور

سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی طرف سے غلام سرور، عبداللہ یوسف علی اور پکتھال کے انگریزی تراجم قرآن شائع ہوئے۔ مولوی محمد علی کا ترجمہ قرآن اور تفسیر (اردو) 1923ء میں بیان القرآن کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔ اس پر اور لوگوں کے علاوہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب قادیانیت میں بہت سے اعتراضات کئے ہیں ویسے بھی اس میں نیچری خیالات کا غلبہ ہے جیسا کہ سرسید کی روش تھی۔ حکیم صاحب کے چھ سالہ دور خلافت میں ان کی جماعت کو دی گئی مختصر ہدایات، سوالات کے جوابات اور تقاریر اس وقت کے اخبارات، الحکم، بدر، نور، الحق اور رسالہ احمدی میں شائع ہوئیں۔ الفضل ان کی وفات سے تقریباً ایک سال قبل مرزا محمود نے 1913ء میں قادیان سے جاری کیا تھا۔ مولوی محمد علی نے اختلاف سلسلہ (1914)ء کے بعد لاہور سے قرآن مجید کے اردو اور انگریزی تراجم شائع کئے جو قادیان میں تیار کئے گئے تھے۔

ہم حکیم صاحب کے خطبات، تقاریر، ملفوظات وغیرہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں احمدیہ مسلک سے متعلق عام معلومات، نبوت، کفر، وفات مسیح، آمد مہدی، ضرورت وحی والہام وغیرہ کے علاوہ کوئی خاص بات نظر نہیں آتی انہوں نے کوئی ایسی عظیم تصنیف اہل ہند کے سامنے پیش نہیں کی جس سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ لگایا جا سکے نہ کوئی ایسی نمایاں اور اچھوتی کتاب سامنے آئی جس کی غیر جانبدار اہل علم نے تعریف کی ہو یا اس کو علمی دنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی ہو اور اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہوں۔ اسی طرح روایتی موضوعات سے ہٹ کر ان کی کوئی ایسی تقریر بھی نہیں جسے غیر جانبدار اہل علم یا غیر مسلم دانشوروں نے سراہا ہو۔ اگر یہی حقیقت ہے تو پھر نورالدین کا کیا علمی و دینی مقام تھا۔ محض مرزا غلام احمد کی تابعداری اور قادیانی خلافت کی گدی پر آمر مطلق کے طور پر براجمان ہونا انہیں علم وفضل اور دینی مسائل سے آگاہی کے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں کر دیتا۔ نہ جانے ڈاکٹر اقبال کی یہ انکساری تھی یا ان کے استاد میر حسن سے حکیم صاحب کی گہری دوستی تھی یا ان کا حکیم صاحب کے بارے میں حسن ظن تھا یا قادیانی پروپیگنڈے کے زور پر ان کا ایک ایسا امیج بنا دیا گیا تھا کہ وہ ان کے علم وفضل کے قائل ہو گئے تھے۔ حکیم صاحب کا اتنا بڑا

علمی مقام ہو یا نہ ہو علامہ اقبال نے ایک دو سوال پوچھ کر ان کو صاحب علم وحکمت اور ایک ممتاز فقیہہ کی صف میں کھڑا کر دیا جیسا کہ قادیانیوں کا دعویٰ ہے۔ البتہ ان کی مسلمانوں سے صلح کی پالیسی اور مرزا صاحب کے دعاوی کی تلخی اوران کا زہر نکالنا قابل تحسین امر قرار دیا جا سکتا ہے اور یہی ان کی شخصیت کا طرہ امتیاز ہے۔ اگر ان کی وضع کردہ پالیسی قائم رہتی تو احمدیہ جماعت آئندہ چند سالوں میں مسلمانوں کا ایک فرقہ بن جاتی جیسا کہ علامہ اقبال کا خیال تھا۔ حکیم صاحب کے بیانات اور تقاریر میں ایک بات عام قاری کو کھٹکتی ہے کہ وہ کئی جگہوں پر مرزا صاحب کو حضرت امام زماں سیدنا مسیح موعود علیہ السلام وغیرہ کے القابات سے نہیں پکارتے جیسا کہ قادیانی عقیدت مند مصنفین کا شعار ہے بلکہ وہ انہیں محض مرزا کہتے ہیں اور اس کے ساتھ لفظ صاحب بھی نہیں کہتے۔ اسے ہم ان کی بے تکلفی کہیں یا حسن عقیدت کا نمونہ یہ فیصلہ کرنا قادیانیوں کا کام ہے۔

علامہ اقبال نے برصغیر کے ممتاز علماء اور صوفیاء سے علمی استفادہ کیا۔ انہوں نے علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا الیاس برنیؒ، پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ وغیرہ سے علمی اور دینی مسائل پوچھے۔ انگریز اساتذہ سے بھی انہوں نے کسب فیض کیا اور ان کی تعریف میں اشعار کہے۔ یہ ان کی وسیع المشربی، عالی ظرفی اور بلند نظری کی دلیل ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ احمدی تھے یا حکیم نورالدین کو خلیفہ مانتے تھے یا ان کی رائے کو حتمی سمجھتے تھے۔ وہ کسی شخص کے عقیدے، مذہب اور فرقہ سے بالاتر ہو کر اس کے علم وفضل سے استفادہ کرتے تھے۔ واضح رہے کہ اس دور میں کئی مسلم مشاہیر کے قادیانیوں سے علمی روابط تھے جو رفتہ رفتہ کم ہوتے چلے گئے۔

علامہ اقبال کے حکیم نورالدین سے فقہی سوالات

علامہ اقبال نے 1909ء میں درج ذیل چار سوالات حکیم نورالدین کو جواب کے لئے بھجوائے۔

(1) کیا کوئی غیر مسلم فرمانروا اپنی مسلمان رعایا کے لئے وضع قانون کر سکتا ہے؟

(2) کیا کوئی غیر مسلم جج ازروئے قانون اسلامی، مسلمانوں کے مقدمات فیصل کر سکتا ہے؟ کیا

تاریخ اسلامی میں کسی ایسے غیر مسلم جج کی نظیر موجود ہے جو بحیثیت عہدہ مسلمانوں کے مقدمات فیصل کرتا ہو؟

(3) کیا مسلمان ہونے کے لئے شرع محمدی کی پابندی لازمی ہے؟ اگر ہے تو ان مسلمان قوموں کی نسبت کیا حکم ہے جن کے معاملات زیادہ تر رواج سے فیصل پاتے ہیں اور جو خود اپنے آپ کو رواج کا پابند ظاہر کرتی ہیں؟

(4) مسلمانوں کا ضابطہ تعزیری قریباً قریباً بالکل معطل ہے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اسلامی ممالک............ میں بھی۔ کیا اس ضابطہ کی پابندی ضروری ہے؟ اگر ہے تو جو مسلمان اس کے پابند نہیں خواہ اس وجہ سے کہ وہ کسی غیر مسلم بادشاہ کے محکوم ہیں جو اس ضابطہ کا پابند نہیں ہے یا کسی اور وجہ سے، ان کے اسلام کی نسبت کیا حکم ہے۔

حکیم نورالدین کے جوابات

''میں اختصار پسند ہوں اس لئے آپ کے سوالات کے جوابات اختصار سے تحریر کر کے بھجوا رہا ہوں۔

(1) قرآن مجید گو مکمل ضابطہ حیات ہے مگر وہ مذاہب مختلفہ کو باہمہ اختلاف، تباہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ قانون اسلامی کے اصل الاصول قرآن مجید میں موجود ہیں مگر ان کی تفصیل کو اطاعت اولی الامر کے نیچے رکھا ہے اور اسی پر صحابہؓ سے لے کر آج تک اسلامیوں کا عمل ہے۔ ہر مسلمان کے لئے اطاعت اللہ، اطاعتِ رسولؐ اور اطاعتِ اولی الامر ضروری ہے۔ اگر اولی الامر صریح مخالفت فرمان الٰہی اور فرمان نبویؐ کی کرے تو بقدر برداشت مسلمان اپنے شخصی معاملات میں اولی الامر کا حکم نہ مانے یا اس کا ملک چھوڑ دے۔ اولی الامر حکام و سلطان اول ہیں اور علماء و حکام دوم درجہ پر ہیں۔

تعزیزی احکام کے ہم ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ قرآن شریف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال موجود ہے کہ آپ سلطنت فرعون (A-4) کے ماتحت تھے اور ملکی قانون کی خلاف ورزی

نہ کر سکتے تھے۔

(2) غیر مسلم جج جب فرمانروا کی طرف سے ہے تو حقیقتاً فرمانروا ہی جج ہے اور اگر فرمانروا کی طرف سے نہیں بلکہ پنچایتی طور پر ہے تو بھی جائز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک موقع پر خود فرعون مصر کو اپنے معاملہ میں منصف مقرر فرمایا۔

(3) شرع محمدیؐ نام ہے قرآن، احکام نبویؐ، خلفائے راشدین، صحابہ، ائمہ دین (امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ، محمدؒ، زفرؒ، حسنؒ) کے فیصلہ پر عمل درآمد کا، فتاویٰ عالمگیری بلکہ ہدایہ کے مقدمات دیوانی و فوجداری اور قوانین میں قرآن مجید و حدیث کے ہزارویں حصہ کا ذکر بھی نہیں آتا۔ میونسپلٹی اور سیاست مدن کے قواعد کی چھان بین کی جائے تو غالباً سارے کا سارا عرف پر مبنی ہے اور فوجی قوانین کی کوئی خاص کتاب میرے زیر مطالعہ آج تک نہیں آئی اور اگر کوئی کتاب ایسی ہو بھی تو اس میں قرآن و حدیث کا ذکر بطور تبرک ہی آتا ہے اور ائمہ دین کا بھی ذکر شاید ہی اس میں ملتا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ ان امور کی آزادی میں وقتی ضرورت، عرف سے کام لیا گیا ہے۔

(4) قرآنی نظریہ کے مطابق ایمان بتدریج ترقی کرتا رہتا ہے۔ پس جو لوگ صرف لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں وہ ایک حد تک مسلمان ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ پابند نماز بھی ہیں وہ پہلوں سے بڑھ کر مسلمان ہیں اور جو زکوٰۃ، روزہ اور حج ادا کرتے ہیں وہ اور زیادہ پختہ مسلمان ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس سب مساوی الایمان نہیں اور ہرگز نہیں۔''

یہ سوالات بڑے اہم، جامع اور مشکل ہیں جن کے جواب کے لئے اسلامی تاریخ کے گہرے مطالعے اور چاروں ائمہ کے مدون کردہ فقہوں پر دسترس رکھنا ضروری ہے لیکن حکیم صاحب نے بڑے سطحی انداز میں جواب دیئے ہیں جن میں قادیانی نقطہ نظر کی جھلک موجود ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور شاہِ مصر 'فرعون' کے زمانے کے واقعات سے استدلال کیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن

مجید اور تاریخ کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر کے بادشاہ کا لقب فرعون نہیں تھا (مصنف) انہوں نے اسلامی عہد کے حالات اور مسلمان فقہا کے نقطہ نظر کو پیش نہیں کیا، حالانکہ علامہ اقبال کے سوالات کا مدعا یہ تھا کہ حکیم صاحب ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے تناظر میں، غیر مسلم فرمانروا کے وضع کردہ قانون، رواج کی شرعی حیثیت، ضابطہ تعزیز وغیرہ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کریں۔ وہ خود اسلامی فقہ Islamic jurisprudence پر گہری نظر رکھتے تھے اور اینگلو سیکسن لاء کے ماہر بار ایٹ لا وکیل تھے۔ وہ اس موضوع پر خود بھی لکھنا چاہتے تھے۔ (5) ہم آج کے زمانے میں کسی مقتدر عالم اور فقیہہ سے ان سوالات کے جوابات حاصل کریں تو ہمارے نزدیک وہ ان کے بارے میں زیادہ مفصل اور بہتر روشنی ڈال سکے گا۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان جوابات سے علامہ اقبال کتنے مطمئن ہوئے یا بالکل مطمئن نہ ہوئے۔

عربی ادب عالیہ کے بارے میں حکیم نور الدین سے علامہ اقبال کا استصواب

1912ء میں علامہ اقبال نے حکیم نور الدین سے عربی ادب کی عمدہ کتب کی تفصیل چاہی۔ انہوں نے 2 دسمبر 1912ء کو ایک خط میں عربی لٹریچر کی فہرست ارسال کر دی۔ علامہ اقبال کا خط اور حکیم صاحب کا جواب ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ شیخ عبدالماجد اپنے والد شیخ عبدالقادر کی تاریخ احمدیت لاہور ص 485 کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس مکتوب کی اصل کاپی آپ (حکیم صاحب) کے خاندان کے پاس محفوظ ہے۔ (6) حکیم صاحب کے دو صاحبزادے مولوی عبدالمنان عمر اور مولوی عبدالوہاب وفات پا چکے ہیں وہ 1956ء میں مرزا محمود سے اختلاف کر کے لاہوری جماعت سے جا ملے تھے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کے خاندان کے افراد یا لاہوری جماعت اس خط و کتابت کو شائع کر دے گی۔ 1914ء میں وفات کے وقت حکیم صاحب کا تمام علمی سرمایہ اور کتب خانہ قادیان میں موجود تھا اور مرزا محمود احمد کے تصرف میں تھا۔ ان کی ایک صاحبزادی مرزا محمود کے نکاح میں تھیں۔ اگر حکیم صاحب کے خاندان سے مراد قادیان یا موجودہ زمانے میں ربوہ میں موجود ان کے وارثین ہیں، تو وہ یہ خطوط شائع فرما دیں، ہم ان کے ممنون ہوں گے۔

ذاتی شرعی مسئلے میں حکیم نورالدین سے علامہ اقبال کا رابطہ

1913ء میں علامہ اقبال نے محترمہ سردار بیگم صاحبہ کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں مرزا جلال الدین بارایٹ لاء کو حکیم نورالدین کی رائے لینے کے لئے قادیان بھیجا۔(7) ممکن ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے اور علماء سے بھی رائے لی ہو جس کا ثبوت نہیں ملتا کیونکہ یہ ان کا نجی مسئلہ تھا۔ محترمہ سردار بیگم صاحبہ سے ان کا 1910ء میں نکاح ہو چکا تھا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ایک کمینہ فطرت وکیل نے اپنے لڑکے کے ساتھ ان کی شادی کرنے کے لئے علامہ اقبال کو بعض گمنام خطوط لکھ کر بدظن کرنے کی کوشش کی (8) چنانچہ ان کے دل میں طلاق کا خیال پیدا ہوا اس لئے ان کا گمان تھا کہ طلاق واقع نہ ہوگئی ہو اس لئے انہوں نے حکیم نورالدین سے فقہی مسئلہ پوچھا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی اگر شبہ ہے تو تجدید نکاح کر لیں اس پر علامہ اقبال دوبارہ نکاح پڑھوا کر اپنی زوجہ محترمہ کو 1913ء میں گھر لے آئے۔

اقبال کے دو دوست عبدالمجید سالک (9) اور مرزا جلال الدین اس روایت کو بیان کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کی رائے کہاں تک درست تھی اس کا بہتر جواب کوئی عالم ہی دے سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے نیاز مند اور ممتاز دانشور خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں:

"بزمِ اقبال کی سب سے بڑی خصوصیت اسلام اور بانی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکرِ خیر تھا۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی بات ہو حضرت علامہ اُسے اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھتے۔ اُن کا اسلام کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ہر معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر کی توضیح کرتے تھے۔ ہاں نازک فقہی مسائل کے بارے میں وہ رائے زنی نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ علمائے دین کی رائے کو ترجیح دیتے تھے، اور اس قسم کے معاملات میں علمائے کرام سے مشورہ بھی کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ فلاں مسئلہ مولوی احمد علی سے دریافت کیجئے یا فلاں فقہی نکتے کے بارے میں مولانا غلام مرشد صاحب کی رائے معلوم کیجئے۔ اس نوعیت کا ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ [علامہ اقبال کے دوست] چوہدری محمد حسین مرحوم کوئی بہت بڑے زمیندار

نہیں تھے تاہم ان کے پاس اچھی خاصی موروثی زمین تھی۔ عام زمینداروں کی طرح وہ بھی اسلام کے قانونِ وراثت پر عمل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اسلامی قانون صرف منقولہ جائیداد پر نافذ ہوسکتا ہے، غیر منقولہ پر نہیں۔ چوہدری صاحب پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے، اس لئے وہ اپنے مؤقف کی تائید میں دلیلیں بھی پیش کرتے تھے۔ اس مسئلے پر وہ حضرت علامہ سے بھی گفتگو کرتے رہتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ حضرت علامہ سے اپنے مؤقف کی تائید کرانا چاہتے تھے۔ حضرت علامہ نے مجھ سے فرمایا کہ میں یہ مسئلہ مولانا احمد علی صاحبؒ کے سامنے پیش کر کے اُن کی رائے دریافت کروں۔ میں نے ارشاد کی تعمیل کی۔ مولانا احمد علی صاحبؒ کے جواب سے حضرت علامہ مطمئن ہوگئے اور چوہدری صاحب کو بھی آئندہ کے لئے خاموش ہوجانا پڑا۔

(ماہنامہ نقوش، اقبال نمبر (۲) ص ۳۸۷)

علامہ اقبال کے خط پر حکیم نورالدین کا غلط عربی میں القاء

حکیم نورالدین کے ساتھ خط و کتابت کے سلسلے میں علامہ اقبال کے ایک خط کا ذکر ملتا ہے جو انہوں نے حکیم صاحب کے خط کے جواب میں لکھا۔ یہ خطوط ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ علامہ اقبال کے خط کے ایک حصہ پر حکیم صاحب نے اخبار بدر قادیان میں مندرجہ ذیل رائے شائع کرائی:

''مجھے محمد اقبال ڈاکٹر نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا ڈریپر (امریکی فلسفی جان ولیم ڈریپر (1811-1882) مر گیا۔ اس کا فلسفہ بھی مر گیا یورپ ہر روز نئے فلسفہ کا دلدادہ ہے۔ میرے خیال میں آیا یہ کیا بات ہے ظہر کا وضو کرنے لگا القاء ہوا انسان، ہر انسان فنا ہے اور نیا بنتا ہے کیا یہ انسان لغو ہے؟ ہرگز نہیں پھر القا ہوا۔ **من حیث سنستدرجھم لا یعلمون** (10) یہ تبدیلی (11) ہمارا اپنا فعل ہے۔ اور ایک حکمت پر مبنی ہے۔ حق کو آرہے ہیں۔ (اخبار بدر قادیان 6 مئی 1913ء)

ووکنگ مشنری خواجہ کمال الدین نے حکیم نور الدین کے نام ایک خط لکھا جو اخبار بدر قادیان میں 31 جولائی 1913ء کو شائع ہوا۔ لکھتے ہیں کہ بلجیم کی شہزادی کراجا عیسایت سے بیزار ہے اسلام کی طرف آرہی ہے "حضور والا آپ کا الہام سنستدرج والا جو ڈاکٹر اقبال کے خط پر حضور کو ہوا وہ بالکل

درست پایا۔(12)

علامہ اقبال اور حکیم صاحب کے خطوط شائع ہونے کے بعد تمام بحث کا پس منظر معلوم ہو سکے گا۔ اس خط سے حکیم صاحب اور علامہ اقبال کے درمیان خط و کتابت اور غیر مسلموں کے اسلام کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کو القاء ہوتا تھا جب کہ ان کے مسیح موعود پر بارش کی طرح وحی کا نزول ہوتا تھا، اس سے کوئی اور خاص بات ظاہر ہوتی ہو تو وہ قادیانی ہی جانتے ہوں گے۔

میرے رفیق کار جناب شکیل عثمانی کو حکیم صاحب کے اس القا پر زبان کے نقطۂ نظر سے شبہات تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جب عربی زبان وادب کے ایک ممتاز فاضل اور ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے مجلّے الدرسات الاسلامیہ کے ایڈیٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد الغزالی سے رجوع کیا تو ایک دلچسپ صورت حال سامنے آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب کا القا مہمل اور گرامر کے لحاظ سے غلط ہے۔ اسی رائے کا اظہار عربی زبان وادب کے چند اور ممتاز ماہرین نے بھی کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عربی زبان میں عام طور پر ''من حیث'' بطور علت، معلول کے بعد استعمال ہوتا ہے، جب کہ اس القا میں ترتیب معکوس ہے۔ (مصنف)

علامہ اقبال کے قادیانی لڑکی سے نکاح کی غلط خبر 1910ء

اقبال کی انگلستان سے واپسی کے دو سال بعد قادیانی اخبار الحکم قادیان نے 28 اگست 1910ء کے شمارے میں ایک خبر شائع کی کہ شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی کا نکاح پانچ سو روپیہ حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ اقبال کے عزیزوں اور احباب کو اس پر تعجب ہوا کہ علامہ اقبال تو قادیانی نہیں پکے مسلمان ہیں انہوں نے کس طرح ایک قادیانی لڑکی سے نکاح کر لیا وہ تو قادیانی عقائد کے خلاف ہیں علامہ اقبال کو اس خبر کی تردید چھپوانی پڑی جو پیسہ اخبار لاہور میں 15 ستمبر 1910ء کو چھپی کہ یہ خبر غلط ہے اور یہ کوئی اور ڈاکٹر اقبال ہیں۔

زندہ رود کے مصنف ڈاکٹر جاوید اقبال نے منکوحہ امتہ الرحمن کو یعقوب علی تراب کی نواسی لکھا

ہے لیکن یہ حکیم نورالدین کی نواسی اور مفتی فضل الرحمٰن کی بیٹی تھی۔ دولہا کا نام ڈاکٹر اقبال علی غنی تھا جو غلطی سے ڈاکٹر محمد اقبال چھپ گیا۔ شیخ عبدالماجد نے درج بالا تصحیح کا ذکر کیا ہے۔(13) اس خبر کو قادیانیوں کی کسی چال پر محمول نہیں کیا جا سکتا یہ محض کاتب کی بداحتیاطی تھی البتہ علامہ اقبال کو اس خبر سے ذہنی کوفت ہوئی ہوگی جب ان کے رشتہ داروں اور احباب نے ان سے اس بارے میں سوالات کئے ہوں گے۔

علامہ اقبال کی علمی خدمات کا اعتراف 1911ء

دسمبر 1911ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ علامہ اقبال کی شاندار علمی اور ملی خدمات کی بنیاد پر قوم انہیں کانفرنس کی صدارت پیش کرے اور مولانا شبلی نعمانی ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالیں۔ اس اجلاس میں خواجہ کمال الدین، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور مولانا شبلی نعمانی نے انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ یہ کانفرنس دلی میں منعقد ہوئی۔ خواجہ کمال الدین نے اس میں "اسلام اور علوم جدیدہ" کے موضوع پر ایک لیکچر میں علامہ اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ اپنی ذہنی قابلیت اور استعداد کو بروے کار لا کر حقیقی تلمیذ الرحمٰن بننے کی کوشش کریں اور کہا کہ شاعری کے بجائے وہ ملک و ملت کے لئے عملی کام کریں، خدمت اسلام کریں اور غزالی کے بروز بنیں۔ اس تقریر کے جواب میں علامہ اقبال نے کہا اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں کی یونیورسٹیوں سے ہوا۔ جدید علوم و فنون اور اسلام ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈی کارٹ اور مل کے فلسفوں کا اصول امام غزالی کی احیائے علوم میں موجود ہے، جان سٹوورٹ مل نے منطق پر جو اعتراض کیا ہے وہی امام فخرالدین رازی نے کیا ہے۔ غرضیکہ علوم جدیدہ کے ہر پہلو پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر ڈالا ہے۔(14)

اس کانفرنس میں سر آغا خان، سید حسین بلگرامی اور پورے ہندوستان سے چیدہ چیدہ قومی رہنماؤں نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے ادا کئے۔ علامہ اقبال

کو ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا اور علامہ شبلی نعمانی نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔ علامہ اقبال نے اس عزت افزائی پر قومی رہنماؤں کا شکریہ ادا کیا۔(15)

خواجہ صاحب نے اگر انہیں اخلاص اور نیک نیتی سے تلمیذِ رحمٰن بننے کا مشورہ دیا تھا تو اِسے ہم قابل قدر بات سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کی توقعات سے بڑھ کر اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا اور 1935ء میں قادیانیت کا ایسا شاندار سیاسی، دینی اور علمی محاسبہ کیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

آفتاب اقبال کا قادیان کے سکول میں داخلہ 1911ء

ڈاکٹر اقبال نے اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کو 1911ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کرایا۔ وہ تقریباً پانچ سال 1911ء سے 1916ء تک وہاں زیر تعلیم رہے۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول کو اس وقت پنجاب میں کافی شہرت حاصل تھی اور اس کا معیار تعلیم کافی بلند تھا۔ عیسائی مشنری اداروں کی بجائے اس سکول میں داخلے کو غیر احمدی حضرات بلکہ ہندو بھی ترجیح دیتے تھے۔ اس مدرسے کی بنیاد مرزا صاحب کے زمانے میں رکھی جا چکی تھی۔ 21 مارچ 1908ء کو پنجاب کے فنانشل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر ضلع گورداسپور نے قادیان کا دورہ کیا تو اس مدرسے کے طلباء نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے اس مدرسے کا معائنہ کرنے کے بعد اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کی نئی عمارت کا نقشہ دیکھا اور اسے تعلیم پھیلانے کا ذریعہ بتایا۔(16) مدرسہ کے ساتھ ایک علیحدہ دینی شعبہ تھا۔ مارچ 1909ء میں حکیم صاحب نے اس کو مستقل حیثیت دے کر اس کا نام مدرسہ احمدیہ رکھا، اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مولوی سرور شاہ تھے۔

آفتاب اقبال چار یا پانچ سال تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں زیر تعلیم رہے لیکن قادیانی مذہب اختیار نہ کیا۔ دوران قیام ان کی سرگرمیوں کے متعلق قادیانی لٹریچر میں صرف دو حوالے ملتے ہیں ایک تو بھائی عبدالرحمٰن قادیانی کی دکان کا روزنامچہ ہے جو 1918-01-10 سے 1920-09-28 کا ہے اس میں ان کے ادھار اشیاء خریدنے کی تفصیل درج ہے۔ دوسرا حوالہ الفضل 31 دسمبر 1914ء

کا ہے جب قادیانی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور مولوی محمد علی پارٹی کو مرزا محمود کے غنڈوں نے قادیان سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قادیانی کہتے ہیں" آفتاب اقبال نے اپنی جماعت کے طلباء کے سامنے مرزا صاحب کی ایک نظم پڑھی اور اپنا مضمون سنایا جس میں احمدی جماعت ہی کو خدا تعالیٰ کی پاک جماعت مان کر پھر مرکز سے قطع تعلق کرنے والوں پر اظہار افسوس تھا"۔(17)

مرزا محمود احمد نے قادیانیوں کو ساتھ ملانے کے لئے جو پروپیگنڈا مہم مارچ 1914ء سے زور شور سے شروع کر رکھی تھی اس کی تقویت کے لئے الفضل قادیان طلباء کی غیر نصابی سرگرمیوں کی رپورٹیں شائع کرتا رہتا تھا جس کا اہم پہلو لاہوریوں کے قادیان سے قطع تعلق کی مذمت اور قادیان کی وفادار جماعت اور اس کی پالیسی کی تائید ہوتی تھی۔ یہ رپورٹ اسی کا شاخسانہ ہے غیر احمدی طلباء کو تعلیمی مجبوریوں کے باعث ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا اور قادیانی ٹیچر لاہوریوں کو بدنام کرنے کے لئے طلباء کو اپنے تحریر کردہ مضامین پڑھنے کے لئے دیتے اور پھر اس کی مبالغہ آمیز رپورٹیں الفضل کو بھجواتے تھے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بھائی عبدالرحمٰن قادیانی نے اپنے روزنامچے میں جو 10 جنوری 1918 سے 28 ستمبر 1920 تک کا ہے آفتاب اقبال کے ادھار اشیا خریدنے کی تفصیل لکھی ہے تو عرض ہے کہ آفتاب اقبال 1911ء میں تعلیم الاسلام سکول قادیان میں داخل ہوئے اور 1916ء میں میٹرک کر کے سینٹ سٹیفن کالج دہلی چلے گئے۔(18) 1918ء میں وہ دلی میں تھے تو بھائی عبدالرحمٰن نے 18 جنوری 1918ء سے 28 ستمبر 1920ء کے روزنامچے میں ان کے ذمے ادھار چیزیں خریدنے کی تفصیل کیسے لکھ دی۔ اگر انہوں نے ادھار لیا تھا تو وہ 1911ء سے 1916ء تک کا ہونا چاہئے تھا۔

آفتاب اقبال کی بیگم رشیدہ اقبال لکھتی ہیں" آفتاب اقبال کنک منڈی سیالکوٹ میں سکاچ مشن سکول میں پڑھتے تھے۔ علاقہ کے کسی دوست نے ایک نئے ادارے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے اعلیٰ معیار تعلیم اور تربیت کا ذکر چھیڑا، اپنے لخت جگر کی معیاری تعلیم اور اعلیٰ تربیت کی خاطر علامہ اقبال نے اسے اس نئے مدرسے میں بھجوادیا"۔

اس مدرسے کا انتظام و انصرام قادیانی جماعت کے اکابرین کے ہاتھ میں تھا اس دور میں قادیانی جماعت میں معتدل قیادت تھی اور عوام الناس میں کسی قسم کے شکوک وشبہات نہ تھے۔ان کی بیگم مزید لکھتی ہیں۔

آفتاب اقبال نے اس بات کی پر زور تردید کی کہ وہ قادیانی ہیں، بلکہ قادیان کے قیام کے دوران وہ "اس جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیرالدین محمود کے اخلاق سئیہ سے باخبر ہوئے اور انہوں نے مرزا بشیر الدین محمود کے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سے آگاہ کیا تھا کہ میں ایک عورت کے ناطے اپنے قلم سے اس روداد کو بیان کرنے سے لرزہ محسوس کرتی ہوں''۔(19)

حکیم نورالدین کے عقائد اور اعتدال پسندانہ روش

مرزا غلام احمد کی وفات کے بعد 1908ء میں قادیان کی گدی سنبھالنے کے بعد حکیم صاحب نے ایک تو مرزا صاحب کی وضع کردہ انگریز کی اطاعت اوران سے بھرپور تعاون کی پالیسی برقرار رکھی دوسرے انہوں نے مسلمانوں اوراحمدیوں کے درمیان پائے جانے والے فاصلوں کو کم سے کم تر کیا اس کے لئے انہوں نے احمدیت کی تبلیغ کا زاویہ بدل دیا۔مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت، مسلمانوں کی تکفیر، اور مسلمان علماء سے مباحثے، مجادے اور مباھلے کم سے کم تر کر دئے گئے اور اعتدال پسندانہ روش اختیار کی گئی۔ان کو بطور خلیفہ کلی اختیارات حاصل تھے اور کوئی ان کے خلاف زبان نہ کھول سکتا تھا۔بعض سرکردہ قادیانی جن میں خواجہ کمال الدین، مولوی محمد علی وغیرہ شامل تھے مرزا صاحب کے زمانے ہی سے ایسے عقائد اور غیر احمدیوں سے متعلق نرم رویہ کو پسند کرتے تھے اور نجی مجلسوں میں اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔مسلمانوں اور احمدیوں میں سب سے بڑا اختلافی مسئلہ نبوتِ مرزا کا تھا۔نبوت مرزا کے متعلق حکیم صاحب کا عقیدہ ان کے ایک مطبوعہ خط سے عیاں ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔دل چیر کر دیکھنا یا دکھانا انسانی طاقت سے باہر ہے قسم پر کوئی اعتبار کرے تو واللہ العظیم کے برابر کوئی قسم مجھے نظر نہیں آتی نہ آپ میرے ساتھ میری موت کے بعد

ہونگے اور نہ کوئی اور میرے ساتھ سوائے ایمان و اعمال کے ہوگا پس یہ معاملہ خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہونے والا ہے واللہ العظیم۔ **واللہ الذی باذنھم تقوم السما و الارض** میں مرزا صاحب کو مجدد اس صدی کا یقین کرتا ہوں، میں ان کو راستباز مانتا ہوں۔ حضرت محمد الرسولؐ اللہ النبی عربی المکی المدنی خاتم النبیین کا غلام اور اس کی شریعت کا بدل خادم مانتا ہوں اور مرزا خود اپنے آپ کو جاں نثار غلامِ نبی عربی محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن مناف مانتے تھے۔

نبی کے لغوی معنی پیش از وقت اللہ تعالیٰ سے اطلاع پا کر خبر دینے والا ہم لوگ یقین کرتے ہیں نہ شریعت لانے والا۔ مرزا صاحب اور میں خود جو شخص ایک نقطہ بھی قرآن شریف کا اور شریعت محمد رسولؐ کا نہ مانے اسے کافر اور لعنتی اعتقاد کرتا ہوں یہی میرا اعتقاد ہے اور یہی میرے نزدیک مرزا غلام احمد کا تھا کوئی رد کرے یا نہ مانے یا منافق کہے۔ اسکا معاملہ حوالہ بخدا۔ نورالدین بقلم خود 22 اکتوبر 1910ء (20)

اگرچہ جماعت قادیان کے خلیفہ دوم اور مرزا غلام احمد کے فرزند مرزا محمود احمد نے حکیم نورالدین کی اعتدال پسندانہ حکمت عملی کو 1914ء میں خلافت کی گدی سنبھالنے کے بعد تاخت و تاراج کر دیا اور احمدیت کا اصل چہرہ مسلمانوں کو دکھا دیا لیکن 1908ء سے 1914ء تک حکیم صاحب کی مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی نرم پالیسی جاری رہی۔ عقائد میں وہ شدت جو تحریک احمدیت کی روح تھی اور جس کی ترجمانی 1914ء کے بعد مرزا محمود نے اختیار کی، سامنے آتی گئی۔ مرزا صاحب کی تحریرات کی روشنی میں انہیں حقیقی نبی ثابت کیا گیا جس کا منکر کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ مرزا محمود نے زور دے کر کہا کہ نبوت کا منصب جاری و ساری ہے۔ اسمہ احمد کے مصداق مرزا صاحب ہیں اور ان کے دعاوی پر ایمان لائے بغیر نجات اخروی ممکن نہیں۔ جماعت قادیان (موجودہ جماعت ربوہ) انہیں عقائد پر کاربند ہے اور اسی لئے مسلمان انہیں اسلام کے باغی اور دین کے غدار قرار دیتے ہیں اور اسی لئے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا جو ان عقائد کا لازمی نتیجہ تھا۔ (21)

خواجہ کمال الدین کے لیکچر

حکیم نورالدین کی ہدایت پر خواجہ کمال الدین نے 1909ء میں ہندوستان کے طول وعرض میں صرف اسلام کے موضوع پر لیکچر دیئے اور مسلمانوں سے میل جول بڑھانے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ وہ نفرتوں کی اس خلیج کو جو مرزا صاحب کے الہامات، پیش گوئیوں اور اشتعال انگیز تحریرات نے پیدا کر دی تھی پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ خواجہ صاحب اس عہد کی جماعتی پالیسی اور تبلیغی روش پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

(1) ''حضرت حکیم صاحب مرحوم کی بالغ نگاہ نے فوراً دیکھ لیا کہ جو لوگ اہل کلمہ کو اس وقت کافر ٹھیراتے ہیں وہ اس عقیدہ پر قائم ہو کر ایک نہ ایک دن مرزا صاحب کی نبوت کے قائل ہو جائیں گے اور اس کا اعلان کریں گے چنانچہ قبلہ حکیم صاحب مرحوم اپنی بقیہ زندگی میں یہ دو باتیں شدومد سے بیان کرتے رہے ایک یہ کہ کوئی اہل کلمہ کافر نہیں دوسرا یہ کہ مرزا صاحب نبی نہیں''(22)

(2) 10-1909ء میں ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ زور شور سے جاری تھا۔ 1910ء میں اس یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے خواجہ کمال الدین نے لاہور میں جماعتی عقیدے کا اظہار ایک لیکچر میں کیا۔ فرماتے ہیں:

'اسلام میں کوئی فرقہ نہیں نہ کوئی اہل کلمہ کافر ہو سکتا ہے کوئی اہل کلمہ کسی فرقے سے تعلق رکھے وہ مسلمان ہے مسلم فرقوں میں جو اختلاف ہے وہ اصول کا نہیں بلکہ فروعی اختلاف ہے۔(23) یہ لیکچر حکیم صاحب کی زندگی میں 1910ء میں پیسہ اخبار لاہور میں چھپا۔ اس زمانے میں جماعت احمدیہ کا الگ تشخص ابھر رہا تھا۔ تعلیم یافتہ طبقے نے جماعت کی اس روش کو پسند کیا۔ اسی بات کا ذکر علامہ اقبال نے 1935 میں کیا اور کہا کہ چوتھائی صدی قبل (1910ء) ان کو اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی لیکن ایسا نہ ہوا۔

خواجہ کمال الدین کہتے ہیں کہ حکیم صاحب کے زمانے میں قادیان میں مرزا غلام احمد کے

صاحبزادے میاں محمود احمد مسلمانوں کی تکفیر اور مرزا صاحب کی حقیقی نبوت کے قائل تھے اور وہ اور ان کے رفقاء کا ایک مختصر گروہ جو میر ناصر نواب (ان کے نانا) میر اسحٰق (ان کے ماموں) اور ان کی ساختہ پرداختہ انصاراللہ پارٹی پر مشتمل تھا تکفیری مہم چلانے میں پیش پیش تھے وہ حکیم صاحب سے مختلف اوقات میں ان مسائل پر ان کی رائے لے کر جماعت کے اخبارات میں شائع کراتے اور اپنے مقصد کی تاویلات پیش کرتے۔ اس زمانے میں مرزا محمود نے مرزا صاحب کی نبوت اور تکفیرِ مسلمین کے عقیدے پر مبنی ایک پمفلٹ لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان وہی ہے جو مرزا صاحب کے دعوے کو قبول کرے۔(24) اسے امرتسر سے 5 ہزار کی تعداد میں چھپوایا گیا۔ حکیم صاحب کو جب اس کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے اس کی تمام کاپیاں جلا دینے کا حکم دیا اس طرح اس کی تمام کاپیاں جمع کر کے جلا دی گئیں۔(25)

مرزا محمود احمد نے 1914ء میں اور اس کے بعد جماعت احمدیہ میں اختلاف کے موضوع پر جو رسائل اردو میں لکھے اور جن کے انگریزی میں تراجم ہوئے ان میں وہ حکیم صاحب کی جگہ خواجہ کمال الدین، محمد علی وغیرہ کو اختلاف عقائد اور جماعت کی مذہبی پالیسی میں تبدیلی کا ذمہ دار ٹھیراتے ہیں۔ خواجہ کمال الدین کے متعلق کہتے ہیں کہ 1905ء (مرزا صاحب کے زمانے) میں اخبار وطن نے جب ایک تجویز پیش کی کہ قادیان سے شائع ہونے والے رسالے ریویو آف ریلی جنز کو صرف اسلام کی تبلیغ کے لئے وقف کیا جائے اور اس کے ساتھ ایک ضمیمہ لگا کر اس میں مرزا صاحب کا ذکر کیا جائے تو خواجہ صاحب اس پر راضی ہو گئے۔ یہی تجویز مرزا صاحب کے ایک اور پیرو کار عبدالحکیم اسسٹنٹ سرجن پٹیالہ نے بھی دی تھی، جو ابتداء میں ان کا وفادار مرید تھا۔ اس نے قرآن حکیم کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا لیکن مرزا صاحب سے اور باتوں کے علاوہ اس بات میں اختلاف کی بنیاد پر جماعت سے الگ کر دیا گیا۔ مرزا صاحب اسے عبدالحکیم مرتد کہتے تھے۔ اس نے مرزا صاحب سے خط و کتابت میں خواجہ صاحب اور محمد علی کی اس تجویز کو تسلیم کرنے پر زور دیا تھا۔(26)

مرزا محمود احمد لکھتے ہیں کہ خواجہ کمال الدین نے غیر احمدیوں سے روابط بڑھائے، وہ شہرت پسند تھے، اپنے لیکچروں میں مسیح موعود کا ذکر نہ کرتے تھے اس طرح غیر احمدیوں میں مقبول ہونے لگے۔ ان کے سامعین کی تعداد ہزاروں میں ہوگئی جوان کی بات سننا چاہتے تھے۔ وہ اپنے لیکچروں کا دائرہ وسیع کرنے لگے، غیر احمدیوں نے ان کی تعریف کی اور ہر طرف سے انہیں دعوت نامے آنے لگے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مرزا محمود نے احمدیت اور مرزا صاحب کی نبوت اور مسلمانوں سے علیحدگی پر مبنی عقائد کی بنیاد پر ایک سلسلہ تقاریر جاری کیا۔ انہوں نے لکھنو، بنارس وغیرہ میں لیکچر دیئے جن کو پسند نہ کیا گیا اور جلد ہی انہیں یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا، اس کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔(27)

خواجہ کمال الدین کہتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان اور انگلستان میں جو تبلیغ کی وہ حکیم نورالدین کے کہنے کے عین مطابق تھی۔ حکیم صاحب نے ان کی لندن روانگی 1912ء اور قیام لندن کے دوران انہیں جو خطوط لکھے ان میں انہوں نے حکم دیا کہ ''بجز لا الہٰ الا اللہ کے وہاں کچھ تلقین نہ کرنا لا الہٰ الا اللہ کی تعلیم اور محمد رسولؐ اور کلمات اذان اور ان کی تعلیم دیں۔''(28)

اگرچہ بعض لوگوں نے شور مچایا کہ خواجہ کمال الدین مرزا صاحب کا نام اپنی تبلیغ میں نہیں لیتا اس کا کسی غیر مسلم کو مسلمان کرنا بے سود ہے لیکن حکیم صاحب غیر احمدیوں کی تکفیر کو برا جانتے تھے اور ہندوستان کے باہر غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت دیتے تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو ایک خط اور تار میں اس کی اجازت دی ان کے خط کی تاریخ دسمبر 1913ء ہے یعنی وفات (13 مارچ 1914ء) سے تین ماہ پہلے تک ان کا یہ حکم تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1913ء میں جب چوہدری ظفر اللہ لندن میں زیر تعلیم تھے تو انہوں نے ایک غیر احمدی مسلمان کے پیچھے نماز پڑھی۔ پیغام صلح لاہور نے 17 مئی 1941ء کو جب یہ واقعہ شائع کیا تو انہوں نے قادیانی انداز کے مطابق اس کی تاویلات پیش کرنی شروع کر دیں۔(29)

26 دسمبر 1913ء کو جب آئرلینڈ کا ایک امیر لارڈ ہیڈلے مسلمان ہوا تو زمیندار لاہور نے

خواجہ کمال الدین کی ایک نظم شائع کی جس میں مسلمانوں کو اختلافات ختم کرنے کی تلقین تھی۔ لندن میں مقیم مسلم لیگ کے صدر سید امیر علی اور سکریٹری مرزا عباس بیگ نے ووکنگ مشن کے پروگرام کی تکمیل میں مدد دینے کا وعدہ کیا اور 150 پونڈ چندہ دیا۔ مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر ووکنگ مشن کی تبلیغی سرگرمیوں کو پسند کرتے تھے اور خواجہ کمال الدین کی قدر کرتے تھے۔(30)

ووکنگ مشن

خواجہ کمال الدین حکیم صاحب کے زمانے میں 1912ء میں بمبئی کے ایک سرمایہ دار کے قانونی مسئلہ کے حل کے لئے انگلستان گئے۔ ووکنگ (سرے) میں جو لندن سے 24 میل کے فاصلے پر ہے بیگم بھوپال کی مالی امداد سے ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی، انہوں نے سید امیر علی سے مل کر اس کا چارج سنبھال لیا۔ خواجہ صاحب کو جلد شہرت حاصل ہوگئی کیونکہ مرزا محمود کے کہنے کے مطابق انہوں نے نومسلموں کو اسلام کا جو نقشہ پیش کیا تھا وہ وہی تھا جو مسیح موعود کے سخت مخالفین مولوی محمد حسین بٹالوی اور مولوی ثناءاللہ امرتسری کا پیش کردہ تھا(31)

1913ء میں لاہور سے پیغام صلح نامی اخبار نکالا گیا جو بعد میں لاہور جماعت کا آرگن بنا اس کے جواب میں قادیان سے مرزا محمود نے الفضل کا اجراء کیا۔ پیغام صلح لاہور نے مرزا صاحب کی نبوت، مسلمانوں کی تکفیر جیسے مسائل پر مصالحانہ اور نرم رویہ اختیار کیا اور مسلمانوں کی سیاسی جدو جہد کی حمایت کی جب کہ الفضل نے مسلمانوں کی تحریکاتِ آزادی کی مخالفت کی اور انگریز کا بھر پور ساتھ دیا۔

اگست 1913ء میں کانپور میں سڑک نکالنے کے لئے انگریز حکام نے مسجد کے ایک حصے کو شہید کر دیا اس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا اور گرفتاریاں دیں۔ مولوی محمد علی نے پیغام صلح لاہور میں مسلمانوں کے موقف کی بھر پور حمایت میں تین مضامین لکھے۔ ایسے ہی جب حکومت نے 17 اکتوبر 1914ء کو مولانا ظفر علی خان کو ضلع بدری کا نوٹس دیا تو پیغام صلح لاہور شاید ہندوستان کا پہلا اخبار تھا جس نے مولانا کی حمایت میں مضمون لکھا۔(32)

مئی 1915ء میں اخبار پیغام صلح نے علی برادران کے حق میں مضامین شائع کئے اور مسئلہ خلافت پر مسلمانوں کے سیاسی موقف کی حمایت کی۔ لاہور جماعت کے افراد خواجہ کمال الدین، مولوی محمد علی، ڈاکٹر بشارت احمد، مرزا یعقوب بیگ مسلم انجمنوں کے اجلاس میں شامل ہوتے اور مسلمانوں سے روابط بڑھاتے تھے۔ وہ علامہ اقبال سے خاص طور پر ملاقاتیں کرتے تھے ایک تو ان میں سے بعض لوگوں کا تعلق سیالکوٹ سے تھا اور علامہ اقبال سے ان کی پرانی شناسائی تھی دوسرے ان کی مذہبی پالیسی اور مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی حمایت کے باعث علامہ اقبال ان سے میل جول رکھنے کو برا نہ جانتے تھے۔ جماعت قادیان میں سے بہت کم لوگوں کے ساتھ ان کے شخصی تعلقات رہے۔

اس عہد کا ذکر عبدالمجید سالک نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس وقت سر محمد شفیع مسلمانوں کے لیڈر تھے اور عام جلسوں کی صدارت وہی کرتے تھے۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب، مولوی محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین علامہ اقبال کے دوست اور مداح تھے اور ان کو مسلمانوں کی قیادت کا حق دار سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے علامہ کا نام ایک جلسے کی صدارت کے لئے تجویز کیا۔'' (33)

ان حالات میں علامہ اقبال کا لاہور جماعت کے جلسوں میں جانا، تقریر کرنا اور تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لینا قابل اعتراض نہیں قرار دیا جا سکتا جب کہ وہ (لاہوری احمدی) مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی جدوجہد اور خالصتاً تبلیغ اسلام کی مساعی میں ان کے حامی اور ہمدرد تھے اور مرزا صاحب کے دعاوی کا کسی طرح سے کوئی پرچار نہ کیا جاتا تھا۔

قادیانی فرقہ: ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' 1910ء

1910ء میں علامہ اقبال نے علی گڑھ یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں انگریزی زبان میں ایک فکر انگیز مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا The Muslim Community-A Sociological Study۔ اس میں انہوں نے برصغیر میں اسلام کے مستقبل، تعلیمی ترقی اور بعض تہذیبی مسائل پر سیر

حاصل بحث کی اور ان مسائل وحالات کی نشاندہی کی جوقوم کے اتحاد وترقی کی راہ میں حائل تھے۔
اس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے کیا۔ اس مقالے میں وہ فرماتے ہیں:

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہم اپنی قومی زندگی میں تسلسل پیدا کریں تو ہمیں اس نوع کا کردار پیدا کرنا ہوگا جو ہر قیمت پر مستقل رہتا ہے اور جب کہ وہ آمادگی کے ساتھ دیگر انواع میں جو اچھی چیزیں ہیں انہیں قبول کرلے اور یہ اپنی زندگی سے احتیاط کے ساتھ ہر شے کو خارج کردے جو اس کی محبوب روایات اور اس کے اداروں کے مخالف ہے ہند میں مسلم فرقے کے ایک محتاط مشاہدے سے یہ نکتہ ظاہر ہو جائے گا جس پر فرقے کے اخلاقی تجربے کے مختلف خطوط مرتکز ہونے والے ہیں۔ پنجاب میں مسلم نوع کے کردار نے نام نہاد قادیانی فرقے میں ایک طاقت ور اظہار پایا ہے جب کہ یوپی میں قدرے مختلف دانشورانہ ماحول کے باعث اس نوع کے کردار کی ضرورت کا ایک عظیم شاعرانہ آواز میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا جارہا ہے۔ اپنے مزاحیہ انداز میں مولانا اکبرالہ بادی نے جنہیں لسان العصر کا نام دیا گیا ہے ان قوتوں کی نوعیت کا نہایت گہرا ادراک کیا ہے۔(34)

اس کا اصل انگریزی متن اگلے صفحے پر درج ہے اس میں لفظ So-called کا مولانا ظفر علی خاں نے ترجمہ نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔(35)

ہم نے نام نہاد کی جگہ اس کا ترجمہ جس کو عام طور پر قادیانی فرقہ کہتے ہیں کیا ہے۔ علامہ اقبال کا ان سطور کے لکھنے سے یہ مطلب نہ تھا کہ ہے تو یہ مسلمان احمدی فرقہ لیکن لوگ اسے قادیانی فرقہ کہتے ہیں اس لئے انہوں نے نام نہاد قادیانی فرقہ کہا بلکہ اس پیراگراف کے پورے متن اور آئندہ کی سطور پر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جسے عام طور پر قادیانی فرقہ کہا جاتا ہے۔

افکار اقبال میں ڈاکٹر محمد ریاض نے یہ ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

پنجاب میں بنیادی طور پر مسلم طرز کے کردار کا زور دار ظہور قادیانی نام کے فرقے میں ہوا ہے۔(36)

سید عبدالواحد معینی نے مقالات اقبال میں اس جملے کے ترجمے کو حذف کر دیا ہے اور بعض اور محققین و مترجمین اقبالیات نے بھی ایسا ہی کیا ہے جو ہمارے نزدیک درست نہیں۔ تو کیا 1910ء میں حکیم نورالدین کے زمانے میں قادیانی مسلم کردار کی نمائندگی کرتے تھے؟ اس کا جواب گذشتہ صفحات میں بیان کی گئی حکیم نورالدین کی مسلمانوں سے اتحاد و تعاون پر مبنی پالیسی کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عام تاثر یہی تھا اور یہی بات علامہ اقبال نے کہی۔

1935ء میں علامہ اقبال کے قادیانیت کے بارے میں مضامین کی اشاعت کے بعد قادیانی پرچے سن رائز نے علامہ اقبال کی علی گڑھ کی تقریر کے حوالے سے ان پر تناقض خود inconsistency کا الزام لگایا تو انہوں نے جواب میں کہا ''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ ہی اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے 1911ء یا اس سے قبل یہ تقریر کی تھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی...... لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے اسے برسوں چاہئیں''۔

اقبال نے کہا ''ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت، بانی اسلام ﷺ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے''۔ (حرف اقبال ص:112)

یہ تو قادیانی اعتراض کا ایک جواب تھا۔ دوسرے علامہ اقبال اپنے پرانے کاغذات دیکھ رہے تھے تو ان کو علی گڑھ والی تقریر کا مسودہ مل گیا۔ اس پر انہوں نے ایک شذرہ لکھا جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ (37)

یہ خطبہ 1911ء میں علی گڑھ میں دیا گیا تھا۔ اس خطبے میں قادیانیوں کے متعلق تبصرہ 1911ء سے اس تحریک کے حقیقی عزائم کی پردہ دری کی روشنی میں نظر ثانی کا محتاج ہے۔ قادیانی ابھی تک اپنے ظاہر میں تو مسلمانوں ہی کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل وہ ظاہر داری کے معاملات میں بڑے باریک بین ہیں اور جزئیات کا خیال رکھنے والے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کی روح، جیسا کہ بارہا اس کا اظہار ہوا اسلام کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ قادیانی بظاہر تو مسلمان نظر آتے ہیں اور ایسا نظر آنے کے لیے بے چین بھی رہتے ہیں لیکن اندر سے ان کی ذہنیت کلی طور پر مجوسی ہے غالب امکان یہ ہے کہ انجام کار یہ تحریک بہائیت میں اختتام پذیر ہو جائے گی جہاں سے یہ اصلاً اثر پذیر ہوتے ہوئے نمودار ہوئی تھی۔ (محمد اقبال 21 اکتوبر 1935ء)(38)

اس سے ثابت ہوا کہ علامہ اقبال نے 24 سال بعد 1935 میں اپنی رائے کی خود تصحیح کر دی اس لئے اس عبارت کو پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا دوسرے اس کی ذمہ داری حکیم نورالدین اور احمدیہ جماعت پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے مسلک اور عقائد کی شدت کو کم کر کے مسلمانوں سے صلح اور تعاون کی پالیسی پر عمل کیا۔ اگر اس وقت احمدیہ جماعت کا وہ مسلک ہوتا جو 1914ء کے بعد قادیان جماعت اور اس کے سربراہ مرزا محمود نے اختیار کیا اور ان کی مرزا صاحب کی نبوت، تکفیرِ مسلمین اور دیگر مسائل پر اختیار کی گئی پالیسی میں کوئی نرمی اور لچک نہ ہوتی تو پھر علامہ اقبال کی یہ رائے قابل اعتراض ہو سکتی تھی کہ وہ ایسی اسلام دشمن جماعت کے لئے ایسے الفاظ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟

لاہوری جماعت کے مناظر اختر حسین گیلانی لکھتے ہیں 'علامہ اقبال کا علی گڑھ کو یہ مشورہ دینا کہ اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ دیکھنا ہو تو قادیان میں ملے گا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال خود اس نمونے سے شدت سے متاثر تھے۔ علامہ کے اس بیان سے علی گڑھ میں کوئی اضطراب نمودار نہ ہوا بلکہ سب نے اس بیان کو اطمنان سے سنا جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں بالعموم تحریک احمدیت کو نہایت منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور حق تو یہ ہے

کہ اگر علامہ اقبال کو ذرا بھی خیال ہوتا کہ علی گڑھ کو ایسا مشورہ دینے سے اضطراب پیدا ہوگا تو وہ قطعاً ایسی بات زبان پر نہ لاتے۔ ان کا ایسا مشورہ دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خود بھی خوب جانتے تھے کہ عام طور پر تحریک احمدیت کے متعلق مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات ایسے ہی ہیں اس لئے انہوں نے ایسا بیان دے کر درحقیقت اصحاب علی گڑھ کے خیالات کی ترجمانی کر دی۔ آج کل (1944ء) اگر کوئی مسلمان رہنما اس قسم کی رائے کا اظہار کرے تو معلوم نہیں اس کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت مولانا نورالدین صاحب کے زمانہ میں جماعت احمدیہ کی مخالفت دب چکی تھی اور قبولیت عامہ کا شاندار دور روز افزوں ترقی پر تھا'۔(39)

علامہ اقبال کی لاہوری جماعت کے ایک جلسے میں شرکت نومبر 1913ء

23 نومبر 1913ء کو مسلمانان لاہور کا ایک جلسہ عام احمدیہ بلڈنگس لاہور میں منعقد ہوا چونکہ لاہور جماعت کا اخبار پیغام صلح مسلمانوں کی ملی تحریکات اور ان کے آزادی پسندانہ جذبات کی ترجمانی کرتا رہتا تھا اس لئے وہ ایسے جلسے منعقد کر کے ان میں مسلمانوں کو شرکت کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ ان میں کسی اختلافی امر پر گفتگو نہ ہوتی تھی۔ اس جلسے میں ووکنگ مشن کے سربراہ خواجہ کمال الدین کی ایک چھٹی پڑھ کر سنائی گئی۔

جلسے میں علامہ اقبال نے بھی تقریر کی۔ اسلام کی تبلیغ پر زور دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کام کو سب سے پہلے خواجہ کمال الدین نے پہچانا اور ہر قسم کے دنیاوی مفاد قربان کر کے یہ عظیم الشان کام اپنے ذمہ لیا اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی دامے درمے ہر قسم کی امداد میں پہلو تہی نہ کریں اور اس نیک کام میں احمدیت و غیر احمدیت کے سوال کو نہ آنے دیں کیونکہ ہمارا خدا ہمارا رسولؐ اور ہماری کتاب ایک ہے۔ پیغام صلح نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ یہ تقریر ہر پہلو سے قابل داد تھی اور اول سے آخر تک ہمدردیِ اسلام میں رنگی ہوئی تھی۔

بعد ازاں ووکنگ مشن کے لئے تمام مسلمانان ہند سے چندہ حاصل کرنے کی ایک تحریک کے لئے ریزولیوشن پاس کیا گیا اور ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کے ممبروں میں دو غیر احمدی(40) اور

پانچ لاہوری احمدی تھے۔(41) دو لاہوری احمدی، شیخ رحمت اللہ اور مرزا یعقوب بیگ جائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔

خواجہ کمال الدین جس انداز سے لندن میں احمدیت کو ایک طرف رکھ کر محض اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے اور عیسائیت اور دیگر مذاہب کے افراد کے اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب دے رہے تھے اس کی روشنی میں اور اس وقت کے حالات کے تحت علامہ اقبال کی تقریر حقیقت پسندانہ تھی۔ ووکنگ مشن کے رسالہ اسلامک ریویو کے فائل اس بات کے گواہ ہیں کہ ان میں صرف اسلام کی صداقت کے مضامین شائع ہوتے تھے اس لئے علامہ اقبال نے ان تبلیغی مساعی میں لاہوریوں کا ساتھ دیا۔ مرزا محمود احمد نے خواجہ صاحب کی جاسوسی کرنے کے لئے اپنے خاص حواری فتح محمد سیال کو انگلستان روانہ کیا جو اپنے منفی طرزِ عمل اور سازشی کردار کے باعث وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔

علامہ اقبال نے لاہور جماعت کی تبلیغ اسلام کی کاوشوں میں اعانت کی اور ووکنگ مشن کی مالی امداد کے لئے جماعت نے جو ٹرسٹ قائم کیا اس کے ایک ممبر کے طور پر مختصر عرصے کے لئے کام کیا۔ ووکنگ مشن کے ساتھ اختلاف عقائد سے قطع نظر مسلمانوں نے لاہوریوں کو مالی امداد مہیا کی جس کی ایک وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ یاس اور بے دلی کی اس فضا میں جو بہ سبب زوال و انحطاط عالم اسلام پر طاری تھی مسلمانوں کو اپنے تحفظ و استحکام کی کوششوں میں ایک راہ عمل یہ بھی نظر آئی اگر اہل یورپ نے اسلام قبول کر لیا تو ان کی شکست فتح مندی میں بدل جائے گی۔(42)

جماعت احمدیہ کے اختلاف میں علامہ اقبال کو ملوث کرنے کی کوشش 1915ء

مارچ 1914ء کے بعد قادیانی۔ لاہوری تنازعہ شدت اختیار کر گیا۔ قادیان جماعت مرزا محمود کو خلیفہ مانتی تھی لیکن لاہور جماعت ان کی سخت مخالف تھی۔ نبوتِ مرزا، تکفیرِ مسلمین وغیرہ پر ان کے باہمی اختلافات تھے 19 اکتوبر 1915ء کو الفضل قادیان میں سید انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کی ایک تحریر شائع ہوئی جس کا عنوان تھا ''جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلافِ جماعتِ احمدیہ کے بارے میں'' انعام اللہ سیالکوٹی سیالکوٹ چونگی میں ملازم تھے، پہلے جماعت لاہور کا ساتھ دیا پھر

الگ ہو گئے۔ وہ ظفر اللہ کے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے ان کا ذکر اپنی خود نوشت سوانح تحدیث نعمت میں بھی کیا ہے۔ انعام اللہ نے اپنے اور علامہ اقبال کے ایک مشترکہ دوست سید بشیر احمد کے حوالے سے لکھا کہ علامہ اقبال جماعتِ قادیان کو حق پر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ لاہور جماعت کے بعض افراد اور ان کے کئی مسلم احباب نے ذاتی ملاقاتوں میں اور خطوط لکھ کر اس بات کی وضاحت چاہی۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے ایڈیٹر پیغام صلح لاہور کو ایک خط لکھا جس سے ان کا ختم نبوت پر پختہ ایمان ظاہر ہوتا ہے۔(43) یہ خط سامنے صفحے پر درج ہے۔

علامہ اقبال کے اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی نبوت کو ختم سمجھتے تھے اور قادیان یا لاہور جماعت کے مذہبی اختلاف میں کسی جماعت کے طرفدار نہ تھے اور نہ ہی مرزا صاحب کی نبوت اور احمدیت کی سچائی پر کسی طرح کا یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے جس کتاب حقیقت النبوۃ کا ذکر کیا ہے اور بہ لحاظ ترتیب اس کی تعریف کی ہے وہ مرزا محمود احمد کی اختلافِ سلسلہ کے ایک سال بعد مارچ 1915ء میں اللہ بخش سٹیم پریس قادیان سے شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے مختلف پیرایوں میں مرزا صاحب کو حقیقی نبی ثابت کیا ہے۔ انہوں نے قدیم نوشتوں، قرانی آیات، مرزا صاحب کی وحی، ان کی تحریرات اور دیگر عقلی و نقلی دلائل سے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا صاحب ویسے ہی نبی تھے جیسے حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ ہیں۔ خدا کی وحی میں ان کے لئے مطلق نبی و رسول کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان کا منکر پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس کے جواب میں مولوی محمد علی نے النبوۃ فی الاسلام تالیف کی جو 1917ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں مسئلہ ختم نبوت پر عمدہ بحث ہے اور قادیانیوں کے موقف کی تردید ہے۔ ان کی اس مسئلہ پر ایک اور کتاب آخری نبی ہے۔

ختم نبوت پر کامل ایمان اور ختم نبوت کے متعلق علامہ اقبال کا عقیدہ ان کے ایک مضمون میں مذکور ہے جو رسالہ لمعات میں شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں ''جو شخص نبی کریمؐ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی

یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔(44)

ان تحریرات سے عیاں ہے کہ علامہ اقبال کا ختم نبوت پر غیر متزلزل ایمان تھا اور اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے البتہ قادیانیوں یا لاہوریوں کے ساتھ کسی بحث مباحثے یا مناظرے میں نہ الجھے کیونکہ اس کو وہ طبعاً ناپسند کرتے تھے اور اسے تضیع اوقات سمجھتے تھے۔

اختر حسین گیلانی لکھتے ہیں:

'علامہ اقبال کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ نہ تو حضرت مرزا صاحب نے دعویٰ نبوت کا کیا اور نہ ہی غیر از جماعت مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے اور یہی مسلک جماعت احمدیہ لاہور کا ہے۔

اگر سر محمد اقبال کو ذرا بھی خیال ہوتا کہ بانی تحریک احمدیت نے دعویٰ نبوت کیا ہے اور مخالف مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے تو ناممکن تھا کہ وہ خطبہ علی گڑھ میں تحریک احمدیت کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' قرار دے کر اس کی توصیف کرتے۔آپ کی یہ تقریر یہی ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو یقین تھا کہ حضرت مرزا صاحب نہ مدعی نبوت ہیں نہ اپنے منکر کو کافر کہتے ہیں اور نہ غیر اسلامی، مجوسی، اسرائیلی یا آریائی تصوف کے حامل ہیں۔علامہ اقبال کا یہ یقین اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جب مرزا محمود احمد صاحب نے 1914ء میں اپنی خلافت کے ساتھ مسیح موعود کی نبوت اور مسلمانوں کی تکفیر کا اعلان کیا تو علامہ اقبال نے بیان بھی نہایت محفوظ الفاظ میں دیا کہ:

''جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہے تو وہ خارج از اسلام ہے اگر قادیانی جماعت کا بھی یہ عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے''۔

گویا علامہ اقبال جانتے تھے کہ حضرت مرزا صاحب نے نبی کا لفظ اپنی تحریرات میں استعمال کیا ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ اس نبوت پر ایمان نہ لانے والے اسلام سے خارج ہیں اور علامہ کے نزدیک اگر کوئی شخص ایسے نبی کی آمد کا قائل ہو تو جس کا انکار مستلزم کفر نہیں تو وہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔اسلام سے صرف اس وقت خارج ہوتا ہے جب کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہے''۔

اس بیان میں علامہ اقبال بانی تحریک احمدیت اور جماعت احمدیہ لاہور کو کلیتاً مستثنیٰ کر دیتے ہیں'۔(45)

دراصل علامہ اقبال ان کو مستثنیٰ قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ تو ایک اصول اور عقیدہ بیان کر رہے تھے چونکہ لاہور جماعت نے اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی تھی اور مرزا صاحب کو مجدد اور ولی کامل کہتے تھے اور ان کی نبوت کو ولایت کا ایک اعلیٰ درجہ قرار دیتے تھے اس لئے اپنے تبدیل شدہ عقیدے کی رو سے اس زد میں نہ آنے کے دعویدار تھے۔ اگر مولوی محمد علی، ڈاکٹر بشارت احمد وغیرہ کے سابقہ عقائد کو دیکھا جائے تو وہ بھی اس زمرے میں آتے تھے لیکن اب انہوں نے اپنا عقیدہ بدل لیا تھا اس لئے وہ از خود اس دائرے سے نکل گئے۔ اس کے باوجود وہ غیر مسلم اقلیت قرر پائے اور مسلمانوں نے انہیں منافق کہا۔ علامہ اقبال نے بھی 1935ء میں دیئے گئے اپنے بیان میں کہا کہ احمدیت کے اصل عقائد اور اس کی اسلام سے بغاوت کی روح ترجمان جماعت احمدیہ قادیان ہے۔ (موجودہ جماعت احمدیہ ربوہ جماعت احمدیہ قادیان ہی کا تسلسل ہے۔ مصنف)

رموز بے خودی

مثنوی اسرار خودی (1915)ء کا دوسرا حصہ رموزِ بے خودی (مطبوعہ 1918ء) میں علامہ اقبال عقیدہ ختم نبوت کو صراحت سے بیان کرتے ہیں:

پس خدا برما شریعت ختم کرد
بر رسول ﷺ ما رسالت ختم کرد
لا نبی بعدی ز احسان خدا است
پردہ ناموس دین مصطفیٰ ﷺ است
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے

اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں

(اس عنوان سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے الفضل میں سید انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس کے جواب میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب حسب ذیل چٹھی ارسال فرماتے ہیں)

لاہور - ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۵ء

مخدومی ایڈیٹر صاحب پیغام صلح۔ السلام علیکم

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے الفضل میں سید انعام اللہ شاہ صاحب سیالکوٹی نے ایک تحریر بعنوان "جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں" شائع کرائی ہے۔ اس تحریر کے متعلق میرے اکثر احباب نے بذریعہ خطوط وغیرہ مجھ سے دریافت کیا ہے۔ فرداً فرداً جواب دینے سے قاصر ہوں، لہٰذا آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مندرجہ ذیل سطور کو اپنے اخبار میں جگہ دے کر مجھے ممنون فرمایئے۔

میرے بہت سے احباب سلسلہ احمدیہ کے ساتھ گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور جب کبھی مجھے سیالکوٹ جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو اکثر موقعے گفتگو کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ستمبر گذشتہ میں بھی جب میں سیالکوٹ میں تھا تو ایک سے زیادہ موقعے گفتگو کے پیدا ہوئے لیکن مجھے یہ یاد نہ آتا تھا کہ سید انعام اللہ صاحب کونسے موقعے گفتگو کا ذکر اپنی تحریر میں فرماتے ہیں۔ چونکہ ان کی تحریر میں سید بشیر احمد صاحب کی طرف اشارہ ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ سید صاحب موصوف کے سوال پر میں نے کہا کہ قادیانی جماعت حق پر ہے اور مجھے ہمدردی لاہوری والوں سے ہے اس واسطے اپنے حافظہ پر اعتبار نہ کر کے میں نے خود بشیر احمد صاحب موصوف کو خط لکھا کہ جس کا وہ حصہ جو اس بحث سے متعلق ہے۔ ذیل میں درج کرتا ہوں۔ تاکہ میرے احباب کو اصل کیفیت سے آگاہی ہو جائے۔

"جمشید پور - ۲۰ اکتوبر

برادر مکرم و معظم سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ابھی آپ کا خط ملا۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں جب آپ سیالکوٹ تشریف فرما تھے۔ تو میں بھی وہیں تھا۔ آپ کے وقت کو سید انعام اللہ میرے ہمراہ گیا تھا۔ اور وہ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں حسب عادت کرتا رہا تھا۔ کوئی ایسے سوال و جواب کئے ہوں مجھے یاد نہیں ہیں۔ قادیان پارٹی اور لاہور پارٹی کا وہ ذکر کرتا رہا۔ گفتگو البتہ مجھے یاد نہیں کہ کیا تھی۔ ہاں میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوئی سوال آپ سے نہیں کیا تھا۔ سید انعام اللہ صاحب سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ وہ عادتاً مبالغہ آمیز باتیں کرنے کا عادی ہے۔ پوری گفتگو نہ کبھی اس کی کسی نے لکھی ہے اور نہ ہی وہ خود بیچارہ لکھ سکتا ہے۔ ایک فقرہ سے کئی نتائج اخذ کیا کرتے ہیں۔ انہیں معذور رکھنا چاہیئے۔"

افسوس ہے کہ سید انعام اللہ صاحب نے میرے الفاظ کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ ایک شخص جو کسی خاص فریق سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ قدرتی طور پر اوروں کی گفتگو سے وہی الفاظ و مطلب یاد رکھتا ہے۔ جو اس کے مفید مطلب ہوں، اور سیاق الفاظ فراموش کر جاتا ہے۔ اتنی بات صحیح ہے کہ میں نے کتاب حقیقت النبوۃ کی بلحاظ اس کی ترتیب کے تعریف کی تھی۔ مگر اس کے دلائل پر رائے دینے کا مجھے حق حاصل نہیں۔ کیونکہ اختلاف سلسلہ احمدیہ کے متعلق وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ صلعم کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ "عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔"

محمد اقبال لاہور

(پیغام صلح ۲۵ر نومبر ۱۹۱۵ء)

ماہنامہ روح اسلام لاہور دسمبر 1968

باب 4:

حوالے وحواشی

(1) ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، روایات اقبال، مجلس ترقی ادب لاہور، ص:30

(2) اکبر شاہ نجیب آبادی، حیات نور الدین، لاہور، 1966ء، ص:140

(3) شیخ یعقوب علی عرفانی، حیات احمد، جلد دوم ص:423

(4) ینگ مین احمدیہ ایسوسی ایشن لاہور نور الدین اعظم ص 1

(A-4) حکیم نور الدین کے علاوہ بعض مفسرین نے بھی بائبل کی روایت کی بنیاد پر لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں فرعون مصر کا بادشاہ تھا۔ قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کے ہم عصر بادشاہ کو ''فرعون'' کے نام سے یاد نہیں کرتا اور مصریات کے جدید محققین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہم عصر مصری بادشاہ فرعون نہیں تھا۔ اس کا تعلق ''عمالقہ'' سے تھا جب کہ فرعون قبطی النسل تھے۔

(5) ڈاکٹر سلیم اختر، علامہ اقبال حیات فکر و فن سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2003 مقالہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اقبال کی موعودہ تصانیف ص 224

(6) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 58

(7) زندہ رود ص 576

(8) بیگم رشیدہ اقبال، علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال، فیروز سنز کراچی 1999ء ص 82 پر لکھتی ہیں کہ یہ خطوط علامہ اقبال کی چھوٹی بہن کریمہ بی بی کی کارستانی تھی۔

(9) عبدالمجید سالک کے والد محترم اور بھائی قادیانی تھے شورش کاشمیری نے ان کی کتاب ذکر اقبال کی روایات اور ان کی قادیان نوازی پر تنقید کی ہے۔ (اقبالی مجرم مکتبہ چٹان، لاہور، 1974ء ص ص: 23 تا 37) سالک صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ وہ احمدی نہیں لیکن وہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیروؤں کو کافر نہیں سمجھتے۔ (نوازش نامے مرتبہ سید انیس شاہ جیلانی صفحہ 16)

(10) یہ حکیم نور الدین صاحب کا عجیب وغریب القا ہے کہ سورہ قلم کی آیت نمبر 44 کے الفاظ کو آگے پیچھے کر کے لکھ دیا ہے جس کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔

(11) شیخ عبدالماجد تبدیلی کے بعد بریکٹ میں لکھتے ہیں (نقل مطابق اصل) فکر اقبال اور تحریک احمدیہ' ص 60

(12) ایضاً

(13) شیخ عبدالماجد اقبال اور احمدیت ص 55 نیز زندہ رود جلد سوم ص 572

(14) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ص 212-216 نیز زندہ رود حصہ دوم ص 152

(15) ایضاً

(16) اخبار الحکم، 26 مارچ 1908ء

(17) ملک صلاح الدین اصحاب احمد جلد 11 ص: 276

(18) بیگم رشیدہ آفتاب اقبال، علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب اقبال، فیروز سنز کراچی اگست 1999ء ص 138

(19) بیگم رشیدہ آفتاب اقبال، حوالہ سابق۔ 1999ء ص: 131 اور ص: 133۔ نیز ایک قادیانی بزرگ نے مصنف کو بتایا کہ آفتاب اقبال نے اپنے ایک دوست سے ایک بے تکلفانہ ملاقات میں کہا کہ قادیانی اساتذہ ان کو تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ کبھی کہتے کہ استخارہ کرو مرزا صاحب کی صداقت تم پر کھل جائے گی، کبھی لٹریچر پڑھنے کو دیتے اور کہتے کہ اس سے تمہیں شرح صدر حاصل ہو گا، کبھی کہتے تمھارا تایا شیخ عطا محمد بھی تو احمدی ہے تم کیوں نہیں بیعت کر لیتے، کبھی ان کے ہم جماعتوں کے ذریعے بیعت فارم پر کرنے کے لئے بھجواتے، لیکن اپنے نانا حافظ ڈاکٹر عطا محمد کی تصوف کے ایک سلسلے میں بیعت اور بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے انہوں نے احمدیت قبول نہ کی اور ہر قسم کا لالچ ٹھکرا دیا، مسلمان ان کو قادیانی کہتے رہے لیکن کسی قادیانی نے ان کو قادیانی نہیں کہا۔

خواجہ نور کاشمیری، سابق ڈپٹی کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان اسلام آباد نے بھی مصنف کو بتایا کہ آفتاب اقبال نے ان سے ایک ملاقات میں کہا کہ انہوں نے کبھی بھی قادیانی مذہب اختیار نہ کیا اور وہ قادیانیوں کو گمراہ اور خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔

(20) اخبار بدر 27 اکتوبر 1910ء

(21) قادیانی عقائد کے سلسلے میں دیکھیں حوالہ نمبر 38

(22) خواجہ کمال الدین، مجدد کامل، مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل برانڈرتھ روڈ لاہور دسمبر 1930ء ص 40

(23) مجدد کامل ص 38

(24) اس کا عنوان تھا مسلمان وہ ہے جو سب ماموروں کو مانے۔ یہ مضمون ماہنامہ تشحیذ الاذہان، قادیان، اپریل 1911ء میں شائع ہوا

(25) مجدد کامل ص39

(26) Mirza Mahmud Ahmed, The Truth About Split, Ahmadiyya Foreign Mission Rabwah, 1965, P. 239

(27) Ibid. P. 261

(28) خواجہ کمال الدین، اختلافات سلسلہ احمدیہ کے اسباب، لاہور دسمبر 1914ء، ص:26

(29) پیغام صلح لاہور، 17 مئی 1941ء

(30) Lavan Spencer, Ahmadiyya Movement, Delhi, 1974, P. 126

(31) The Truth About Split, P. 267

(32) Spencer, op. cit. pp. 126-128

(33) ذکر اقبال، بزم اقبال 1955 ص 57

(34) علامہ اقبال کی تحریریں، تقریریں اور بیانات، مترجم اقبال احمد صدیقی، اقبال اکادمی پاکستان، ص148

(35) ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مرغوب ایجنسی لاہور 1919ء

(36) ڈاکٹر محمد ریاض، افکار اقبال، ص:64

(37) ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ از علامہ اقبال، مترجم شاہد اقبال کامران، ص:15

(38) احمدیت کی بہائیت سے خوشہ چینی کرنے کے متعلق بہت سا لٹریچر شائع ہو چکا ہے۔ امرتسر کے مولانا محمد عالم آسیؒ نے اپنی کتاب الکاویہ علی الغاویہ میں اس کو ثابت کیا ہے۔

پنجاب کے ایک مسلمان محقق نے اپنے قلمی نام فونکس سے ایک کتاب ہزہولی نس (1935ء) میں قادیانیت اور بہائیت کی باہمی مماثلت کا ذکر کیا ہے۔ ان کی کتاب میں یہ باب علامہ اقبال کے ایماء پر شامل کیا گیا۔ علامہ اقبال نے 1932ء میں جاوید نامہ ص235 میں کہا کہ بہاء اللہ نے حج منسوخ کر دیا اور مرزا غلام احمد نے جہاد حرام قرار دیا۔

راقم کی کتاب بہائیت، اسرائیل کی خفیہ سیاسی تنظیم، اسلامک سٹڈی فورم، راولپنڈی میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ احمدیت کے فکری سوتے بابیت اور بہائیت سے پھوٹے اور احمدیت بہائیت کا ہندی ایڈیشن ہے۔

اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ کتاب دین بہائی اور احمدیت سید محمد علی شاہ نے 2001ء میں شائع کی۔ یہ بہائی پبلشنگ ٹرسٹ کراچی کی پیش کش ہے۔ اس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ قادیانیت نے بہائیت سے

ایک بڑا حصہ مستعار لیا ہے۔

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور نے اپنی تصنیف تحریک احمدیت میں مرزا محمود کے معتقدات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ یا تو جماعت احمدیہ (قادیان) مرزا صاحب کو نبی ماننے اور تکفیرِ مسلمین کے عقائد سے رجوع کرلے گی یا اس کے تعلقات مسلمانوں سے ایسے رہ جائیں گے جیسے بابیوں اور بہائیوں سے ہیں۔ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں:

'ہاں یہ سچ ہے کہ حضرت مسیح موعود کے پیرووں میں سے ایک گروہ یعنی جماعت قادیان نے حضرت مرزا صاحب کو مدعی نبوت قرار دیا ہے لیکن ابھی تک وہ درمیانی حالت میں ہیں۔ اگر چہ اس نبوت کے نتیجہ کے طور پر انہوں نے روئے زمین کے کل مسلمانوں کو کافر کہا ہے مگر ابھی تک کوئی نیا کلمہ اپنے لئے تجویز نہیں کیا یعنی عقیدتاً وہ یوں تو مانتے ہیں کہ کوئی شخص جب تک حضرت مرزا صاحب پر ایمان لا کر آپ کی بیعت نہ کرے اس وقت تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا مگر کوئی اپنا الگ کلمہ بنانے سے انکار کرتے ہیں اور کلمہ لا الہٰ الّا اللہ محمدٌ رسول اللہ کا ہی اقرار کرتے ہیں۔ یہ ایک درمیانی اور تذبذب کی حالت ہے اور بالآخر وہ حضرت مسیح موعود کی نبوت کے عقیدہ سے رجوع کریں گے یا اپنا الگ کلمہ اور الگ مذہب بنالیں گے کیونکہ ان کے اس عقیدہ کا کہ جو شخص حضرت مرزا صاحب کو نبی قرار دے کر ان پر ایمان نہیں لاتا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے یہ لازمی نتیجہ ہے کہ کلمہ لا الہٰ الّا اللہ محمدٌ رسول اللہ منسوخ ہے۔ جب اس کلمہ کے اقرار سے کوئی شخص دائرہ اسلام میں ہی داخل نہیں ہوتا بلکہ چالیس کروڑ (اب ایک ارب) مسلمان جو اس وقت اس کلمہ کا اقرار کرتے ہیں وہ بھی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتے ہیں تو اس کلمہ کو لازماً منسوخ کہنا پڑے گا اور جس نبی پر ایمان لانے سے لوگ اب دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں اس کی رسالت اور نبوت کا اقرار توحید کے ساتھ کلمہ کا لازمی جزو قرار پائے گا اور اگر حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنے سے رجوع نہ کیا گیا تو کل کو اس بنیاد پر یقیناً ان لوگوں کا الگ کلمہ اور الگ مذہب ہو جائیگا اور پھر ان کے تعلقات اسلام سے ایسے ہی رہ جائیں گے جیسے بابیوں یا بہائیوں کے ہیں کہ وہ اسلام کو اپنے وقت کا سچا مذہب مانتے ہیں مگر اس زمانہ کے لئے وہ بابی یا بہائی مذہب کو ہی سچا قرار دیتے اور اسلام اور اس کے کلمہ کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ اس وقت جماعت قادیان کا پاؤں دو کشتیوں میں ہے ایک طرف وہ چالیس کروڑ کلمہ گو کو کافر قرار دیتے ہیں اور لا الہٰ الّا اللہ محمدٌ رسول اللہ کے اقرار سے کسی کا مسلمان ہو جانا نہیں مانتے بلکہ باوجود اقرار کلمہ اسے کافر کا کافر ہی سمجھتے ہیں اور دوسری طرف اپنے آپ کو مسلمانوں میں بھی داخل کرتے ہیں اور اپنا الگ مذہب اور الگ کلمہ بنانے سے انکار کرتے ہیں۔ مگر یہ حالت بہت دیر تک نہیں رہ سکتی۔ یا تو اس عقیدہ کا گھنونا

پن ان کے کثیر حصہ کو بالآخر اس سے متنفر کر دیگا اور وہ حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنا
چھوڑ دیں گے اور یا جو اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ کلمہ لا الہٰ لا اللہ محمدؐ رسول اللہ منسوخ قرار پائے اور ایک
نیا کلمہ تجویز ہو اسے قبول کر لیں گے۔'' مولوی محمد علی تحریک احمدیت لاہور 1930 ،ص:170-172
مختلف ادوار میں کئی قادیانی بہائی ہوئے جن میں محفوظ الحق علمی نائب مدیر الفضل ، ماسٹر عبدالصمد، احمد علی
یزدانی، مہر محمد شہاب مالیر کوٹلوی، عبداللہ وکیل کشمیری اور ربوہ کے بعض افراد شامل ہیں۔
مندرجہ بالا حوالے قادیانیت کے متعلق علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کی صحت کو ثابت کرتے ہیں۔

(39) اختر حسین گیلانی تحریک احمدیت اور اقبال، احمدیہ انجمن لاہور 1944ء ص7

(40) علامہ اقبال، نواب محمد سلیم خان رئیس

(41) شیخ رحمت اللہ، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، ڈاکٹر سید محمد حسین، میاں چراغ دین اور مرزا سلطان احمد خان

(42) سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور ص5-6

(43) لاہور جماعت کا ماہنامہ روح اسلام لاہور دسمبر 1968 ص21-22

(44) الفضل قادیان 11 اپریل 1916ء مضمون از ڈاکٹر محمد اقبال مندرجہ رسالہ لمعات۔ علامہ اقبال کے اس مضمون یا بیان کی کاپی راقم کو دستیاب نہیں ہو سکی۔ ماہرین اقبالیات اس رسالے کا کھوج نکال کر پورا مضمون عوام کے سامنے لائیں۔ پروفیسر الیاس برنی نے اپنی کتاب قادیانی مذہب ص46 پر بھی یہ حوالہ دیا ہے۔

(45) اختر حسین گیلانی۔ تحریک احمدیت اور اقبال، انجمن احمدیہ لاہور، 1944ء ص16-17

باب 5

علامہ اقبال عملی سیاست میں

1926ء میں علامہ اقبال عملی سیاست میں آ گئے۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے کونسل میں محاصل، خصوصاً لگان کی تخفیف اور مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے مسائل کے حل کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرائی۔

1927ء میں برطانوی حکومت نے آئینی اصلاحات پر رپورٹ تیار کرنے کے لئے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ کمیشن کی آمد سے قبل سر فضل حسین نے علامہ اقبال کو ایک مسلم وفد کے سربراہ کے طور پر لندن جا کر ان کے وضع کردہ مسلم مطالبات سے سکریٹری آف سٹیٹ کو روشناس کرانے کی تجویز پیش کی۔ اس کے لئے مناسب فنڈ جمع کرنے کی ضرورت تھی علامہ اقبال نے اس بات سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس کا ذکر فضل حسین کے فرزند عظیم حسین نے ان کی سوانح حیات میں کیا ہے۔ اقبال کے انکار کے بعد سر فضل حسین نے چوہدری ظفر اللہ کو یہ کام سونپا اور وہ یہ وفد لے کر لندن گئے۔ اس سے قبل فضل حسین علامہ اقبال کو پنجاب کونسل میں پارٹی صدر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے یونی نسٹ پارٹی پر تنقید جاری رکھی اور اور ان کی جگہ سر شہاب الدین نے صدارت سنبھال لی۔ (1)

1927ء سے 1935ء کا زمانہ مسلمانوں کی تحریک آزادی میں اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف برطانوی حکومت سے اپنے سیاسی مطالبات منوانے کے لیے کوشاں تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی اور آئینی مطالبات رفتہ رفتہ تشکیل پاتے رہے اور مختلف ادوار اور سیاسی پلیٹ فارموں سے ابھر کر سامنے آتے گئے تا وقتیکہ ان کو قبولیت عامہ کا درجہ حاصل ہوا۔ یہ ان کی مشترکہ کاوش اور جدوجہد پیہم کا نتیجہ تھا اور زعماء ملت کی سیاسی بصیرت اور اجتماعی تگ و دو کا ثمرہ تھا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ

15 فروری 1927ء کو مرزا محمود نے وائسرائے ہند لارڈ اروِن کو ایک خط لکھا جس میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ پر اپنی رائے دی۔(2) انہوں نے کہا کہ برطانیہ کو اس وقت تک ہندوستانیوں کو اقتدار نہیں دینا چاہیے جب تک اقلیتوں کی پوزیشن محفوظ نہ ہو۔ انہوں نے جداگانہ طریق انتخاب کی حمایت کی اور طریق انتخاب میں تبدیلی کے لئے اسمبلی میں کسی کمیونٹی کے کل تعداد کے ۳/۴ نمائندوں کے اتفاق کو لازمی قرار دیا۔

مارچ 1927ء میں بعض مسلم زعماء نے مسلمانوں کے آئینی مطالبات ''تجاویز دہلی'' کی صورت میں پیش کئے جن میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی، مسلمانوں کی مرکزی اسمبلی میں 1/3 نشستیں اور مخلوط انتخاب کو بعض شرائط سے قبول کر لینا شامل تھا۔ سر شفیع، سر فضل حسین اور علامہ اقبال جداگانہ انتخابات کے زبردست حامی تھے۔ اس اہم سوال پر دو مسلم لیگیں شفیع لیگ اور جناح لیگ بن گئیں۔ شفیع لیگ کا اجلاس دسمبر 1927ء میں لاہور میں ہوا اور جناح لیگ نے اپنا اجلاس کلکتہ میں منعقد کیا۔ کانگرس نے پہلے ان تجاویز کو مان لیا لیکن بعد میں انکار کر دیا۔

سائمن کمیشن

واضح رہے کہ مسلمان جداگانہ طریق انتخاب چھوڑنے کے حق میں نہ تھے لیکن ہندوؤں سے اہم سیاسی مطالبات منوانے کے لئے مجبوراً اپنے رویہ میں لچک پیدا کر رہے تھے تاکہ ہندوؤں سے مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے اس کی مثال معاہدہ لکھنو 1916ء تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہوا اور جب حکومت ہند نے 8 نومبر 1927ء کو سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا تاکہ ہندوستان کے آئینی مسائل اور نئی اصلاحات پر ایک رپورٹ مرتب کی جائے تو سیاسی صورت حال بدل گئی۔ یہ کمیشن 1928ء میں بمبئی پہنچا۔ کانگرس نے اس کا بائیکاٹ کیا مسلم لیگ (جو پہلے ہی

دو حصوں میں بٹ گئی تھی) کے ایک دھڑے شفیع لیگ نے تعاون کا اعلان کیا اور جناح لیگ نے اس کی مخالفت کی۔

سائمن کمیشن اور جماعت احمدیہ کے تجویز کردہ مطالبات

مرزا محمود نے الفضل قادیان کے شمارے 6 دسمبر 1927ء میں ایک مضمون مسلمانان ہند کے امتحان کا وقت شائع کرایا جس میں مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ مندرجہ ذیل مطالبات کی تیاری کریں اور کمیشن کا بائیکاٹ نہ کریں۔

1 اقلیتوں کا تحفظ

2 ادنیٰ اقوام (اچھوتوں) کو ابھاریں اور ان کی تنظیم میں مدد دیں اور کمیشن کے سامنے ان کے معاملہ کو پیش کریں۔

3 جداگانہ طریق انتخاب کی ضرورت

4 پنجاب، بنگال اور جو آئندہ مسلم اکثریت کے صوبے بنیں ان میں ان کو اس قدر حقوق دیے جائیں کہ ان کی کثرت قلت میں نہ بدل جائے۔ بنگال کے 56% مسلمانوں کو 40% اور پنجاب کے 55% کو قریباً 45% حق ملا ہے اس لئے مسلمان کسی صوبے کو اپنا نہیں کہہ سکتے اور آزاد ترقی کے لئے کوئی راستہ کھلا نہیں ہے۔ صوبہ سرحد میں اصلاحی طریق حکومت کی کوشش ہونی چاہیے۔(3)

5 سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ قرار دیا جائے۔

6 مذہبی آزادی کی ضمانت دی جائے

7 تبلیغ کی آزادی ہو

8 مسلمانوں کو اردو زبان کی تعلیم کی اجازت اور اس کو بعض صوبوں میں قانونی زبان کا درجہ دیا جائے۔

یہ مسلمانوں کے عام مطالبات تھے۔ جن کو وہ مختلف سیاسی پلیٹ فارموں سے پیش کرتے چلے

آئے تھے۔تجاویز دہلی مارچ 1927ء میں (جداگانہ انتخاب کے علاوہ) یہ مطالبات موجود تھے ان میں سے بعض مطالبات مرزا محمود نے اپنے مضمون میں دہرائے بعد میں اس اردو مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے اس کی ہندوستان اور بیرون ملک تشہیر کی۔اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی مدبر، مسلمانوں کے حقوق کے ہمدرد اور ان کے بعض آئینی مطالبات کے حامی کے طور پر پیش کیا۔ شیخ عبدالماجد نے مرزا محمود کی تجاویز کا شفیع لیگ کے سائمن کمیشن کو پیش کئے جانے والے میمورنڈم کے بعض حصوں سے تقابل کیا ہے (4) لیکن میمورنڈم کے تمام مطالبات کا ذکر نہیں کیا تا کہ ان کی جامعیت کے مقابلے میں مرزا محمود کی پیش کردہ تجاویز کی وقعت کم نہ ہو جائے۔

شفیع لیگ کے مطالبات اور علامہ اقبال

مرزا محمود کی اجمالی تجاویز کے مقابلے میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے جامع مطالبات مرتب کئے وہ شفیع لیگ کے سکر یٹری تھے انہوں نے سائمن کمیشن کو پیش کئے جانے والے میمورنڈم میں مندرجہ ذیل اہم مطالبات شامل کرائے

1 مکمل صوبائی خودمختاری، صوبائی مقننہ کے لئے بالغ حق رائے دہی۔

2 مرکزی مقننہ میں نشستوں کا اضافہ

3 بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ

4 جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو مذہبی حقوق اور سیاسی اداروں میں موثر نمائندگی دی جائے۔

5 مرکزی اور صوبائی کابینہ میں خاص تحفظات۔سرکاری ملازمتوں میں مناسب حصہ، مسلم طلباء کے داخلوں پر پابندی کا خاتمہ وغیرہ

6 ہندوستان کے آئندہ دستور کی وفاقی نوعیت اور مابقی اختیارات صوبوں کو تفویض کرنا

7 وائسرائے کی آٹھ رکنی کابینہ میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی

8 صوبوں میں دوعملی (ڈیارکی) کا خاتمہ

9 محصول آمدنی وصولی اور خرچ کرنے کا صوبوں کا اختیار اور

10 صوبہ جاتی یا مرکزی مقننہ کسی ایسے مسودہ قانون کو جس کا تعلق کسی مذہب سے ہو منظور نہ کرے اگر متعلقہ فرقہ کے 3/4 اراکین اس کے خلاف رائے دیں۔(5)

یہ اہم آئینی امور شفیع لیگ کے میمورنڈم میں شامل کئے گئے۔ 5 نومبر 1928ء کو ایک وفد نے یہ میمورنڈم سائمن کمیشن کو پیش کیا جس کے ایک رکن علامہ اقبال تھے۔ اس سے قبل انہوں نے صوبائی خودمختاری کے سوال پر شفیع لیگ کی سکریٹری شپ سے استعفےٰ پیش کر دیا تھا جس کے باعث لیگ نے اس اہم مطالبہ کو مان لیا۔ علامہ اقبال نے نہ صرف یہ اہم امور میمورنڈم میں شامل کرائے بلکہ کمیشن کے سامنے شفیع لیگ کے میمورنڈم کی وکالت کی یہ مطالبات ہر لحاظ سے مرزا محمود کی مختصر تجاویز سے کہیں وسیع اور جامع تھے اور علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت کے غماز تھے۔ اس میں ایسے بنیادی مطالبات پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستان کے آئینی مسئلے کے حوالے سے مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے ضامن تھے۔

1920ء کی دہائی کے آخری سالوں میں لاہور جماعت کے ترجمان اخبار پیغام صلح اور ہفت روزہ لائٹ لاہور مرزا محمود کے سیاسی تدبر پر تنقید کرتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ پہلے تو وہ سیاست میں حصہ لینے کے ہی سخت خلاف تھے اور اسے شجر ممنوعہ قرار دیتے تھے پھر ہندوستان میں 1913ء سے 1927ء تک اٹھنے والی آزادی کی تحریکوں، سانحہ کانپور، خلافت، رولٹ ایکٹ، عدم تعاون کی تحریکات، وغیرہ کے اشد مخالف اور انگریز کے پرزور حامی تھے اور ان کو ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے اب انہوں نے یک دم ایک نیا روپ دھار لیا ہے اور مسلم مفادات کے ہمنوا بن گئے ہیں۔ شاید کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔

سردست ہم یہ مان لیتے ہیں کہ شیخ عبدالماجد کے بقول مرزا محمود نے یہ سب کچھ مسلمانوں کی ہمدردی میں کیا۔(6) لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ گورداسپور اور لاہور میں احمدیہ جماعت کے وفود نے کمیشن کو ''احمدی نقطہ خیال سے سیاسی امور پر مبنی'' علیحدہ میمورنڈم کیوں پیش کئے۔ اگر انہیں مسلم

مطالبات سے اتفاق تھا تو ان کو پیش کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وفد نے کمیشن کے ممبران کو سلسلہ احمدیہ کی کتابیں دیں اور سیاسی امور سے قبل سلسلہ احمدیہ کے حالات سنائے جس پر کمیشن کے صدر جان سائمن نے کہا کہ وہ سلسلہ احمدیہ کی اہمیت کے قائل ہیں اور رائے دہی اور تعاون کے شکر گزار ہیں۔ (7) لاہور میں جس 16 رکنی وفد نے اپنا میمورنڈم کمیشن کو پیش کیا اس پر بقول دوست محمد شاہد مولف تاریخ احمدیت اور ''حوالوں کے بادشاہ'' 5 لاکھ افراد کے دستخط تھے۔ مرزا محمود نے خطبہ جمعہ (10 فروری 1928ء) میں اعلان کیا ''دوسرے مسلمان بھی قربانیاں کرتے ہیں مگر اعلیٰ نتائج نہیں نکلتے ان کے مقابل میں جماعت احمدیہ میں نصرت اور تائید الٰہی کا عجیب نظارہ نظر آتا ہے جس کی صرف یہی وجہ ہے کہ صحیح راستہ اختیار کئے بغیر کامیابی نہیں ہوسکتی۔ (8)

ان علیحدہ یادداشتوں کی تفاصیل قادیانی لٹریچر میں موجود نہیں جو ان کے جماعتی مفادات کے تحفظ کے لئے تھے۔ اگر ان کو مسلمانوں کے بعض یا تمام سیاسی مطالبات سے اتفاق تھا تو یہ احمدی نقطۂ نظر سے سیاسی امور پر مبنی میمورنڈم کیا تھے اور الگ سے کیوں پیش کئے گئے، کیا قادیانیوں کا جماعتی مفاد مسلمانوں کے عام سیاسی مفادات سے الگ اور ان سے متصادم تھا۔ الگ میمورنڈم پیش کرنے کی قادیانی دوعملی اس کے بیس سال بعد پنجاب باونڈری کمیشن (1947ء) کے ممبر جسٹس محمد منیر کو بھی سمجھ میں نہ آئی جب قادیانیوں کی طرف سے شیخ بشیر احمد ایڈوکیٹ نے قادیان کی منفرد حیثیت کے بارے میں باونڈری کمیشن کو ایک علیحدہ میمورنڈم پیش کیا۔ جسٹس منیر سوال کرتے ہیں کہ اگر قادیانیوں کو مسلم لیگ کے موقف سے اتفاق تھا اور مسلم لیگ کا کیس ان کی جماعت کا ایک سرکردہ فرد سر ظفر اللہ پیش کر رہا تھا تو پھر علیحدہ میمورنڈم پیش کرنے کی کیا وجہ اور ضرورت تھی جس سے مسلم مفادات متاثر ہوئے اور مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ (9)

کیا شیخ عبدالماجد 5 لاکھ دستخطوں سے پیش کردہ جماعت احمدیہ کے میمورنڈم کے مکمل متن کو جسے جماعت کے سرکردہ افراد پر مشتمل 16 رکنی وفد نے (جس میں ظفر اللہ شامل تھے) مارچ 1928ء میں لاہور میں سائمن کمیشن کے روبرو پیش کیا تھا شائع کرنے کی تجویز خلیفہ مسرور احمد

صاحب کی خدمت میں لندن روانہ کریں گے تاکہ ان میں درج احمدیہ مطالبات کا پتہ چل سکے۔ یہ تاریخی دستاویز اور گورداسپور کے مقام پر پیش کردہ میمورنڈم احمدیہ جماعت کے سیاسی موقف کے ترجمان ہیں۔ اب 77 سال گزرنے کے بعد ان کو شائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ان کا مطالعہ تاریخ احمدیت کے طالب علموں کی معلومات میں اضافے کا موجب ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ 1921ء کی مردم شماری کے مطابق 56 ہزار احمدیوں نے پانچ لاکھ دستخط کیسے حاصل کئے اور ساڑھے چار لاکھ دستخط کرنے والے کون لوگ تھے۔

قادیانیوں کی جانب سے مسلم مطالبات کی تائید کی وجوہات

قادیانی 1906ء سے 1927ء کے لگ بھگ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی سے زیادہ تر الگ تھلگ رہے اور ان کی تمام تر سرگرمیاں انگریز سے تعاون اور آزادی کی تحریکوں کو ناکام بنانے میں صرف ہوئیں لیکن 1927ء کے بعد ان کے رویے میں تبدیلی رونما ہونے لگی جس کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

1 قادیانی جانتے تھے کہ انگریز بذات خود ہندوستانیوں کو سیاسی مراعات دے رہا ہے اور آئینی اور دستوری اصلاحات کا عمل ایکٹ آف 1909ء اور 1919ء کے بعد جاری ہے اس لئے ان بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں ان کی سابقہ پالیسی غیر موثر ہو چکی ہے اب نئے دستوری نظام اور آزادی کے ابھرتے ہوئے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے جماعتی مفادات کا تحفظ کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو ملنے والی مراعات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ان کی تنظیموں میں گھسنا چاہیے اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس سلسلے میں انہیں گورنر پنجاب ملیکم ہیلی اور سر فضل حسین کا تعاون حاصل تھا۔

2 مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور مذہبی سطح پر نہیں تو کم از کم سیاسی سطح پر ان کے قریب آنے کی کوشش کی جائے تاکہ جماعت کی Isolation ختم ہو سکے۔

3 جماعت کے اہم افراد کو سیاسی معاملات کی تربیت دی جائے تاکہ وہ مسلمانوں کے سیاسی

اداروں مسلم لیگ وغیرہ میں شامل ہوسکیں۔ دوسرے ان کے بنیادی نقطہ نظر کی حمایت کرنی چاہیے تاکہ مستقبل میں اپنی جماعت کے لیے سیاسی تحفظ حاصل کیا جاسکے۔ جماعت کے سرکردہ افراد محض وفاتِ وحیاتِ مسیح اور اجرائے نبوت کے دلائل دینے کے ماہر نہ ہوں وہ سیاسی شعور حاصل کر کے مستقبل میں سیاسی کرزدار ادا کرنے کے قابل بھی ہوسکیں۔

4 مرزا محمود کا ایک دینی رہنما کے علاوہ ایک سیاسی مدبر کے طور پر امیج اجاگر کیا جائے جو مسلمانوں کے حقوق کی جدو جہد میں ان کا ساتھی اور ہمدرد ہے۔ پنجاب میں قادیانیوں نے اپنی قسمت یونی نسٹ پارٹی سے وابستہ کر رکھی تھی۔کل ہند سیاست میں ان کا کردار صفر تھا س لئے وہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا لبادہ اوڑھ کر آگے بڑھے سر فضل حسین کی سرپرستی میں سر ظفر اللہ قادیان اور ان کے درمیان اہم رابطہ تھا وہ ان کا انتہائی وفادار آلہ کار تھا جس سے وہ کوئی سی خدمت لے سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ظفر اللہ نے اپنی تحریروں میں اپنے محسن اعظم سر فضل حسین کی پالیسیوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ایک مورخ، زاہد چوہدری لکھتے ہیں ''پنجاب میں جاگیرداروں کی یونی نسٹ پارٹی کا قیام فضل حسین کی 'بے مثال' سیاسی تدبر وبصیرت کا شاہکار نہیں تھا بلکہ یہ اس کی سیاسی زندگی کا ایک المیہ تھا۔ ایسے شخص کو کن عوامل نے مجبور کیا تھا کہ وہ پنجاب کے ایسے دقیانوسی جاگیرداروں کا لیڈر بن جائے جن کا ماضی شرمناک تھا، جن کا حال افسوس ناک تھا اور جن کا مستقبل عبرت ناک تھا۔ سر ظفر اللہ اپنے محسن اعظم سر فضل حسین کے نقادوں کو''خود ساختہ'' مورخ کہتا ہے اور طنز کرتا ہے کہ اگر فضل حسین نہ ہوتا تو ان نقادوں اور مورخوں میں سے اکثر کو کالج میں داخلہ بھی نہ ملتا۔ چونکہ ظفر اللہ اپنے مذہبی عقیدے کے اعتبار سے خود بھی مضحکہ خیز، پست ذہن اور کوتاہ اندیش تھا اس لئے اس کی سیاسی فکر کی پرواز بھی ایک مرغی کی پرواز سے زیادہ نہ تھی۔ یہ فضل حسین کو بھی ''سیاسی پیغمبر'' کا درجہ دیتا ہے جس نے پنجابی مسلمانوں کی تقدیر سنوارنے کا معجزہ سرانجام دیا تھا۔ (10) 1920ء کی آخری دہائی میں قادیانی پالیسی سر فضل حسین اور

ظفراللہ کے ایماء پر وضع کی جاتی رہی جس کے خدو خال مرزا محمود کے خطبات اور ان کی تحریروں میں نمایاں ہیں۔

نہرو رپورٹ پر تبصرہ 1928ء

صدر کانگرس موتی لال نہرو نے 28 دسمبر 1928ء کو کلکتہ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائی تا کہ نہرو رپورٹ کی توثیق کی جائے اس میں متحدہ قومیت اور مخلوط انتخابات کے حامی عناصر نے حصہ لیا۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے مفتی محمد صادق ناظر امور خارجہ اور دولت احمد خان جوائنٹ ایڈیٹر اخبار سلطان کلکتہ نے اس میں شرکت کی اور نہرو رپورٹ کے متعلق بعض تجاویز پیش کیں۔ ہندوؤں نے مسلم مطالبات کو نہ مانا، قائداعظم اس سے بہت مایوس ہوئے اس کے جواب میں شفیع لیگ نے 31 دسمبر 1928ء کو آل پارٹیز کانفرنس دلی میں سر آغا خان کی صدارت میں مسلم مطالبات مرتب کئے اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اس کی تشہیر کی۔ اس کانفرنس میں سر فضل حسین کے ایماء پر قادیانیوں کے بیس نمائندوں نے شرکت کی۔ قادیانی وفد میں بنگال سے حکیم ابو طاہر محمود، حکیم خلیل احمد مونگھیری، پنجاب سے ظفراللہ دہلی سے بابو اعجاز حسین اور مرکز قادیان سے مفتی محمد صادق شامل ہوئے۔ (11) اس کانفرنس کے مطالبات کی روشنی میں قائداعظم نے مارچ 1929ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کئے۔

مرزا محمود احمد کی نام نہاد ''خود مختار مسلم ریاست'' کی تجویز

شیخ عبدالماجد نے جہاں اور کئی تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے وہاں یہ گل فشانی بھی کی ہے کہ مرزا محمود نے 1928ء میں بنگال سمیت پانچ اسلامی صوبوں کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں ''ہوسکتا ہے اس رائے پر مزید غور کے نتیجے میں کسی نکتہ پر بحث کی گنجائش نکل آئے۔ ہم علیحدہ مسلم وطن کے تصور کے خالق ہونے کا کریڈٹ حضرت امام جماعت احمدیہ کو نہیں دیتے لیکن نکتہ چینوں سے یہ گزارش کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگر اقبال، جنہوں نے 1930ء میں بنگال اور

آسام کو نظر انداز کر کے آدھے وطن کی تجویز پیش کی وہ بھی جو انڈین فیڈریشن کا حصہ ہو، تحریک آزادی کے ہیرو اور تصور پاکستان کے بانی و خالق قرار دیئے جا سکتے ہیں تو حضرت امام جماعت احمدیہ پر جنہوں نے اس سے دو سال قبل خود مختار مسلم ریاست کی تجویز پیش کی اور جس میں بنگال آسام کو بھی شامل کیا، آپ یہ فتویٰ کیسے صادر کر سکتے ہیں کہ وہ الگ وطن کی سکیم کو سبوتاژ کرنے والے تھے۔(12)

شیخ عبدالماجد نے اتنا تو کیا کہ علیحدہ مسلم وطن کے تصور کے خالق ہونے کا کریڈٹ مرزا محمود کو نہیں دیا لیکن یہ ضرور کہا کہ پانچ اسلامی صوبوں پر مشتمل خود مختار مسلم ریاست کی تجویز انہوں نے 1928ء میں پیش کی۔ آیئے ان کے اس دعوے کی حقیقت کا جائزہ لیں۔

مرزا محمود احمد سائمن کمیشن کی آمدِ ہند فروری 1928ء کے بعد سیاسی امور پر رائے زنی کر رہے تھے۔ نہرو رپورٹ اگست 1928ء میں منظر عام پر آئی اس میں ہندوستان کے لئے نیم خود مختاری کا درجہ ڈومینین، امور دفاع و خارجہ انگریز کے پاس رہنے، نشستوں کے تعین کے بغیر مخلوط انتخابات، وفاقی (فیڈرل) کی بجائے وحدانی (یونی ٹری) طرز حکومت، سندھ کو بمبئی میں شامل رکھنے، مرکز میں مسلمانوں کو 1/3 کی بجائے 1/4 نمائندگی دینے جیسی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ کانگریس اور مسلم رہنماؤں کے اختلافات ایک تو شفیع لیگ کے سائمن کمیشن سے تعاون دوسرے ایک قابل قبول آئینی فارمولے پر اتفاق نہ ہونے کے باعث وسیع ہو چکے تھے۔ نہرو رپورٹ پر قائد اعظم کے اپنے تحفظات تھے۔ مسلم رہنماؤں نے 1927ء میں آل پارٹیز کانفرنس دلی کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کے لئے ایک ایسے وفاقی آئین کا مطالبہ کیا تھا جس میں باقی اختیارات صوبوں کے پاس رہیں یہ صوبے مکمل خود مختار ہوں اور مسلمانوں کو زائد نمائندگی weightage دینے کا حق قائم رہے۔ اس کے ساتھ علیحدہ حق نیابت بھی برقرار رہے۔

مرزا محمود احمد نے الفضل قادیان میں نہرو رپورٹ پر اپنے خیالات کا اظہار سات قسطوں (12 اکتوبر۔2 نومبر 1928) میں کیا اور پھر اسے کتابی شکل میں مسلمانوں کے حقوق اور نہرو

رپورٹ کے عنوان سے شائع کر دیا۔(13) اس میں انہوں نے مسلمانوں کے عمومی مطالبات پر رائے دی اور کہا کہ حکومت کا ڈھانچہ فیڈرل (وفاقی) ہو اور تمام صوبوں کو اندرونی طور پر کامل خود مختاری حاصل ہو، اقلیت کو زیادہ حق نیابت دیا جائے، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو نیابتی حکومت دی جائے، سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے صوبہ بنایا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مرزا محمود احمد نے اپنے تبصرے میں پہلے تو یہ کہا کہ نہرو کمیٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ نہ تھی نہ ہی آل پارٹیز کانفرنس نمائندہ تھی جس نے اسے قائم کیا کیونکہ

''شروع سے آخر تک کسی نے نہیں پوچھا کہ تمہاری (جماعت احمدیہ) کی کیا رائے ہے حالانکہ ہم تعداد میں کسی قدر بھی کم نہیں مگر پارسیوں سے زیادہ ہیں اور آل انڈیا حیثیت رکھتے ہیں۔

ہماری مضبوط جماعتیں تین صوبوں میں پائی جاتی ہیں یعنی پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحد، اس کے علاوہ بہار، یوپی، مدراس اور سندھ میں بھی معقول جماعتیں پائی جاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں تو ہر صوبہ میں ہیں۔ ہماری جماعت منظم ہے اور رجسٹر شدہ تعداد کے لحاظ سے اور نظام کے لحاظ سے تو شاید کوئی ہندو سوسائیٹی بھی اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔(14)

اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات خصوصاً حکومت کے فیڈرل سسٹم اور تمام صوبہ جات کو کامل طور پر خود مختار قرار دینے کے مطالبہ پر گفتگو کی اور کہا کہ یہ کوئی غیر مجرب شے نہیں ہے اور امریکہ میں یہی طرز حکومت ہے۔ البتہ صوبوں کو مرکز سے علیحدہ ہونے کا اختیار نہ ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا:

''برٹش ایمپائر بھی ایک قسم کی فیڈریشن ہے جس کے آزاد حصوں کے کام میں مرکزی حکومت کوئی دخل نہیں دیتی لیکن سب سے بہتر تجربہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہوا ہے ان ریاستوں کی گورنمنٹ کی ابتداء ہی فیڈرل اصول پر ہوئی ہے، اور برابر یہ گورنمنٹ ترقی ہی کرتی جا رہی ہے''۔

امریکہ کے علاوہ جنوبی افریقہ، آسٹریلیا اور سوئٹزر لینڈ میں بھی اسی قسم کی حکومتیں ہیں اور کامیاب طور پر چل رہی ہیں ان کے علاوہ ایک اور نئی حکومت ہے یعنی زیکوسلویکا جس میں نئی قسم کا تجربہ کیا گیا ہے

یعنی سارے ملک میں تو فیڈریشن نہیں ہے لیکن روتھینیا کے علاقہ کو ان لوگوں کے خوف کی وجہ سے کامل خود اختیاری حکومت دے دی گئی ہے جس کو کبھی مٹا نہ سکنے کا عہد زیگوسلویکا نے کیا ہے۔ مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا گر اسی طریق پر ہندو راضی ہو جائیں یعنی پانچوں مسلم صوبے (پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، بنگال) فیڈریشن کے اصول پر ہندوستان سے ملحق رہیں اور ہندو صوبے مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت رہیں اور جس طرح روتھینیا والوں نے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ ان معاملات میں مرکزی پارلیمنٹ میں دوسرے صوبوں کے متعلق رائے نہ دیں گے جن امور میں کہ ان کے صوبے میں مرکزی حکومت دخل نہیں دیتی (مگر زیگوسلویکا نے اس اقرار کے باوجود اپنے معاملات میں رائے دینے کا انہیں حق دے کر ایک بے نظیر وسعت کا ثبوت دیا ہے) اس طرح مسلمان بھی شوق سے عہد کر لیں گے کہ جو اختیارات مسلم صوبہ جات اپنے لئے محفوظ رکھیں گے ان میں صوبجات کے نمائندے دوسرے صوبوں کے کاموں میں دخل نہ دیں گے۔

ہندوستان کی فیڈریشن کیسی ہو؟

گو یہ موقع نہیں کہ میں اس امر کے متعلق کچھ بیان کروں کہ ہندوستان کی فیڈریشن کیسی ہو لیکن چونکہ ممکن ہے بحث میں بعض نقائص کو لوگ پیش کریں اس لئے میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کا طریق زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ملک بھی ہندوستان کی طرح وسیع ہے اور مختلف نسلیں اور مختلف مذہب پائے جاتے ہیں ہاں یہ شرط ہو جانی چاہئے کہ کوئی صوبہ فیڈریشن سے آزاد نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ صرف وہی اختیارات مرکزی حکومت کو دیئے جائیں جو امریکہ میں دیئے گئے ہیں بلکہ ان سے زائد اختیارات دیئے جا سکتے ہیں ہاں اس امر کا لحاظ رکھنا ہو گا کہ صوبہ جات کے اندرونی نظم و نسق میں خلل نہ آئے۔" (15)

نہرو رپورٹ پر تبصرہ کے آخر میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی حکومت کا منزل مقصود ڈومینین سٹیٹس رکھا گیا ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح راہ ہے بعض لوگ تو اسے درمیانی

راہ سمجھتے ہیں اور اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ضروری خیال کرتے ہیں میرا اپنا خیال ہے کہ اپنی ذات میں بھی یہ طریق حکومت بہترین ہے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے ،اس وقت نہ تو انگریز اس امر کو سمجھ رہے ہیں اور نہ ہندوستان اس امر کو سمجھتا ہے کہ برطانیہ کا مستقبل ایشیاء اور خصوصاً اسلام سے وابستہ ہے لیکن زمانہ مستقبل انشا اللہ اس امر کو ثابت کر دے گا کہ حقیقت یہی ہے۔(16)

اس اقتباس سے عیاں ہے کہ مرزا محمود نے نہرو رپورٹ پر تبصرہ میں ایک تو ہندوستان کے لئے نیم خود مختار درجہ ڈومینین سٹیٹس کو اِس کی منزل قرار دیا ہے دوسرے ہندوستان کے لئے امریکی طرز حکومت کی طرح کے وفاقی ڈھانچے کی تجویز پیش کی ہے۔ امریکی آئین میں فیڈریشن کو کچھ اختیارات حاصل ہیں اور کچھ امور اس کے دائرہ اختیار میں نہیں جیسا کہ فیڈریشن کا تقاضا ہے ایسے ہی ریاستوں کو کچھ اختیارات دیئے گئے ہیں اور کچھ نہیں دیئے گئے جیسے معاہدات کرنا، افواج رکھنا، وغیرہ اختیارات کی ایک فہرست کنکرنٹ لسٹ ہے جس کا استعمال قومی حکومت اور ریاستیں دونوں کرتی ہیں اگر کوئی تنازعہ ہو تو سپریم کورٹ حل کرتی ہے۔ اس لئے امریکی ریاستوں کے باہمی قوانین میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔

مرزا محمود کے تبصرے میں پانچ آزاد مسلم صوبوں کے قیام کا سرے سے کوئی ذکر نہیں نہ ہی خود مختار مسلم ریاست کا کوئی اشارہ تک کیا گیا ہے، صرف فیڈریشن کے قیام کا ذکر ہے جہاں تک فیڈریشن کے سلسلے میں ان کی زیکوسلویکا کی مثال کا تعلق ۔ہے کہ اس نے روتھینیا کو کامل خود اختیاری حکومت دے رکھی ہے اور ان کے خیال میں مسلمانوں کو اعتراض نہیں ہو سکتا اگر اس طریق پر ہندو راضی ہو جائیں اور پانچوں مسلم صوبے، سرحد، پنجاب، بلوچستان، بنگال، سندھ فیڈریشن کے اصول پر ہندوستان سے ملحق رہیں اور ہندو صوبے مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت رہیں جس طرح اہلِ روتھینیا نے یہ اقرار کیا ہے کہ وہ ان معاملات میں مرکزی پارلیمنٹ میں دوسروں صوبوں کے متعلق رائے نہ دیں گے جن امور میں کہ ان کے صوبے میں مرکزی حکومت دخل نہیں دیتی ۔ اس تجویز میں انہوں نے کہاں مسلم صوبوں پر مشتمل ایک خود مختار مسلم ریاست کی سکیم پیش کی ہے وہ تو فیڈریشن یا

وفاق کی ایک ایسی صورت بیان کر رہے ہیں جیسی روتھیبیا کے حوالے سے پائی جاتی ہے اور ان کے خیال میں ہندوستان میں ایسی فیڈریشن کے قیام پر مسلمانوں کو شاید اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کے معاً بعد انہوں نے امریکی فیڈریشن کے طرز پر ہندوستان کے لئے ایک فیڈریشن کی تجویز پیش کر دی ہے۔

جہاں تک روتھینا Ruthenia کا تعلق ہے تو چیکوسلاویکیہ نے روتھیبیا کے ساتھ 10 ستمبر 1919ء کو دو معاہدے Minority Treaty اور St. Germain en-laye کئے تھے۔ جن کے تحت روتھیبیا کو صوبائی خودمختاری دے دی گئی اور چیکوسلاویکیہ کے آئین میں اس کی ضمانت دی گئی تھی۔ روتھیبیا کی ایک الگ پارلیمنٹ کے قیام کی تجویز بھی تھی لیکن یہ منتخب پارلیمنٹ جس کی پہلے سے ضمانت دی گئی تھی وہ کبھی بھی قائم نہ ہو سکی۔ یہ صرف کاغذوں میں موجود تھی۔ 1944ء میں روس نے اس علاقے پر قبضہ کر کے 1945ء میں اسے یوکرائن کا حصہ بنا دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرزا محمود کو خود ہی اس ڈھیلی ڈھالی مجوزہ فیڈریشن کی تجویز کی نامعقولیت کا احساس ہوا کہ وہ ہندوستان کے کسی وفاقی نظام سے ہم آہنگ نہ ہوگی اور ناقابل عمل قرار پائے گی اس لئے انہوں نے فوراً ہی امریکی طرز کی فیڈریشن کو ہندوستان کے لئے موزوں سمجھا جس میں کوئی صوبہ فیڈریشن سے آزاد نہ ہو سکے اور امریکہ نے ریاستوں کو جو اختیار دئے ہیں ان سے بڑھ کر بھی انہیں دیئے جا سکتے ہیں۔

مرزا محمود کی غیر واضح، مبہم، ناقابل عمل وفاق کی تجویز جو مشرقی یورپ کے ایک علاقہ روتھیبیا کے مخصوص حالات کے تحت قائم ہوئی تھی اور جو روبعمل نہ ہوئی یا امریکی فیڈریشن کے خطوط پر قائم کئے جانے والے وفاقی ڈھانچہ کا علامہ اقبال کی آزاد اسلامی ریاست کی تجویز سے کیا تعلق ہے۔ علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد (1930ء) مسلم ہندوستان کی آزادی اور خودمختاری کا واضح تصور پیش کرتا ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے کہا:

''میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کے الحاق سے ایک واحد ریاست قائم کی جائے جو برٹش ایمپائر کے اندر یا اس سے باہر آزاد و خودمختار ہو میرے

خیال میں شمال مغرب میں متحدہ انڈین مسلم سٹیٹ کا قیام کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا مقدر ٹھیر چکا ہے۔''

شیخ عبدالماجد نے شاید پہلی بار 1996 میں مرزا محمود کی ہندوستان کے وفاق کی ایک مبہم تجویز کو پانچ اسلامی صوبوں کے قیام کی سکیم یا خودمختار مسلم ریاست کی تجویز قرار دیا ہے حالانکہ 1928ء سے لے کر 1996ء تک 68 سال کے عرصے میں کسی قادیانی مورخ و محقق بشمول ''حوالوں کے بادشاہ'' دوست محمد شاہد اور خود مرزا محمود احمد کو اپنے تبصرے کی بنیاد پر یہ عجیب و غریب خیال نہیں سوجھا۔ انہوں نے شاید مرزا محمود کی تحریر کو مرزا غلام احمد کا الہام سمجھا ہے کہ جہاں ضرورت پڑی کھینچ تان کر اسے مخصوص حالات پر منطبق کر دیا۔ شاید شیخ عبدالماجد کو معلوم ہو کہ مرزا محمود احمد نے سائمن کمیشن رپورٹ پر بھی ایک تبصرہ لکھا تھا۔ یہ رپورٹ مئی 1930ء میں شائع ہوئی جس میں ہندوستان کے لئے ایک آئینی منصوبہ کا خاکہ دیا گیا تھا اس میں بھی وفاق کی تجویز تھی اور مسلمانوں کے بعض مطالبات کسی حد تک مان لئے گئے تھے۔ مرزا محمود نے اپنے تبصرے میں ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس دینے تک کی بھی حمایت نہ کی، آزادی یا آزاد و خودمختار ریاست کا مطالبہ تو دور کی بات ہے۔ وہ فرماتے ہیں

'ہندوستان کے انگلستان سے علیحدہ ہونے کا خیال نہ صرف امکان کے خلاف ہے بلکہ قانون قدرت کے منشا کے بھی خلاف ہے پس اسے ہمیں بالکل نظرانداز کر دینا چاہیے اور اس سوال پر غور کرنا چاہئے کہ انگلستان سے تعلق رکھتے ہوئے ہندوستان کس حد تک آزادی کا مستحق ہے۔ اگر اس سوال کا تعلق موجودہ زمانہ سے نہ ہو بلکہ آئندہ زمانہ سے ہو تو میں جواب دوں گا کہ ہندوستان ویسی ہی آزادی کا مستحق ہے جیسی آزادی دوسری آزاد نوآبادیوں کو حاصل ہے اور جسے ڈومینین سٹیٹس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اگر اس سوال کا تعلق موجودہ زمانہ سے ہو تو میں ملامت گر کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر کہوں گا کہ ہندوستان ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اسے اس وقت کامل آزادی مل جائے فوراً ڈومینین سٹیٹس مل جانے کو میں برکت نہیں بلکہ عذاب قرار دوں گا'۔ (17)

آپ نے دیکھا کہ نہرو رپورٹ پر تبصرہ کے دو سال بعد (1930) بھی مرزا محمود تو ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس نیم خود مختارانہ درجہ دینے کے حق میں نہ تھے آزاد مسلم ریاست کا تصور تو دور کی بات ہے البتہ سائمن کمیشن کی رپورٹ میں مذکور ہندوستان میں وفاق کی تجویز کی نہرو رپورٹ پر تبصرہ کی طرح انہوں نے بہت حد تک حمایت کی ہے۔(18) اور فیڈرل سسٹم پر اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ انہوں نے وحدانی طرز حکومت کے مقابلے میں وفاقی طرز کو ہندوستان کے لئے موزوں قرار دیا ہے اس کے علاوہ اس میں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ انہوں نے شیخ عبدالماجد کی پانچ مسلم صوبوں پر مشتمل آزاد و خود مختار ریاست کی تجویز کبھی بھی پیش نہیں کی نہ وہ انگریز سے تعاون، جماعتی مفاد اور اپنے عقیدے کی رو سے ایسے کسی مطالبے کو پیش کر سکتے تھے۔

سائمن کمیشن رپورٹ کی تجاویز کی حمایت میں تبصرے کو انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس کے دوران ممبران پارلیمنٹ اور ہندوستان اور انگلستان کے با رسوخ افراد میں تقسیم کرایا۔ علامہ اقبال کو بھی لاہور میں اس کی ایک کاپی دی گئی انہوں اس پر اپنی عمومی رائے دی:

'تبصرہ کے چند مقامات کا میں نے مطالعہ کیا ہے نہایت عمدہ اور جامع ہے،(19)

اس تبصرہ کے برعکس علامہ اقبال نے بھی سائمن کمیشن رپورٹ مئی 1930ء پر تبصرہ کیا انہوں نے فیڈرل اسمبلی کے قیام سے اتفاق کیا لیکن کہا کہ صوبائی خود اختیاری کا تصور واضح نہیں، پنجاب اور بنگال کے معاملے میں نقطہ نظر غلط ہے، سندھ، سرحد، بلوچستان کے بارے میں مایوس کن رویہ اختیار کیا گیا ہے۔(20) اپریل 1932ء میں علامہ اقبال اور چار دیگر مسلم رہنماؤں نے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے حقوق کی اکثریت کی تائید میں بیان دیا۔(21) ان کا تبصرہ نہایت جامع اور مسلم مطالبات کا صحیح ترجمان ہے۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ پر مرزا محمود کے تبصرے میں بھی کوئی خاص مطالبہ یا نام نہاد پانچ اسلامی صوبوں کے قیام کی تجویز یا خود مختار مسلم ریاست کا کوئی تصور سرے سے موجود نہیں حالانکہ ان کے نہرو رپورٹ پر تبصرہ (1928)ء پر دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور مسلم زعماء کئی آئینی تجاویز اور مسلمانوں کے مطالبات پیش کر چکے تھے۔ اسی سال علامہ اقبال نے

خطبہ الہ باد دیا۔ برطانیہ کی ریمزے میکڈ لنلڈ حکومت نے اس رپورٹ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور آئینی مسائل کے حل کے لئے گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔

قادیانی خلیفہ کو جدوجہد آزادی اور مسلمانوں کے آئینی مطالبات کی تدوین یا حمایت کا کریڈٹ دینے کے لئے شیخ عبدالماجد نے یہ بھی کہا ہے

''آل انڈیا مسلم کانفرنس، چودہ نکات اور خطبہ الہ آباد میں پیش کردہ مطالبات کی شمع کو قادیان کی سرزمین سے جو جلا بخشی گئی اس شجر کی جس رنگ میں وہاں آبیاری کی گئی، نہرو رپورٹ کے زہر کا تریاق جس کثیر مقدار میں قادیان نے مہیا کیا، مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم قائدین کو جس انداز سے دلائل و براہین سے قادیان نے لیس کیا برصغیر کی کوئی مذہبی جماعت یا ادارہ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔'' (22)

1927ء سے 1931ء کی آئینی جدوجہد کے ریکارڈ کی روشنی میں ان کی تعلی اور خود ستائی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے زبردستی جماعت احمدیہ کو کریڈٹ دینے کی کوشش کی ہے جو حقیقت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ قادیان کی محبت میں انہوں نے تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے۔ چونکہ وہ ایک غالی قادیانی ہیں اور ہر اہم واقعے اور مسلم مطالبے کے پیچھے اپنے ''اولوالعزم'' خلیفہ کی 'ذہانت، اور سیاسی بصیرت' کے قائل ہیں اس لئے انہوں نے ایسے نتائج اخذ کرنے کی غیر معقول روش اختیار کی جن کو ان کی سرکاری تاریخ احمدیت میں بھی پیش نہیں کیا گیا نہ ہی کبھی ایسا ذکر احمدیہ لٹریچر میں ہوا۔ درج بالا پیراگراف کے معا بعد ان کو اپنی غیر معقول روش کا احساس ہوا اور انہوں نے تسلیم کیا:۔

''واضح رہے کہ تاریخی اجتماعات و واقعات میں پیش کئے جانے والے مسلم مطالبات کے خالق نہ تنہا امام جماعت احمدیہ تھے اور نہ بانیاں مسلم کانفرنس نہ قائداعظم نہ علامہ اقبال بلکہ یہ مطالبات کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے اور یہ سب حضرات یا اجتماعات ان کے ترجمان تھے'' (23)

اعلیٰ سیاسی بصیرت کے مالک اور مسلمانوں کے حقیقی ہمدرد مسلم رہنماؤں کے مقابلے میں مرزا

محمود کی کیا حیثیت تھی جو محض انگلی پر لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتے تھے اور مسلمانوں کی جعلی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر انہیں دھوکہ دے رہے تھے۔ اگر انہوں نے علامہ اقبال کی طرح واقعی کوئی اہم تجویز یا مطالبہ پیش کیا ہوتا تو ہم ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر اس کا اعتراف کر لیتے لیکن تاریخی حقیقت کے خلاف خیال آرائی، خوش فہمی اور تاریخی حقائق کی مسخ کاری کو کچھ حیثیت نہیں دے سکتے۔

اس ضمن میں شیخ عبدالماجد پروفیسر ریاض صدیقی کی کتاب 'قرار داد پاکستان کا پس منظر' کا ایک حوالہ نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ''اسی سال 1928ء میں نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے قادیانی فرقے کے رہنما مرزا بشیر الدین محمود احمد نے ایک تجویز پیش کی اور بنگال اور شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان علاقہ قائم کرنے کا مشورہ دیا...... اقبال کا خطبہ الہ آباد اسی تجویز کی تعبیر و تشریح ہے، ص: 36۔ معلوم نہیں کہ صدیقی صاحب نے بلا تحقیق یہ بات کیسے بیان کر دی۔ ان کو اس کی تردید کرنی چاہیے۔ اقبال شناسوں اور مورخین کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے جعلی مواد کو تاریخ آزادی کا حصہ نہ بننے دیں۔

محترم ڈاکٹر وحید عشرت نے بھی علامہ اقبال کے خطوط میں دو جعلسازیوں کی نشاندہی اپنے ایک مضمون مطبوعہ اقبالیات جنوری 2001ء میں کی ہے۔ ایک علامہ اقبال کا پنڈت نہرو کے نام خط ہے اور دوسرے شیخ اعجاز احمد قادیانی کی گارڈین شپ کا مسئلہ ہے۔

تاریخی حقائق مسخ کرنے کی ایک اور کوشش 1932ء

شیخ عبدالماجد نے تاریخی حقائق کو مسخ کرنے اور اپنے رہنماؤں مرزا محمود احمد اور سر ظفر اللہ کو فرضی کریڈٹ دینے کے لئے ایک اور دعویٰ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

''ظفر اللہ نے مسلم لیگ دہلی کے سالانہ اجلاس دسمبر 1931ء میں جو خطبہ دیا اس میں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو ملا دینے اور ان کے الحاق پر غور کرنے کی عملی تجویز پیش کی۔ علامہ اقبال نے بھی آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور کے سالانہ اجلاس مارچ 1932ء میں یہی بات کی۔ راقم عرض کرتا

ہے بہت سے دیگر امور میں بھی علامہ کا خطبہ حضرت چوہدری صاحب کے خیالات کا عکس لئے ہوئے ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اس خطبے کا ''سیاسی تدبر کے شاہکار'' ہونے کی ایک وجہ یہ پرتو قرار دیا جا سکتا ہے۔(24)

علامہ اقبال کے اسی خطبے کے متعلق عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال میں کہا ہے

''حقیقت یہ ہے کہ اس خطبہ صدارت سے ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی حلقوں میں خاصی سنسنی پھیل گئی کیونکہ یہ خطبہ صاف گوئی، خلوص، رواداری اور صداقت کا مظہر تھا اور ضرورت وقت کے مطابق سیاسی تدبر کا بھی شاہکار تھا۔ اس میں علامہ نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید بھی کی اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی نمائندگی کا حق بھی ادا کر دیا۔ انہوں نے اس خطبہ میں کانگرس کی سول نافرمانی پر نکتہ چینی کی اور ہندوؤں کی غیر مفاہمانہ ضد پر اظہار افسوس کیا۔ اس خطبے میں علامہ نے نہایت بے باکانہ طور پر صاف کہہ دیا کہ حکومت برطانیہ کی حکمت عملی تذبذبانہ ہے اور فرقہ وارانہ فیصلے کے اعلان میں تاخیر کا الزام حکومت برطانیہ پر ہے۔(25)

سر ظفر اللہ اور مسلم لیگ کی صدارت

شیخ عبدالماجد نے علامہ اقبال کے مسلم کانفرنس کے صدارتی خطبے مارچ 1932 کی اہمیت کو کم کرنے اور سر ظفر اللہ کو کریڈٹ دینے کے لئے تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے۔ سر ظفر اللہ کو سر فضل حسین نے ایک سازش کے تحت مسلم لیگ کا صدر بنوایا۔ وہ جلد از جلد پہلی گول میز کانفرنس لندن سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے۔ لندن میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا محمود کو دس دسمبر 1931ء کو ایک خط لکھا کہ حضور اس کا نام مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی 28-26 دسمبر 1931ء کی صدارت کے لئے طے پا گیا ہے غالباً ایسا سیاسی موقعہ پہلے نہ ہوا ہو گا اس لئے خاکسار (ظفر اللہ) نے حضور کی منظوری کی امید میں اور اللہ تعالے سے توفیق طلب کرتے ہوئے اسے منظور کر لیا ہے اور زیادہ تر اسی رنگ میں اپنے خیالات کے لحاظ سے قبول کیا ہے کہ اس موقعہ پر مسلمانان ہند کو حضور کی زبان بن کر سیاسی مشوروں اور کسی حد تک ان کی سیاسی راہنمائی کر سکوں۔ اس لئے معروض ہوں کہ حضور کمال ذرہ

نوازی اور شفقت سے اپنا قیمتی وقت نکال کر ایڈریس کا مسودہ لکھوا دیں اور خاکسار کو بھجوا دیں۔ خاکسار اسے ترجمہ کرے گا۔ ایڈریس دونوں زبانوں میں چھپے گا۔ اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی، گو پڑھا غالباً انگریزی میں جائے گا۔ حضور اندازہ فرما سکتے ہیں کہ وقت بہت ہی مختصر بلکہ ناکافی ہے۔ مجھے پورے دن کا کام عدالت میں بھی رہتا ہے لیکن زیادہ مشکل یہ ہے کہ نہ میرے اندر وہ وسعت نظر، نہ وہ قابلیت، نہ موجودہ حالات کا وہ صحیح اندازہ اور موازنہ اور نہ آئندہ آنے والے حالات کا اندازہ ہے جو اس فرض کے کما حقہ ادا کرنے کے لئے ضروری ہے اس لئے میری ناقابلیت کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے اور موقع کے لحاظ سے بھی حضور یہ تکلیف ضرور گوارا فرما لیں''

لیگ والوں کی طرف سے'' درخواست ہے کہ بہرصورت ایسے خدام کو جو دہلی سے گزر کر جلسہ (سالانہ احمدیہ) پر جا سکتے ہیں ارشاد فرمایا جائے کہ وہ لیگ کے اجلاس میں چند وقت کے لئے زیادہ سے زیادہ شامل ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ میرے نام کا اعلان ہوتے ہی جمیعت العلماء وغیرہ شور مچانا اور مخالفت کرنا شروع کر دیں گے اور کوشش کریں گے کہ اجلاس کے دنوں میں بھی مخالفت ہو، اس لئے کوشش کرنی چاہئے کہ جماعت احمدیہ کے بہت سے ممبران شامل ہوسکیں تا کہ حاضری بھی اچھی ہو اور ریزولیوشن وغیرہ بھی حسب منشا پاس ہو جائیں۔

یہ عریضہ جلدی میں لکھ رہا ہوں اور پورے طور پر اظہار مدعا نہیں کر سکا حضور اس عریضہ کے ملنے پر اگر بذریعہ تار خاکسار کو اطلاع کرا دیں کہ یہ عریضہ شرف باریابی حاصل کر چکا ہے اور خاکسار کی گزارش قبول ہو چکی ہے تو خاکسار کی بہت سی تشویش رفع ہو جائے گی۔

ایڈریس جیسے جیسے حضور لکھواتے جائیں اگر خاکسار کو بھجوا دیں تو خاکسار ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جائے۔ ایڈریس میں سیاست حاضرہ میں مسلمانوں کی حالت، موجودہ سیاسی حالات پر تبصرہ اور آئندہ کے کام کے متعلق بھی ذکر ہوگا۔ آئندہ ایک باقاعدہ نظام اور اتحاد کے ساتھ کام کرنے پر اگر حضور پسند فرمائیں تو خصوصیت سے زور دے دیں''(26)

سر ظفر اللہ کا مسلم لیگ کے دلی اجلاس کا صدارتی خطبہ مرزا محمود کا تیار کردہ تھا۔ اجلاس 26 دسمبر

1931ء کو فتح پوری مسجد کے جیون ہال میں ہونا تھا لیکن مسلمانوں نے ظفر اللہ کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا اور ہال پر قبضہ کر لیا۔ جس پر یہ اجلاس نواب علی کی کوٹھی پر منعقد ہوا اس میں تقریباً سو افراد شامل تھے۔ صدارتی خطبہ میں ظفر اللہ نے فیڈریشن، وفاقی مجالس قانون، مالیات، حق رائے دہی، وفاقی عدالت، آل انڈیا سروس، دفاع، صوبوں کی خود مختاری، مسلمانوں کے اساسی حقوق وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ (27)

یہ تمام امور پہلے ہی سے مسلم جماعتوں اور زعماء کی طرف سے پیش کئے جا رہے تھے۔ انہوں نے کشمیر میں مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کا ذکر کیا اور ہندوستان میں بڑھتی ہوئی انقلابی (کمیونسٹوں کی) سرگرمیوں اور بدامنی (انارکی) کے واقعات پر تشویش کا اظہار کیا اور ان کے سدباب پر زور دیا۔ دوسرا اجلاس 27 دسمبر کو ہوا جس میں پہلے کے مقابلے یعنی سو افراد سے بھی کم حاضری تھی۔ اس میں لیگ کے آئین میں ترمیم کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی اور لیگ کے بنیادی مقصد میں تبدیلی کی گئی۔ اب تک لیگ کا مقصد، پرامن اور جائز ذرائع سے ہندوستان کے لئے سوراج (آزادی) تھا اس کو سب کمیٹی نے بدل کر ''ہندوستان کے لئے مکمل ذمہ دارانہ حکومت کر دیا جو پرامن اور جائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی اور مسلمانوں کو مناسب تحفظات دیئے جائیں گے۔'' الہ بادیوپی کے مسلم رہنما ڈاکٹر ایم۔ یو۔ ایس جنگ نے سوراج کو برقرار رکھنے پر زور دیا اور مسٹر صابری نے مکمل آزادی کی تجویز پیش کی لیکن ان ترمیمات کو مسترد کر دیا گیا۔ ایک اہم قرارداد یہ تھی کہ مسلم لیگ ایک کمیٹی مقرر کرے جو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی سے گفت و شنید کے بعد ان دنوں کو آپس میں مدغم کر دے۔ یہ کمیٹی پہلی مارچ 1932ء تک لیگ کونسل کو رپورٹ پیش کرے جس کے بعد ان کو ملانے کے مناسب اقدامات کئے جائیں گے اور نئی تنظیم کا ایک نیا دستور مرتب کیا جائے گا۔ اس کمیٹی کے ممبران 1) سر ظفر اللہ صدر مسلم لیگ 2) سر محمد یعقوب سکیریٹری لیگ 3) خان صاحب ایس ایم عبداللہ جائنٹ سکیرٹری لیگ 4) مرزا اعجاز حسین جائنٹ سکریٹری لیگ تھے۔

ظفر اللہ کے صدارتی خطبہ کا علامہ اقبال کے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور

21 مارچ 1932ء سے موازنہ کیا جائے جس میں ایک ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی تو معلوم ہو گا کہ ان کا خطبہ نہایت جامع، موثر اور حقائق پر مبنی دستاویز ہے اس میں وفاق، صوبائی خود مختاری، مسلمانوں کے سیاسی خدشات، جداگانہ انتخابات کی ضرورت، مسلم صوبوں کے مطالبات کی تائید، کانگریس کے رویہ پر تنقید، برطانوی حکومت کو جائز مسلم مطالبات تسلیم کرنے کی ترغیب، کشمیر کی حالت زار، ہندوستان کے معاشرتی اور معاشی مسائل وغیرہ پر گراں قدر تبصرے اور تجاویز موجود ہیں(28) اور آخر میں مسلمانوں کو پانچ تجاویز پیش کی گئی ہیں ان میں پہلی تجویز یہ ہے۔

مسلمانوں میں جو سیاسی انتشار ہے اس کو ختم کرنے کے اقدامات کئے جائیں اس کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم ہو جس کی تمام ملک میں صوبائی اور علاقائی شاخیں ہوں۔ دوسرے ایک قومی فنڈ قائم کیا جائے۔ تیسرے یوتھ لیگ اور والینٹر کورز بنائے جائیں چوتھے ہندوستان کے بڑے قصبوں میں مردوں اور عورتوں کے ثقافتی ادارے (کلچرل انسٹی ٹیوٹ) بنائے جائیں جو غیر سیاسی ہوں اور نوجوانوں کی روحانی قوتوں کو بیدار کریں اور آخر میں انہوں نے علماء کی ایک تنظیم بنانے کی ضرورت بیان کی جس میں وکلاء بھی شامل ہوں تا کہ اسلامی قوانین کی از سر نو تشریحات پیش کریں۔(29)

ظفر اللہ سر فضل حسین کے اشارے پر مسلم لیگ کا وجود ختم کرنا چاہتے تھے۔ ظفر اللہ کی صدارت سے اختلاف کی بناء پر جب پشاور کے ایک بیرسٹر عبدالعزیز نے مسلم لیگ کا اپنا دھڑا قائم کر لیا تو فضل حسین نے اس کے اجلاس میں ملک فیروز خان نون کے ذریعے ایک قرارداد پیش کرنی چاہی جس کا مقصد لیگ کے وجود کو سرے سے ختم کر دینا تھا لیکن عبدالعزیز کو اس کا پہلے سے علم ہو گیا اور انہوں نے فضل حسین کی سازش ناکام بنا دی (30)

سر فضل حسین کی ظفر اللہ کی وساطت سے لیگ کی حیثیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی باقاعدہ سازش جس میں ایک کمیٹی بنا کر آئینی طور پر اس کا خاتمہ کرنا تھا اور علامہ اقبال کی محض ایک تجویز کہ مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت کے جھنڈے تلے متحد ہونا چاہیے آپس میں کیا مطابقت رکھتی

ہیں۔ 1932ء میں سر فضل حسین بیمار پڑ گئے اور اسی سال سر ظفراللہ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے عارضی ممبر بن گئے اس لئے یہ سازش پروان نہ چڑھ سکی۔

شیخ عبدالماجد کا دوسرا دعویٰ کہ علامہ اقبال کا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور 1932ء کا خطبہ صدارت، ظفراللہ کے مسلم لیگ دلی دسمبر 1931ء کے خطبہ صدارت کا عکس لئے ہوئے ہے، تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی بدترین مثال ہے۔ ان فرضی باتوں سے قادیانی اقبال دشمنی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور اپنی تہی دامنی اور اپنے اکابر کے منفی کردار پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یہ شگوفہ بھی پہلی دفعہ شیخ عبدالماجد نے چھوڑا ہے ورنہ قادیانی لٹریچر میں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا خطبہ اپنی علمیت، اپنے مطالب کی ہمہ گیری اور جذبہ انگیزی کے اعتبار سے الہ آباد والے خطبے سے بہتر تھا(31)۔ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ ظفراللہ کا خطبہ یکسر مسترد کرنے کے قابل ہے۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں کے بعض مطالبات کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے لیکن علامہ اقبال کے خطبے سے اس کا تقابل کیا جائے تو اسکی وقعت بہت کم رہ جاتی ہے۔ علامہ اقبال کے خطبہ میں مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کی نہایت موثر انداز میں وکالت اور ان کے حقیقی جذبات کی نمائندگی کی گئی ہے۔

قادیان کے سرکاری اخبار الفضل نے اس خطبے پر علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کیا اور خود شیخ عبدالماجد نے اس کا حوالہ دیا ہے:

''ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں بحیثیت صدر جو خطبہ پڑھا.....اس میں مسلمانوں کے جذبات کا حق ادا کیا ہے۔''

''اب جب کہ مسلمانوں نے بڑے محرکات کے باوجود کانگرس میں شمولیت اختیار نہیں کی اس وقت تک اپنے حقوق و مطالبات کے لئے پرامن اور آئینی جدوجہد کر رہے ہیں کس قدر رنج کی بات ہے کہ اگر حکومت برطانیہ منصفانہ رویہ اختیار نہ کرے غرض حکومت کے سامنے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے امور کھول کر رکھ دئے گئے ہیں ان کے عواقب و نتائج سے بھی پوری طرح آگاہ کر دیا گیا ہے اب یہ حکومت کا کام ہے جلد سے جلد صحیح راستہ اختیار کر کے اپنی روایتی انصاف پسندی کا

ثبوت دے یا متزلزل اور غیر مستقل حکمت عملی پر کاربند رہ کر تشویش ناک صورت حال میں اضافہ کرتی رہے"(32)

کشمیر کمیٹی اور علامہ اقبال

قادیانی ایک طویل عرصے سے کشمیر کے معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد (1885-1925)ء میں حکیم نور الدین برطانوی ریذیڈنٹ کے اشارے پر جاسوسی کے فرائض سرانجام دینے کی پاداش میں کشمیر سے نکالے گئے۔(33) مرزا محمود نے کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے تین سفر 1909, 1921 اور 1929ء کئے۔"تاریخ احمدیت" کے مطابق کشمیر میں ان کی دلچسپی کی چار وجوہات تھیں۔

1- انہوں نے کشمیر کے سفروں کے دوران کشمیریوں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔

2- کشمیر میں پچاس ہزار احمدی تھے۔ وہاں کی جماعت کو قریب سے دیکھا۔

3- سکھ حکومت کے عہد میں امام دین گورنر ان کے دادا مرزا غلام مرتضیٰ کو بطور مددگار کشمیر لے گئے تھے۔

4- حکیم نور الدین کشمیر میں شاہی طبیب تھے موجودہ مہاراجہ ہری سنگھ ڈوگرہ کے باپ امر سنگھ اور چچا رام سنگھ ان سے قرآن پڑھنا چاہتے تھے اس لئے ان کو کشمیر سے نکالا گیا۔(34)

1930ء میں قادیانی پریس میں کشمیر کے سیاسی حالات کے متعلق خبریں اور تبصرے چھپنے لگے۔ مرزا محمود احمد نے اس سلسلہ میں ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کیا اور مسلم زعماء کو خطوط لکھے۔ ایک خط علامہ اقبال کو لکھا جس میں ایک مسلم بورڈ اور کشمیریوں کی مدد کرنے کی ضرورت بیان کی گئی تھی۔ مبینہ بورڈ کے معاملے میں علامہ کے بعض تحفظات تھے البتہ کشمیری مسلمانوں کی امداد کے مسئلے پر انہوں نے 5 ستمبر 1930ء کو لکھے گئے اپنے خط میں کہا:

چونکہ آپ کی جماعت منظم ہے اور بہت سے مستعد آدمی جماعت میں موجود ہیں اس واسطے آپ بہت مفید کام انجام دے سکیں گے"۔(35)

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ قادیانی ایک منظم جماعت ہیں وہ مرزا محمود کا ہر حکم مانتے ہیں۔ ان کے پاس مالی وسائل ہیں اور وہ حکومت برطانیہ کے بہت قریب ہیں بلکہ ان کے اعضاء د جوارح ہیں، اگر ان کے ذریعے کشمیریوں کی کوئی مدد ہو سکے تو اس میں حرج کی بات نہیں۔ انہوں نے قادیانیوں کی کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے جدو جہد کو اخلاص پر مبنی سمجھا لیکن قادیانیوں نے ان کے ہی نہیں تمام مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اور جلد ہی اپنے اصل مقاصد کو آشکار کر دیا۔ وہ اپنی جماعتی اغراض کی تکمیل کے ساتھ ساتھ برطانوی کھیل کھیل رہے تھے۔

علامہ اقبال کے لئے یہ ایک تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو قادیانیوں نے جس انداز سے اپنی سیاسی اغراض اور جماعتی مفاد کے لئے استعمال کیا اس نے علامہ اقبال کو جماعت احمدیہ قادیان کے سیاسی کردار، مرزا محمود کی منفرد مذہبی پوزیشن، ان کے پیروکاروں کی عقیدت اور اندھی اطاعت اور ان کی محض جماعتی کاموں میں دلچسپی جیسے امور پر غور کرنے میں مدد دی۔

اب ہم کشمیر کمیٹی کے قیام، علامہ اقبال کے مخلصانہ کردار اور قادیانی سازشوں کا ذکر کرتے ہیں۔

1930ء میں کشمیر میں داخلی حالات بہت خراب تھے۔ ڈوگرہ راج میں مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا، وہ نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے اہم خطہ تھا۔ روس کے توسیع پسندانہ مقاصد اور ہندوستان میں کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے برطانوی حکومت اس پر اپنا مکمل سیاسی تسلط جمانا چاہتی تھی لیکن معاہدہ امرتسر 1846ء کی بعض دفعات اس کے عزائم میں حائل تھیں اس کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں کے چیمبر آف پرنسز Chamber of Princes کی موجودگی میں انگریز کشمیر میں براہ راست مداخلت نہ کر سکتے تھے۔

7 جون 31ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ

مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر کونسل میں ایک مسلمان کو نشست دے اور صیغہ تعلیم کا ممبر بنائے۔ اس کے لئے علامہ اقبال کا نام پرزور طریقے سے پیش کیا گیا۔(36)

برطانوی سامراج نے اپنے سیاسی عزائم اور خارجہ پالیسی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے قادیانیوں کی خدمات حاصل کیں۔ وہ ایک ایسی جماعت تھی جو ان کی انتہائی وفادار اور تابع فرمان تھی۔ وہ پہلے ہی سے ہندوستان میں اپنی طاقت کا مرکز قائم کرنے کی فکر میں تھے (37) اور ان کے مبلغ وسط ایشیاء اور روسی علاقوں میں تبلیغ کے نام پر برطانوی حکومت کی خدمت اور جاسوسی کرنے کے جرم میں قید و بند اور ملک بدری کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ انگریز کے اشارے پر کشمیر میں قدم جما کر قادیانی اس علاقے میں پہلے سے قائم 80 کے قریب احمدیہ مراکز کو فعال بنا سکتے تھے اور پچاس ہزار کشمیریوں کو متحرک کر سکتے تھے نیز نئے مراکز قائم کر سکتے تھے۔ وہ کشمیر میں موجود قادیانی جماعت کو منظم و مستحکم کر سکتے تھے۔ مزید کشمیریوں کو قادیانی بنا سکتے تھے اور کشمیر میں تحریک اٹھا کر مہاراجہ کشمیر کو انگریز کے آگے جھکنے پر مجبور کر سکتے تھے، جس کے لئے وہ تیار نہ تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ مستقبل میں پنجاب کی سیاست میں اپنا کردار متعین کر سکتے تھے۔ مرزا محمود 1927ء کے بعد مذہبی رہنما کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما بننے کے لئے بیتاب تھے۔ اس کے لئے انہوں نے سیاسی معاملات پر رائے زنی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

کشمیر کمیٹی

سر فضل حسین کے اشارے پر 25 جولائی 1931ء کو شملہ میں مسلم زعماء کے ایک اجلاس میں کشمیر کمیٹی قائم ہوئی۔(38) علامہ اقبال نے مرزا محمود احمد خلیفہ قادیان کے صدر بننے کی تجویز پیش کی۔ قادیانی پہلے ہی سے کمیٹی پر قبضہ کے لئے سرگرم تھے اور موقع کی تلاش میں تھے کہ انہیں کمیٹی کی صدارت یا ڈکٹیٹر شپ مل جائے۔ علامہ اقبال نے کشمیر کاز کے لئے اپنے دیرینہ خلوص اور نیک نیتی کی بناء پر مرزا محمود کو صدارت کی پیش کش کی۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ قادیانی ایک منظم جماعت ہیں، وہ ایک سربراہ کی مکمل اطاعت کرتے ہیں، ان کے پاس مالی وسائل ہیں اور سب سے بڑھ کر

انگریز سے ان کے گہرے روابط ہیں اگر ان کی وساطت سے کشمیری مسلمانوں کو بعض سیاسی حقوق مل جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کشمیری ہونے کے ناطے وہ کشمیریوں کی فلاح و بہبود کے لئے گذشتہ کئی سالوں سے سرگرم عمل تھے۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی سے مکمل تعاون کیا۔ کشمیریوں کی امداد کے لئے جلسے کئے، چندوں کی اپیل کی اور دوسری گول میز کانفرنس کے دوران وزیر ہند سے ملاقات کی۔

کشمیر کمیٹی نے جولائی 1931ء میں اپنا باقاعدہ کام شروع کیا تو چند ماہ بعد اس کی کارکردگی دیکھ کر مسلم زعماء کو پتہ چلا کہ قادیانی اپنا اور برطانوی سرکار کا وضع کردہ سیاسی کھیل کھیلنے کے لئے کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو استعمال کر رہے ہیں اور انہوں نے کشمیر میں تبلیغی اڈے قائم کر کے غریب کشمیریوں کے دین وایمان پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ (39) وہ مرزا محمود کو کشمیر کے نجات دہندہ، اسیروں کی رستگاری کرنے والے رہنما (40) اور ایک عظیم سیاسی قائد کے طور پر پیش کر رہے ہیں جن کی قیادت اور خلافت کو مسلم زعماء خصوصاً علامہ اقبال جیسی ہستی تسلیم کر چکی ہے اور کشمیر میں جو مالی امداد آرہی ہے اور کشمیری مسلمانوں کے حقوق کے لئے جو جنگ لڑی جارہی ہے وہ ان ہی کے دم قدم سے ہے۔ کشمیر میں 'الفضل' قادیان کی خریداری کئی گنا بڑھ گئی اور اس کی سینکڑوں کاپیاں مفت تقسیم کی جانے لگیں۔ بعض مسلمان ایک وفد لے کر مرزا محمود کے پاس قادیان گئے۔ انہوں نے درخواست کی کہ الفضل چونکہ جماعت احمدیہ کا ترجمان ہے اس لئے کشمیر کمیٹی کی خبروں کی اشاعت بند کر دے، اس کے لئے کمیٹی اپنا الگ اخبار نکالے کیونکہ صدر کشمیر کمیٹی نے مسلمان رہنماؤں اور مخیّر حضرات سے کافی رقومات حاصل کر لی ہیں لیکن وہ اس تجویز کو نہ مانے۔ (41)

مرزا محمود نے یکم اگست 1931ء کو وائسرائے لارڈ ولنگڈن سے ملاقات کی اور کشمیر کے معاملات میں برطانوی مداخلت کی تجویز پیش کی جو انہوں نے نہ مانی پھر ایک اور تجویز پیش کی کہ ایک مسلم وفد مہاراجہ کشمیر کے پاس جا کر گفت وشنید کرے اور مسلم مطالبات پیش کرے۔ اس بات کو وائسرائے نے پسند کیا۔ وفد کے ممبران کو منتخب کرتے وقت مرزا محمود نے پہلے علامہ اقبال کا نام اس

میں شامل نہ کیا لیکن بعد میں شامل کر لیا۔ علامہ اقبال مہاراجہ کشمیر کے پاس وفد لے جانے کے حق میں نہ تھے، انہوں نے اس تجویز کو نہ مانا اور ایک تین رکنی وفد لندن بھیجنے کی تجویز پیش کی جو گول میز کانفرنس میں کشمیر کے مسئلہ پر سیکرٹری آف سٹیٹ کو صورت حال سے آگاہ کرے۔(42)

14 اگست 1931ء کو ہندوستان میں کشمیر ڈے منایا گیا اور کشمیری مسلمانوں سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کو موثر بنانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مسلم رہنماؤں کو کشمیر کمیٹی کے حقیقی کردار کا جائزہ لینے کا بخوبی موقع مل گیا۔ علامہ اقبال بھی اس بات کا مشاہدہ کر رہے تھے کہ قادیانی بڑی عیاری سے کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو اپنے جماعتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ قادیانی ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح کشمیریوں کو بھی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ انہیں کشمیری مسلمانوں کی جگہ کشمیری بھائی کہتے تھے۔ ان کی مسئلہ کشمیر سے ہمدردی کسی خلوص پر مبنی دکھائی نہیں دیتی تھی اس لئے اس کی روک تھام ضروری تھی۔

خوش قسمتی سے کشمیر کمیٹی کے اصل مقاصد اور قادیان کے سیاسی عزائم کو آشکار کرنے کے لئے مجلس احرار اسلام کی صورت میں ایک جماعت معرض وجود میں آئی۔ 1931ء میں یہ تنظیم منظر عام پر آ گئی۔ اس کے شعلہ بیان مقررین سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ماسٹر تاج الدین انصاری وغیرہ نے اعلان کیا کہ کشمیر کمیٹی پر قادیانیوں نے تسلط جما رکھا ہے اور وہی اس کے کرتا دھرتا بنے بیٹھے ہیں۔ وہ کشمیری مسلمانوں کی امداد کے نام پر اپنے اور برطانوی سامراج کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔(43) برطانیہ کا مقصد ایک تو مہاراجہ پر دباؤ بڑھا کر گلگت اور ملحقہ علاقوں کا کنٹرول حاصل کرنا تھا تا کہ روسی خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے دوسرے اس کا خیال تھا کہ جس طرح وسط ایشیاء اور ہندوستان کے شمالی علاقوں میں اسماعیلی اپنے سربراہ آغا خان کی ہدایت پر انگریزوں کے لئے کام کر رہے تھے۔(44) اسی طرح قادیانی مرزا محمود کے اشارے پر کشمیر کے طول و عرض میں کام کر سکتے تھے۔ قادیانیوں نے کشمیر کی ابھرتی ہوئی قیادت خصوصاً شیخ عبداللہ کو اپنا

ہمنوا بنا رکھا تھا اور اس کے ذریعے کشمیر میں سیاسی تحریک اٹھا رہے تھے۔ شیخ عبداللہ قادیان سے مالی امداد اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مسلم زعماء کو یقین ہو گیا کہ مرزا محمود کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنانا سیاسی لحاظ سے غلط فیصلہ تھا، اس طرح قادیانیوں کو پہلی دفعہ کھل کر سیاست میں آنے کا موقع ملا ہے اور ان کی قدیم سے چلی آ رہی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی ختم ہو رہی ہے۔ مرزا محمود کا ایک سیاست دان کے طور پر امیج ابھر رہا ہے اور انہیں احساس ہو چلا ہے کہ وہ سیاسی تحریکوں کی حمایت اور قیادت سے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔

مجلس احرار نے اپنی الگ کشمیر پالیسی وضع کی۔ انہوں نے مولانا مظہر علی اظہر کی قیادت میں کشمیر چلو تحریک اٹھا کر ستمبر 1931ء میں ہزاروں رضا کار جموں اور وادی کشمیر میں داخل کر دیئے، کئی گرفتار ہوئے، کئی کشمیر سے نکالے گئے اور 22 شہید ہوئے۔ یہ ایک عظیم تحریک تھی۔ (45)

وزیر اعظم کشمیر ہری کشن کول نے برطانوی ریذیڈینٹ کشمیر سے مشورہ کے بعد پنجاب حکومت سے درخواست کی کہ ان جتھوں کے کشمیر میں داخلے کو روکے تا کہ کشمیر میں امن و امان تباہ نہ ہو۔ حکومت بھی اسی انتظار میں تھی۔ انہوں نے احرار جتھوں کو روکا لیکن احرار رضا کار جان پر کھیل کر کشمیر میں داخل ہوتے رہے۔ احرار کے کانگریسی قیادت سے روابط تھے۔ کانگریسی رہنماؤں اور خود مہاتما گاندھی نے لندن سے احرار کی تحریک کی مخالفت کی لیکن انہوں نے اس کو نظر انداز کر کے اپنی تحریک جاری رکھی۔ (46)

نومبر 1931ء میں جمعیت العلمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ نے احرار اور کشمیر انتظامیہ میں گفت و شنید کرانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔ اس سلسلے میں جو خط و کتابت احرار اور وزیر اعظم کشمیر کول کے درمیان ہوئی اسے مجلس احرار نے شائع کر دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کول کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے میں مخلص نہ تھا۔ کشمیر میں انگریز کے سیاسی عزائم کا اس بات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ گول میز کانفرنسوں کے دوران ایک تجویز زیر غور آئی جس کے تحت مہاراجہ ہری سنگھ سے وادی کشمیر اور گلگت حاصل کر کے سر آغا خان کو اس کا حکمران بنانا تھا اور مہاراجہ کو پنجاب کا کانگڑہ کا علاقہ

دیا جاتا تھا۔ سکریٹری آف سٹیٹ سر سیموئل ہور نے یہ تجویز وائسرائے ہند لارڈ ولینگڈن کو روانہ کی لیکن مہاراجہ کشمیر نے اس کی سخت مخالفت کی۔ وہ تقسیم کشمیر کے کسی بھی منصوبے کو اپنی حاکمیت اور معاہدہ امرتسر کی شرائط کے منافی سمجھتا تھا۔(47)

احرار رہنما عوام کی زبان میں بات کرتے تھے ان کے حقیقی مسائل اور ان کے مطالبات کو بیان کرتے تھے وہ اشتراکی نوعیت کے نظریات کا پرچار کرتے تھے۔ تاشقند میں قائم روس کے تربیتی کیمپوں میں انقلاب کا درس حاصل کرنے والے اشتراکی عناصر سے ان کے رابطے تھے(48) شمال مغربی سرحدی علاقے میں مسٹر داس، مسٹر صفدر، کامریڈ غلام محمد جیسے لوگ روس کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔ ان کی کشمیر میں اٹھنے والی تحریکوں پر نظر تھی۔ جس زمانے میں احرار نے کشمیر میں تحریک چلائی اور وزیراعظم ہری کشن کول سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس وقت لندن میں گول میز کانفرنس جاری تھی۔ مہاراجہ کشمیر لندن میں موجود تھا، برطانوی رائے عامہ اس کے خلاف تھی کیونکہ اس نے برطانیہ کی مخالفت اور کانگریس کے حق میں تقریر کی تھی۔ وہ کشمیر میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔(49) لندن میں قیام کے دوران اس کے ایک جنسی سکینڈل کی خبر برطانوی پریس میں شائع ہوئی لیکن اس کا نام مخفی رکھا گیا اور مسٹر اے (A) کے نام سے یہ باتیں منظر عام پر آئیں۔

کشمیری عوام کی طویل جدوجہد اور سیاسی دباؤ کے نتیجے میں مہاراجہ کشمیر سیاسی اصلاحات کے لئے سر گلانسی کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کرنے پر راضی ہوگیا۔ 1932ء میں مہاراجہ کشمیر نے گلانسی کمیشن کی بہت سی سفارشات مان لیں ایک اور اہم پیش رفت ایک متعصب اور مسلمانوں کے مخالف وزیراعظم ہری کشن کول کی جگہ مارچ 1932ء میں کرنل کالون کا بطور وزیراعظم تقرر تھا۔ کشمیری مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی جس کا پہلا اجلاس اکتوبر 1932ء کو ہوا۔

گلانسی کمیشن کے تقرر میں علامہ اقبال کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے

بیان کے مطابق سر حمید اللہ نواب بھوپال مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے۔ علامہ اقبال کے نواب بھوپال سے قریبی تعلقات تھے ان کے ذریعے علامہ اقبال نے مہاراجہ کشمیر کو گلانسی کمیشن مقرر کرنے پر راضی کر لیا تھا۔(50) جس کی سفارشات پر عمل درآمد کے بعد کشمیر میں مسلمانوں کو سیاسی حقوق ملے۔

1933ء میں پنجاب کے مسلم رہنماؤں نے کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مطالبہ کیا کہ ایک تو کمیٹی کا دستور تیار کیا جائے تا کہ وہ کسی ضابطے کے تحت کام کرے اور قادیانی اپنی من مانی کاروائیاں نہ کر سکیں دوسرے اس کا غیر قادیانی صدر منتخب کیا جائے۔ 6 مئی 1933ء کو مسلم اراکین کمیٹی نے ایک خصوصی اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا۔ مرزا محمود اس تجویز سے سخت برہم ہوئے، انہوں نے جان لیا کہ ان کی صدارت خطرے میں ہے اور وہ آئندہ کمیٹی کے نام کو اپنے جماعتی مفاد کے لئے استعمال نہیں کر سکیں گے۔ 7 مئی کو سیسل ہوٹل لاہور میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا مرزا محمود نے بدلتے حالات کے پیش نظر استعفیٰ دے دیا۔ ان کو معلوم تھا کہ ممبروں کی بھاری اکثریت ان کے خلاف ہے۔ اس موقع پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ کمیٹی کے پاس کوئی فنڈ نہیں بلکہ وہ مقروض ہے۔ علامہ اقبال قائم مقام صدر اور ملک برکت علی کمیٹی کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ قادیان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور علامہ اقبال کی کردار کشی اور ان کو برا بھلا کہنے کی در پردہ مہم کا آغاز کر دیا گیا۔ قادیانیوں نے الزام لگایا کہ علامہ اقبال ہی نے دو سال قبل حضور (مرزا محمود) کو اصرار کر کے صدر بنایا تھا اور اب خود صدر بن بیٹھا ہے۔ صدارت چھن جانے کے بعد مرزا محمود کی کشمیریوں سے ہمدردیاں سرد پڑ گئیں۔ انہوں نے قادیانی وکلاء کو حکم دیا کہ وہ کشمیریوں کے مقدمات کی پیروی بند کر دیں اور کمیٹی کی کسی قسم کی سرگرمی میں حصہ نہ لیں یہ ان کی مفاد پرستی کی بیّن دلیل تھی۔ کشمیر کے کئی چھوٹے بڑے لیڈر جو قادیان سے باقاعدہ مالی امداد لے رہے تھے علامہ اقبال کی صدارت کے خلاف شور مچانے لگے۔ شیخ عبداللہ بھی اس سے ناخوش تھے۔ کشمیر میں سرگرم قادیانی مبلغوں نے ہر ایرے غیرے نام نہاد کشمیری لیڈر سے مرزا محمود کو خط لکھوائے جن میں درخواست کی گئی تھی کہ حضور واپس آیئے اور کمیٹی کی صدارت سنبھالئے آپ کے بغیر گلشن کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اقبال کے پاس

نہ تو ورکر ہیں نہ پیسہ ہے نہ جماعتی تنظیم ہے نہ آپ جیسے انگریز سے رابطے ہیں نہ آپ جیسا سیاسی تدبر رکھتا ہے اسے کشمیری رہنماؤں خصوصاً شیخ عبداللہ کا تعاون بھی حاصل نہیں ہے وہ جلد ہی کشمیر کمیٹی کی صدارت کو چھوڑ جائے گا۔(51) پنجاب کے بعض مسلم رہنماؤں نے سر فضل حسین کی خوشنودی کے لئے مرزا محمود کو خطوط لکھے کہ وہ کمیٹی میں واپس آ جائیں چونکہ قادیانیوں کو اپنی جماعتی اور سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ ابھی مرزا محمود کی صدارت والی 'اصلی تے وڈی' کشمیر کمیٹی قائم ہے، اقبال والی نئی کشمیر کمیٹی ہے جس کے وہ صدر بن بیٹھے ہیں۔ علامہ اقبال کی صدارت کو ناکام بنانے کے لئے قادیانیوں نے کشمیر کے اندر قیادت کا بحران اور داخلی انتشار پیدا کیا۔ میر واعظ یوسف شاہ قادیانیوں کے خلاف تھے ان کے خلاف بیان بازی کے لئے انہوں نے میر واعظ ہمدانی گروپ کھڑا کر دیا جو شیخ عبداللہ کا ہمنوا تھا۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران کشمیریوں کی ہر ممکن مدد کی، انہوں نے ان کے مقدمات کی پیروی کے لئے وکلاء بھجوائے، فنڈ جمع کئے اور وائسرائے ہند کو تار روانہ کئے۔ 4 جون 1933 کو برکت علی ہال لاہور میں علامہ اقبال کی زیر قیادت کشمیر کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا اس میں مرزا محمود اور لاہوری جماعت کے مرزا یعقوب بیگ نے شرکت کی، اس میں تجویز پیش کی گئی کہ کشمیر میں متحارب طبقات (میر واعظ یوسف شاہ اور ہمدانی گروپ) میں صلح کرانے کے لئے ایک 10 رکنی مصالحتی بورڈ کشمیر جائے اس میں علامہ اقبال شامل ہوں۔(52)

7 جون 1933ء کو علامہ اقبال نے ایک بیان میں کہا کہ بعض کشمیری رہنما لاہور آئے ہیں۔انہوں نے کشمیر کے حالات پر مختلف خبریں سنائی ہیں وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں اور کشمیری مسلمانوں کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ (ہم انہیں سمجھائے دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ قادیانی آلہ کاروں نے کشمیر کمیٹی توڑنے، ان کی صدارت ختم کرنے اور ان کو بدنام کرنے کے لئے کیا۔مصنف) اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اس چال کے پیچھے کچھ بھی ہو وہ اس واقعے کے متعلق متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ کشمیر کمیٹی کے ارکان اتنے

بے وقوف نہیں کہ اس دام میں پھنس جائیں گے جو ان کے لئے بچھائے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپیل کی کہ کشمیری مسلمان آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کریں۔ کشمیر میں ایک سیاسی خیال کی حامل متفقہ جماعت ہی ان کے مفاد کی ضامن ہوسکتی ہے۔(53) علامہ اقبال قادیانیوں کی درپردہ سازشوں سے آگاہی حاصل کرتے جا رہے تھے۔

مہاراجہ کشمیر کی حکومت پہلے ہی سے کشمیر کمیٹی جیسی تنظیموں کے خلاف تھی۔ اس نے برطانوی ریذیڈنٹ مقیم کشمیر کے ذریعے پنجاب حکومت پر دباؤ ڈالا کہ کمیٹی کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرے۔ علامہ اقبال کے صدر بننے کے بعد حکومت پنجاب ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی اور ان پر اور ان کے ساتھیوں پر مقدمات قائم کرنا چاہتی تھی لیکن اس تجویز پر عمل درآمد نہ کیا گیا کیونکہ انٹیلی جنس کی رپورٹوں سے پتہ چلتا تھا کہ کشمیر کمیٹی مائل بہ پرواز نہیں ہوسکتی۔(54) 4 جون 1933ء کے اجلاس کی تجویز کے مطابق جس وفد کو مذہبی اور سیاسی رہنماؤں میں مصالحت کے لئے کشمیر جانا تھا اس کی حکومت کشمیر نے اجازت نہ دی۔ حکومت خاص طور پر علامہ اقبال کے کشمیر جانے کے خلاف تھی۔ مرزا محمود کی سازشوں، کشمیر اور پنجاب میں سرگرم قادیان نواز عناصر کی چالوں، قادیانیوں کے کشمیر کمیٹی سے مکمل طور پر عدم تعاون، مالی وسائل کی کمی، حکومت پنجاب کی ناپسندیدگی اور سر فضل حسین کی سیاسی حکمت عملی کے نتیجے میں 20 جون 1933ء کو علامہ اقبال نے مجبوراً کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔(55)

اس اعلان کے ساتھ ہی الفضل قادیان اور پنجاب کے قادیانیت نواز پریس نے شور مچا دیا کہ علامہ اقبال کو آخر کار استعفیٰ دینا ہی تھا۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جو کام مرزا محمود نے کئے وہ اپنی بے بضاعتی کے باعث ایسے کام کیسے انجام دے سکتے تھے۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران علامہ اقبال کو قادیانیوں کے مذہبی معتقدات اور سیاسی کردار کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اب وہ کھل کر ان کے مخالف ہو چکے تھے۔

20 جون 1933ء کو کمیٹی سے استعفیٰ دیتے وقت علامہ اقبال نے جو بیان دیا اس میں

قادیانیوں کے روپیے، کشمیر کمیٹی کو دولخت کرنے کی ان کی سازش اور کمیٹی کی کارروائیوں سے عدم تعاون پر افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ قادیانی صرف مرزا محمود کا حکم مانتے ہیں اور ان کے کہنے پر کام کرتے ہیں، ان کو کشمیریوں سے حقیقی ہمدردی نہیں ہے۔ ان کی صدارت کے مختصر عرصے میں قادیانی ورکروں نے تمام کام ٹھپ کر دیا، مقدمات کی پیروی ختم کر دی اور اعلان کیا کہ وہ کسی کمیٹی کو نہیں مانتے وہ صرف اپنے خلیفہ کا حکم مانتے ہیں، مقدمات کی پیروی ترک کرنے میں ظفر اللہ پیش پیش تھے۔ کشمیر کمیٹی کے مینڈیٹ کی بنیاد پر بعض قادیانی مبلغوں شیخ بشیر احمد، زین العابدین ولی اللہ شاہ، صوفی عبدالقدیر وغیرہ نے برطانوی ریذیڈنٹ مقیم کشمیر لیٹمر Latimer اور کرنل بیلی کے اشاروں پر کام کیا۔ کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دینے کے متعلق ایک بیان (21 جون) میں علامہ اقبال نے ایک کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو عوام کی تائید سے بنے اور کشمیری مسلمانوں کی مدد جاری رکھے۔

28 جون 1933ء کو مفتی محمد صادق ناظر امور خارجہ جماعت قادیان نے ایک بیان دیا کہ علامہ اقبال نے جو نئی کشمیر کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا ہے وہ نامناسب ہے یہ صرف لاہور کے عوام کا انتخاب ہو گا۔ احمدی کمیٹی کے نئے آئین کی تشکیل میں ووٹ نہیں دیں گے اگر پھر بھی اقبال کہتے ہیں کہ احمدیوں کا اس کمیٹی میں حصہ لینا منظر ہے تو وہ کمیٹی سے مستعفی ہو جائیں گے۔ (56)

جولائی 33ء میں لاہور میں ایک جلسہ منعقد کر کے غیر احمدیوں پر مشتمل ایک کشمیر کمیٹی بنائی گئی، علامہ اقبال اس کے صدر تھے۔ لاہوری احمدی ڈاکٹر یعقوب بیگ نے (57) اگست 1933ء کے پیغام صلح میں ایک بیان دیا کہ کشمیر کمیٹی سے احمدیوں کو نکالنا ہمالیہ جتنی بڑی غلطی ہے۔ مرزا محمود احمد نے کمیٹی کے لئے بہت خدمات انجام دی ہیں ان کو کمیٹی میں قومی رکن کے طور پر الگ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کشمیر کمیٹی کو مسلم جماعتوں کا نمائندہ ادارہ ہونا چاہیے وہ قادیان اور لاہور جماعت کے افراد کو ساتھ لے کر چلتے۔ علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ احمدی عنصر کو کمیٹی سے مذہبی بنا پر علیحدہ نہیں کیا گیا تو وہ احمدیوں سے گفت و شنید کریں ایسے ہی ملک برکت علی کا یہ کہنا کہ قادیانی کشمیریوں کی امداد کی بجائے احمدیت

کی تبلیغ کر رہے ہیں تو یہ میر واعظ یوسف شاہ کا پروپیگنڈا ہے، اس الزام کو ثابت کیا جاتا۔ لاہور اور قادیان جماعت گذشتہ 19 سال (1914-1933) ، کی علیحدگی کے بعد کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئیں، اس لئے علامہ اقبال سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ متحدہ محاذ قائم کریں۔(58)

20 جون 1933 کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفےٰ کے بعد جولائی 33 کے آخر تک حکومت پنجاب نے علامہ اقبال کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی۔ یکم جولائی کو حکومت کو اطلاع ملی کہ علامہ اقبال اور ملک برکت علی سری نگر کا دورہ کرنے والے ہیں۔ یہ افواہیں بھی عام تھیں کہ وہ قادیانیوں کی طرف سے تقسیم کئے جانے والے تین رسائل کے جواب میں ایک رسالہ تقسیم کرانا چاہتے ہیں۔ جولائی کے دوسرے ہفتے میں علامہ اقبال، ملک برکت علی اور سید محسن شاہ کے دستخطوں سے ایک اشتہار وادی کشمیر میں تقسیم ہوا جس نے ہلچل مچا دی۔ کشمیر میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ کی ہدایت پر حکومت پنجاب نے علامہ اقبال کو وارننگ دی کہ وہ کشمیر کے معاملات میں مداخلت بند کر دیں۔ (59) علامہ اقبال نے پنجاب حکومت کے دباؤ، نامساعد حالات اور کشمیر انتظامیہ کی مخالفت کے باوجود کشمیریوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے اپنی تحریک کسی نہ کسی رنگ میں جاری رکھی۔ وہ خود کشمیر جانا چاہتے تھے لیکن 1931ء کے بعد ان کی وفات 1938ء تک ان کا کشمیر میں داخلہ بند رہا۔

سر فضل حسین کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے تھے۔ 26 جون 1933ء کو انہوں نے سر ظفر اللہ کو خط لکھا جس میں کشمیر کمیٹی میں جاری سازشوں کا ذکر کیا۔ پہلے مرزا صاحب نے استعفیٰ دیا اب اقبال نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اور ایک بیان جاری کیا ہے کہ انہوں نے استعفےٰ مرزا صاحب کے پیروکار احمدیوں کی تخریب کارانہ سرگرمیوں کی وجہ سے دیا۔ مسلم رہنما ذاتی مفاد کے لئے فرقہ وارانہ مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں، اس بحث سے جو نقصان ہونا تھا ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کیا یہ آپ (سر ظفر اللہ) کے لئے ممکن ہے کہ مرزا (محمود) صاحب کو یہ بتا دیں۔(60)

کشمیر کمیٹی کو قادیانیت کی تبلیغ کے لئے استعمال کرنے اور جماعتی اغراض کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے کی قادیانی روش کا شیخ عبداللہ نے بھی اپنی آپ بیتی میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بہت جلد ہم پر قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بھی آشکار ہونے لگے انہوں نے ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو عام کرنا شروع کیا تو میرے ساتھ میرے کچھ اور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشویش محسوس کی اور قادیانی حضرات مجھ سے بھی برگشتہ ہو گئے۔ شیخ عبداللہ مزید لکھتے ہیں کہ لاہور میں انہوں نے ایک میٹنگ طلب کی جس میں مرزا محمود بھی آئے اس میں انہوں نے کہا کہ کچھ عرصے سے قادیانی عقیدے کے دوستوں نے اس پلیٹ فارم (کشمیر کمیٹی) سے اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی ہے اگر اس پر روک نہ لگائی گئی تو نتائج بہت تباہ کن ہوں گے۔ مرزا صاحب نے میری تقریر صبر وسکون کے ساتھ سنی پھر بولے "احمدی جماعت بنیادی طور پر ایک تبلیغی جماعت ہے ہم نے پہلے پہل کشمیر میں اس قسم کی سرگرمیوں پر روک لگا رکھی تھی لیکن یہ ایک عارضی مرحلہ تھا، ہمارے لئے مستقل طور پر اس کی پابندی کرنا اور اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں ہے اس پر میں نے دوٹوک جواب دیا کہ ایسے حالات میں احمدی جماعت کے ہم خیال کارکنوں کا تحریک سے وابستہ رہنا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن"۔ (61)

3 ستمبر 1933ء کو مرزا محمود نے لورینگ ہوٹل لاہور میں ایک نئی کشمیر کمیٹی (تحریک کشمیر) قائم کی اور علامہ اقبال کو اس کی صدارت کی پیش کش کی۔ علامہ نے اسے ایک فریب قرار دیا اور واضح کیا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ (قادیانی) یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سابقہ کشمیر کمیٹی ختم نہیں ہوئی بلکہ نئی کمیٹی کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ ان کی یہ چال کہ وہ اسباب جن کی بنا پر انہوں نے کشمیر کمیٹی کی از سرنو تشکیل کرائی تھی اب ختم ہو چکے ہیں، نہ انہیں اور نہ مسلم عوام کو قائل کر سکتی ہے۔ ابھی تک قادیانی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے کوئی واضح اعلان نہیں ہوا کہ کسی مسلم ادارے میں شامل ہونے کی صورت میں قادیانیوں کی اطاعت دوطرفہ نہ ہوگی۔ بلکہ یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ تحریک کشمیر کے نام سے قائم کردہ ادارہ جس میں بقول الفضل مسلمانوں کو صرف رسمی طور پر شرکت کی اجازت دی گئی تھی اغراض و مقاصد کے لحاظ سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے بالکل مختلف ہے۔ قادیانی جماعت کے سربراہ (مرزا محمود) نے کشمیری بھائیوں کے نام کئی خطوط لکھے ہیں۔ انہیں غیر قادیانی ہونے کہ وجہ سے مسلمان

کے بجائے بھائی کہا گیا ہے یہ بات اس قادیانی تحریک کے پوشیدہ اغراض و مقاصد کا انکشاف کرتی ہے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات میں ایک مسلمان کس طرح ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جسکا اصل مقصد غیر فرقہ واریت کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت (قادیانی۔مصنف) کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔(62)

یہ دوسرا اہم موڑ تھا جس نے علامہ اقبال کو قادیانیت کے مذہبی معتقدات اور سیاسی عزائم سے شناسائی حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ان مشاہدات کو بعد میں انہوں نے قادیانیت کے خلاف لکھے جانے والے مضامین میں پیش کیا۔

28 مارچ 1934ء کو قادیانیوں نے ایک آل انڈیا کشمیر ایسوسی ایشن قائم کی۔ (63) انہوں نے کشمیر کے معاملات میں اپنی مداخلت جاری رکھی وہ کشمیریوں کو قادیانی بنانے، اس خطے میں تبلیغی مراکز قائم کرنے اور انگریز کے سامراجی مقاصد کی تکمیل میں سرگرم رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تحریک کشمیر کے آخری دور میں مرزا محمود نے مہاراجہ کشمیر کا بھرپور ساتھ دیا۔ مسجد اور دارالتبلیغ کے نام پر مہاراجہ کشمیر سے چار کنال زمین لی اور فتح کدل سے غلام نبی گلکار کو الیکشن جتوایا۔ وہ اس نازک مرحلے پر کشمیریوں سے ہمدردی کو بھلا بیٹھے لیکن تقسیم کے بعد یک دم کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنے لگے۔(64)

قادیانیوں نے کشمیر کی سیاسی تنظیم مسلم کانفرنس سے اپنے خفیہ روابط قائم رکھے۔ 9 فروری 1934ء کو علامہ اقبال نے پٹنہ کے وکیل نعیم الحق کو ایک خط میں لکھا:

جس مقدمے کی پیروی کے لئے میں نے آپ سے درخواست کی تھی۔ چوہدری ظفر اللہ خان کیوں کر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں مجھے معلوم نہیں شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں۔(65)

شیخ عبداللہ، پنڈت نہرو اور کانگریس

شیخ عبداللہ بڑی تیزی سے کشمیریوں کے مقبول رہنما اور شیر کشمیر بن گئے تھے۔ ان کو میر واعظ

یوسف شاہ کی آزاد مسلم کانفرنس کی مخالفت کا سامنا رہا۔ 17-15 دسمبر 1933ء کو مسلم کانفرنس کے میر پور میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شیخ عبداللہ نے علامہ اقبال کو شرکت کی دعوت دی لیکن انہوں نے مصروفیات کے باعث معذرت کر لی۔ کشمیر کے اندرونی حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ مسلم کانفرنس نے اپنے مطالبات کیلئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا پروگرام بنایا۔ شیخ عبداللہ کا مرزا محمود سے رابطہ قائم تھا اور وہ ان کی تجویز کردہ سیاسی حکمت عملی پر کام کرتے تھے۔ مرزا محمود نے یوں تو مختلف مواقع پر کشمیری بھائیوں کے نام آٹھ خطوط لکھے لیکن ان کا تحریر کردہ پمفلٹ 'حقیقتِ حال' بہت اہم ہے جس میں انہوں نے کشمیر میں سول نافرمانی کی تحریک چلانے سے منع کیا کیونکہ یہ ایک مشتبہ ہتھیار تھا جو دشمن کو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو بھی ہلاک کر سکتا تھا۔(66) انگریز بھی اس تحریک کے خلاف تھے۔

27 اگست 1934ء کو کشمیری رہنماؤں نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی۔ مسلم کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس 13-11 نومبر 1934ء کے بعد شیخ عبداللہ پنڈت نہرو سے ملے اب وہ نیشنلسٹ رہنما بنتے جا رہے تھے۔ پنڈت نہرو خود کشمیری تھے ان کی بیوی کملا کشمیری تھیں۔ ایک ہوشیار سیاست دان ہونے کی وجہ سے وہ کشمیر کی سیاسی اور جغرافیائی حیثیت کو سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ برصغیر انگوٹھی ہے اور کشمیر اس کا نگینہ ہے۔ جمیعۃ العلمائے ہند پہلے ہی سے کانگریس کے ساتھ تھی۔ گاندھی جی نہرو کو آئندہ قیادت سنبھالنے کے لئے تیار کر رہے تھے۔(67) شیخ عبداللہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ 1935ء میں انہوں نے لاہور میں پنڈت نہرو اور سیف الدین کچلو سے ملاقات کی اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ کشمیر میں فرقہ واریت پنجاب کے فرقہ پرست لیڈروں کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے ان کا آئندہ پروگرام کانگریس کے اصولوں پر کام کرنا ہوگا اور وہ عنقریب وطن کشمیر جا کر اس قسم کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالیں گے جو قوم پرور نظریے کی حامی ہو۔ 1937ء میں انہوں نے پنڈت نہرو سے لاہور اسٹیشن پر ملاقات کی اور ان کے ساتھ سرحد گئے جہاں کئی روز قیام کیا۔(68) 1936ء میں کشمیر کے وزیر اعظم کالون کی جگہ گوپال سوامی آئینگر کو

وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اور 1939ء میں شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس بنا کر کانگریس سے اپنے روابط استوار کر لئے جو تقسیم ہند کے بعد بھی قائم رہے۔

نتائج:

1931ء سے 1934ء تک کشمیر کمیٹی نے کشمیری مسلمانوں کے سیاسی مسائل حل کرنے اور ان پر کیے گئے ڈوگر مظالم کے خلاف آواز بلند کی جس کے نتیجے میں گلانسی کمیشن کا تقرر ہوا اور جموں وکشمیر مسلم کانفرنس قائم ہوئی۔ تحریک کشمیر کو ایک نئی جہت ملی اور مسلمانوں میں اپنے جائز حقوق کے حصول کا ولولہ تازہ پیدا ہوا۔ اس کاز کے لیے مسلم رہنماؤں خصوصاً علامہ اقبال نے نمایاں کردار ادا کیا۔

☆ قادیانیوں نے سر فضل حسین، دوسرے لفظوں میں برطانوی سامراج، کے اشارے پر کشمیر کی سیاست میں حصہ لیا وہ کشمیری مسلمانوں سے مخلص نہ تھے، وہ ان کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ وہ کشمیر میں قادیانی بیس قائم کرنا چاہتے تھے تا کہ مستقبل میں اس جغرافیائی لحاظ سے اہم خطے میں انگریز کے سیاسی مفادات کے لئے کام کر سکیں۔ وہ وسط ایشیاء اور روس میں سرگرم کمیونسٹ انقلابیوں کی جاسوسی کا فریضہ انجام دے سکتے تھے۔ (6') کشمیر کی 30 لاکھ کی آبادی کو قادیانی بنانا ممکن نہ تھا لیکن ان کی غربت، دین کی کم واقفیت اور دیگر مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں قادیانیت کا ہمنوا بنانا ممکن تھا۔ کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو قادیانیت کی تشہیر، کشمیری رہنماؤں کو ہارس ٹریڈنگ میں مبتلا کرنے، سامراجی پالیسیوں کی تکمیل اور مرزا محمود کے سیاسی قد کاٹھ میں اضافے کے لئے استعمال کیا گیا۔ احرار نے قادیانی عزائم کو بے نقاب کرنے میں اہم کردار ادا کیا اگرچہ ان کی تحریک ہنگامی بنیادوں پر شروع ہوئی اور جلد ہی ختم ہو گئی۔

☆ انگریز نے اپنا سیاسی مقصد حاصل کر لیا۔ پنجاب سے مہاراجہ کشمیر پر سیاسی دباؤ ڈلوایا گیا۔ پنجاب حکومت نے کشمیر حکومت کو کشمیر چلو تحریک کو کچلنے پر صرف ہونے والے اخراجات ادا کرنے کا نوٹس دیا۔ مہاراجہ نے مجبور ہو کر گلگت اور اس کے ارد گرد کا علاقہ 60 سال کے پٹے

پر انگریز کو دے دیا تا کہ وہ روسی خطرے کا مقابلہ کر سکے۔

☆ سب سے بڑھ کر اس تحریک کی بدولت مسلمان رہنما خصوصاً علامہ اقبال قادیانی سازشوں سے آگاہ ہو گئے۔ ان کی کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران قادیانیوں نے جو روش اختیار کی اور جو درپردہ سازشیں کیں ان کے بعد علامہ قادیانیت اور قادیانیوں کے خلاف ہو گئے اور یہ مخالفت ان کی وفات تک جاری رہی۔

باب5:

حوالے وحواشی

(1) Rafiq Zakaria, Iqbal, The Poet and Politician, p.127

(2) Mirza Mahmud Ahmad, Hindu - Muslim Problem, Qadian, Feb. 1927

(3) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 7

(4) اقبال اور احمدیت صفحات 7-196

(5) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص 268-269

(6) اقبال اور احمدیت ص 196

(7) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 11

(8) ایضاً

(9) جسٹس محمد منیر، پاکستان ٹائمز 24 جون 1964ء

(10) زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء ص 102

(11) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 82

II مرزا محمود کی نام نہاد خودمختار مسلم ریاست کی تجویز

(12) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 149

(13) مرزا محمود احمد، نہرو رپورٹ مسلمانوں کے حقوق بکڈ پو تالیف واشاعت قادیان 20 نومبر 1928

(14) نہرو رپورٹ اور مسلمانوں کے حقوق ص 5

(15) ایضاً 64

(16) ایضاً 109

(17) مرزا محمود احمد، ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسئلہ کا حل قادیان دسمبر 1930ء

(18) ایضاً ص 30

(19) ایضاً ضمیمہ 8

(20) محمد رفیق افضل گفتارِ اقبال ص 108

(21) رفیق افضل، گفتارِ اقبال ص 148

(22) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت ص 206

(23) ایضاً

III تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش

(24) اقبال اور احمدیت ص 404

(25) ذکر اقبال ص 164

(26) تاریخ احمدیت جلد ششم ص 338-339

(27) Sharif ud Din Pirzada , Foundation of Pakistan. p.187

(28) Evolution of Muslim Political Thoughts, 1929-36 vol (iv), The Communal Award. A.M Zaidi pp, 110-112

(29) ایضاً

(30) ڈاکٹر عاشق حسین اقبال کے آخری دوسال ص 282 اور نور احمد، مارشل لاء سے مارشل تک ص 141-44

(31) محمد حنیف شاہد مفکر پاکستان ص 297

(32) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت ص 232 اقتباس اداریہ الفضل قادیان 3 اپریل 1932ء

IV کشمیر کمیٹی اور اقبال

(33) بشیر احمد، تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، عبداللہ اکیڈمی، لاہور 2003ء ص: 143

(34) تاریخ احمدیت، جلد ششم، ص: 435-436

محرم علی چشتی کشتوار میں حکیم نور الدین سے مل کر برطانوی اقتدار مسلط کرنا چاہتا تھا لیکن یہ منصوبہ ناکام ہوا اور اس کو بھی کشمیر سے نکال دیا گیا۔ بعد میں وہ اخبار رفیق ہند لاہور کا ایڈیٹر بنا۔ (رفیق دلاوری، آئمہ تلبیس لاہور 1937ء ص: 471)

(35) تاریخ احمدیت، جلد ششم، ص: 465

(36) روزنامہ انقلاب، لاہور 11 جون، 1931

(37) ممتاز احمد، مسئلہ کشمیر، لاہور، 58

(38) پروفیسر لیون سپنسر کوپ لینڈ نے خفیہ سرکاری مراسلت اور کشمیر اور پنجاب کی حکومتوں کی خفیہ رپورٹوں کی بنیاد پر جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کے لئے دیکھیں۔ بشیر احمد، احمدیہ موومنٹ: برٹش۔ جیوش۔ کنکشنز، راولپنڈی 1994ء زیر عنوان کشمیر میں قادیانی سازشیں، اس کتاب کے اردو ترجمے تحریک احمدیت: یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ (مترجم احمد علی ظفر) عبداللہ اکادمی لاہور 2003ء، باب 11 ص: 247 تا 320

(39) سید محمود آزاد، تاریخ کشمیر، سیادت پبلی کیشنز، مظفر آباد، 1970ء، ص: 208

(40) مرزا غلام احمد نے ایک آنے والے مصلح موعود کی جو صفات بتائیں ان میں ایک یہ تھی۔ مرزا صاحب کا سبز اشتہار۔

(41) اخبار زمیندار، لاہور 17 اگست 1937ء

(42) تاریخ احمدیت جلد ششم ص: 499، 508

(43) ابوذر بخاری، احرار اور سرکار کی خط و کتابت، ملتان 1968ء ص: 14 تا 27

(44) K. Warikoo, Central Asia and Kashmir, Gian Publishing House, Delhi, 1989, p. 201

(45) Yousaf Saraf, Kashmir Fights for Freedom, Vol. I, Lahore, 1977, p. 460-61

نیز دیکھیں:

عبداللہ ملک، پنجاب کی سیاسی تحریکیں، لاہور ص: 161 اشرف عطاء، کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشاں تذکرے، لاہور 1966ء

(46) کوپ لینڈ، حوالہ سابق، ص: 240

(47) بشیر احمد، حوالہ سابق، ص: 155

Sir Samuel Hoare Papers, India Office Library, London

(48) اشرف عطاء، کچھ شکستہ داستانیں کچھ پریشاں تذکرے، لاہور، ص: 37

(49) Prem Nath Bazaz, History of Struggle for freedom , p. 149

(50) محمد حنیف شاہد، مفکر پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص: 314

(51) تاریخ احمدیت جلد ششم، مؤلف دوست محمد شاہد میں سارا ریکارڈ موجود ہے۔

(52) اخبار انقلاب، 8 جون 1933ء

(53) حرف اقبال، ص: 191

(54) Govt. of India Foreign & Political File 257 (p) Secret Report. 29 June 1933, Quoted by Lavan.

(55) حرف اقبال، نیز عبداللہ قریشی کا مضمون اقبال اور کشمیر، مجلہ بزم اقبال اکتوبر 1956ء

(56) انقلاب، 28 جون 1933

(57) ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے بے نقاب کئے جانے پر بری طرح تلملائے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح قادیانیوں کو دوبارہ کشمیر کمیٹی میں شامل کر کے کھل کھیلنے کا موقع دیا جائے۔ اسی لئے ان کو 1936ء میں انجمن حمایت اسلام سے علامہ اقبال نے نکلوا دیا تھا۔ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، 316

(58) انقلاب، 9 اگست 1933ء

(59) Political File 150, 1st July 1933, p. 154-5

11 July 1933, G.C. Garbett to Iqbal, Lavan p. 155

(60) Letters of Sir Fazle Hussain, p. 310-311

(61) شیخ عبداللہ کی آپ بیتی، آتش چنار، چوہدری اکیڈمی لاہور، صفحات 6-145

(62) حرف اقبال، ص: 196

(63) اخبار الاصلاح، سری نگر، 4 جولائی 1946ء، دوست محمد شاہد، تاریخ احمدیت جلد ششم، ص: 628

(64) الفضل قادیان 10 جنوری، 1946

(65) اقبال نامہ حصہ اول ص: 435

(66) تاریخ احمدیت، جلد ششم، ص: 37 ضمیمہ

(67) Yousaf Saraf. opcit p-507

(68) آتش چنار، ص: 145

(69) کمیونسٹوں کی تاشقند وسط ایشیاء اور ہندوستان میں سرگرمیوں کے لئے دیکھیں

Joseph Korbel, Danger In Kashmir, U.S.A

باب 6

علامہ اقبال نے 1933ء میں قادیانیت کے خلاف مضامین کیوں نہ لکھے؟

عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے وسط 1933ء میں کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دیا۔ ان کو اس زمانے میں قادیانیوں کی سیاسی چالوں اور ان کی مفاد پرستانہ سرگرمیوں کا بخوبی علم ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بیانات دیئے اور قادیانیوں نے بھی حتی المقدور ان کی کردار کشی کی کوشش کی تو انہوں نے اسی زمانہ میں ان کے خلاف کیوں الگ سے مضامین نہ لکھے۔ انہوں نے دو سال بعد مئی 1935ء میں جب ظفر اللہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بن گئے تو سلسلہ مضامین شروع کیا۔ واضح رہے کہ ظفر اللہ کا باقاعدہ تقرر 26 مئی 1935ء کو ہوا اور علامہ اقبال کا پہلا مضمون مئی 1935ء کے دوسرے ہفتے میں شایع ہوا۔ قادیانی الزام لگاتے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ احساس محرومی میں مبتلا ہو گئے کہ انہیں وائسرائے کونسل کا ممبر نہیں مقرر کیا گیا اور ظفر اللہ کونسل کے ممبر مقرر ہو گئے۔ (1)

یہ اعتراض ان کی کردار کشی کی مہم کا نمایاں حصہ ہے جس کو قادیانی اکثر اچھالتے رہتے ہیں۔ ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سلسلے میں بعض حقائق پیش کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کا تصنیفی منصوبہ

علامہ اقبال 1933ء ہی میں قادیانیوں کے کردار پر لکھنے کا سوچ رہے تھے ان کے پیش نظر بعض تصانیف کی ترتیب و تالیف تھی لیکن وہ وجود میں نہ آسکیں۔ ان میں مقدمہ القران، اسلامی اصول فقہ، تاریخ تصوف وغیرہ شامل تھیں۔ (2) علامہ اقبال نے 1933ء میں ایک کتاب تصنیف کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا نام Introduction to the Study of Islam تھا، جس کے

اہم موضوعات کا انہوں نے ایک خاکہ تیار کر لیا تھا۔ اس کو انہوں نے میاں محمد شفیع (م ش) کے حوالے کیا اور ان کو ہی کتاب کی ڈکٹیشن دینا چاہتے تھے۔اس کے چند موضوع درج ذیل ہیں۔

اسلام میں مذہبی تحریکیں

- ☆ ابن تیمیہ
- ☆ عبدالوہاب
- ☆ بابی
- ☆ احمدیہ وغیرہ (پیش گوئیاں تمام کم وبیش مجوسی)
- ☆ سرسید کی عقلیت پسندی
- ☆ نئی تحریکیں

ایک آنے والا موعود مسیح وغیرہ (3)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قادیانیت کے موضوع پر لکھنا ان کے آئندہ کے پروگرام میں شامل تھا۔ علامہ اقبال وقت، فرصت اور حالات کے مطابق اس منصوبہ پر عمل کرتے۔ لیکن ایک تو وہ پنجاب اور ہندوستان کی سیاست کے دیگر مسائل میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ مثلاً انہوں نے پنجاب میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے ایک فارمولے پر غور خوض کے بعد 14 جولائی 1933ء کو اس کے متعلق ایک بیان دیا۔(4) ایسے ہی کمیونل ایوارڈ پر انہوں نے 19 جون 1934ء کو اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (5) یونی نیسٹ پارٹی کی سرگرمیوں اور مستقبل کے دستوری اور آئینی ڈھانچے پر بھی ان کی نظر تھی۔

جنوری 1934ء میں وہ بیمار ہو گئے ان کا گلا خراب ہو گیا انہوں نے مقامی اطباء سے علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا آخر کار جنوری 1935ء میں علاج کے لئے بھوپال گئے۔ ان کی زوجہ محترمہ بھی علیل تھیں جن کے علاج میں ان کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا تھا۔ علامہ اقبال پنجاب کی سماجی، معاشی اور مذہبی تحریکوں او رسیاسی اتار چڑھاؤ پر ہمیشہ گہری نظر رکھتے تھے ان دو سالوں

35-1933ء میں انہوں نے قادیانیوں کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں خصوصاً تحریک احرار کا مشاہدہ کیا اور ان کے دینی معتقدات کے خلاف چھپنے والے لٹریچر کا مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں انہیں قادیانیت کے سیاسی اور مذہبی پہلوؤں سے زیادہ بہتر طور پر شناسائی حاصل ہوئی۔ اس ضمن میں ہم پہلے تحریک احرار کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔

تحریکِ احرار

32-1931ء میں علامہ اقبال نے احرار کے کردار کو تحریک کشمیر کے دوران دیکھا تھا۔ احرار قادیانیت کے خلاف تھے اور اسے برطانوی سامراج کی ایک ایجنسی قرار دیتے تھے۔(6) وہ اشتراکی فکر رکھتے تھے اور سر فضل حسین اور ان کی یونینسٹ پارٹی کے مخالف تھے جو جاگیرداروں اور سرکار پرستوں کی نمائندہ تھی۔ 1934ء کے اوائل میں مجلس احرار کی قادیانیوں کے خلاف بھرپور تحریک جاری تھی۔(7) قادیانی احرار کے خلاف جوابی حملے کر رہے تھے۔ قادیانیوں کا ایک زمانہ سے پسندیدہ مشغلہ چلا آرہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو مباحث میں الجھاتے، دور دراز دیہی علاقوں اور بڑے شہروں میں مناظروں کے پنڈال جماتے اور وسیع پیمانے پر قادیانی لٹریچر تقسیم کرتے تھے۔ یہ مباحثے اور مناظرے لاحاصل ہوتے تھے۔ قادیانیوں کا مقصد اسلام کے بنیادی عقیدے ختم نبوت سے مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرنا، ان کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرنا اور ان کی توانائیاں ملّی استحکام اور سیاسی حقوق کی جدوجہد سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانا تھا۔ پنجاب حکومت ان کی پشت پناہ تھی احرار نے قادیانیت کے خلاف عوامی سطح پر تحریک چلائی اور قادیان میں اپنا مرکز قائم کیا، انہوں نے مرزا محمود کے مخالف عناصر کی مدد سے قادیانیت کو للکارا۔ مولانا عنایت اللہ چشتی نے قادیان میں قدم جما کر قادیانیت کا شدید تعاقب کیا، ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ قادیانیت کو فرقہ وارانہ مسئلے کے طور پر دیکھتا تھا۔ عقیدہ ختم نبوت کے وسیع تر دینی، سیاسی اور تہذیبی مضمرات پر اس کی توجہ بہت کم تھی۔ احرار نے قادیانیت کے محاسبے کی تحریک کے دوران روایتی بحث کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی دہرایا کہ یہ تحریک ایک الگ نبوت کا پرچار کرتی

ہے اس لئے یہ ایک الگ مذہب ہے۔ قادیانیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کیا جائے اور انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ وہ قادیانیوں کو برطانوی امپریلزم کے دست و بازو کہتے تھے اور اس بات پر زور دیتے کہ قادیانیوں سے ان کی جنگ مذہبی ہی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہے۔(8)

21 اکتوبر 1934ء کو مجلس احرار نے قادیان کے قریب رجادہ میں ایک تبلیغی کانفرنس منعقد کی۔ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ نے قادیانیت پر سخت تنقید کی انہوں نے قادیانیوں کو برطانوی سامراج کے دم بریدہ کتے کہا جو انگریز کے بوٹ چاٹنے کو فخر سمجھتے ہیں۔(9) کانفرنس میں ایک قرار داد ظفر اللہ کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر نامزد کرنے خلاف منظور کی گئی۔

سر فضل حسین نے 27 اکتوبر 1934ء کو گورنر پنجاب ایمرسن کو خط لکھا کہ ان کی موجودہ پالیسی کے تحت احرار کی حوصلہ افزائی اور احمدیوں کی حوصلہ شکنی ہو رہی ہے، دشمن مضبوط ہو رہے ہیں دوست کمزور ہو رہے ہیں، مناسب پالیسی یہ ہے کہ احرار کی احمدیوں کے خلاف جارحیت سے سختی سے نمٹا جائے اور اس کا خاتمہ کیا جائے پھر احمدیوں سے گفت و شنید کی جائے۔(10)

سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کو احرار کانفرنس میں تقریر کرنے کے جرم میں چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ اپیل میں جج ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے وہ تاریخی فیصلہ سنایا جس نے مرزا غلام احمد کی شخصیت، مرزا محمود کے سیاسی عزائم، قادیان میں متوازی حکومت کی موجودگی اور مخالفین پر ڈھائے جانے والے مظالم کو آشکار کر دیا۔ یہ فیصلہ جون 1935ء میں منظر عام پر آیا۔ مجلس احرار نے اس کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی۔ قادیانیوں نے اس کے خلاف اپیل کی اور سر تیج بہادر سپرو کو وکیل مقرر کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے جج کولڈ سٹریم نے اس فیصلے کے بعض حصے حذف کر دیے۔ (11) لیکن مسلمانوں کے ذہن پر اس کا بہت اثر ہوا۔

قادیانیوں کی سیاسی پالیسی

کشمیر کمیٹی کے خاتمے اور احرار کی تحریک کے زمانے (1934) میں قادیانیوں کی سیاسی روش کا جاننا ضروری ہے۔

احرار کی تحریک کے دوران مرزا محمود نے حکومت پنجاب کو اپنی سابقہ سیاسی خدمات یاد دلائیں تاکہ حکومت احرار جیسی انگریز مخالف تحریک کو کچل دے۔ انہوں نے کہا کہ گذشتہ پچاس سالوں میں انہوں نے تقسیم بنگال، کانپور مسجد ایجی ٹیشن اور جنگ عظیم اول 18-1914ء کے دوران حکومت کی تائید کی نیز رولٹ ایکٹ کے خلاف ہنگاموں، تحریک خلافت، ہجرت، سول نافرمانی، بنگال ٹیررازم، عدم تعاون کی کانگریسی تحریکات غرضیکہ ہر حکومت مخالف تحریک کو ناکام بنایا اور انگریزی حکومت کے ساتھ اپنی لازوال اور غیر متزلزل وفاداری کا عملی ثبوت فراہم کیا۔ ان خدمات کے صلے میں جماعت نے اتنے تمغے حاصل کئے کہ ان سے کئی ٹوکریاں بھری جاسکتی ہیں۔ ان خدمات ہی کا نتیجہ تھا کہ 1935ء میں انڈین کانگریس کے سکریٹری سید محمود جب ان (مرزا محمود) سے ملے تو انہیں بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو جب یورپ کے دورے سے لوٹے تو انہوں نے پہلی بات یہ کہی کہ ہندوستان میں جب تک احمدیہ جماعت کو کمزور نہ کیا جائے اس وقت تک برطانوی حکومت زوال پذیر نہیں ہو سکتی۔ مرزا محمود کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص احمدی جماعت کو انگریزوں کی نمائندہ اور ان کی ایجنٹ سمجھتا تھا۔(12)

اخبار پیغام صلح لاہور نے قادیان کی سیاسی پالیسی پر ایک عمدہ تبصرہ کیا۔ اخبار لکھتا ہے قادیانی محمودی لوگ مذہب کے نام پر سیاست میں حصہ لینا ضروری سمجھتے ہیں گورنمنٹ میں اثر و رسوخ بڑھا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس طریق سے بہت سے دنیوی عزوجاہ کے طالب اور ملازمت کے خواہاں خود بخود ہماری طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اس طرح ہمارا جھتا زبردست ہو جائے گا جس سے گورنمنٹ پر مزید اثر پڑے گا اور ہماری آمدنی بھی بڑھے گی اور ریاست کی بنیاد بھی پڑ جائے گی اسے لئے وہ گورنمنٹ کے مرکزی دفاتر کا طواف کرنا اور سیاسی کاموں میں ظاہر اور خفیہ طور پر گورنمنٹ کے دست و بازو بننا اپنا شعار بناتے ہیں اور اس کے بدلے میں گورنمنٹ میں رسوخ بڑھانا اور نفع اٹھانا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے مذہب کے نام پر لاکھوں روپیہ قوم سے لے کر خفیہ سیاسی کاروائیوں میں صرف کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ چونکہ ان کے عقائد ہی ایسے باطل ہیں کہ کسی عقل مند کو اپیل نہیں کر سکتے اس لئے سیاسی

رنگ میں جھتے بندی کے سوا ان کا مقصد کسی اور طریق سے حاصل ہونا انہیں مشکل نظر آتا ہے بدیں وجہ وہ سیاسی میدان میں کارنمایاں دکھا کر اپنا جتھا بڑھانے کا کام کرتے رہتے ہیں۔(13)

قادیانیت کے بارے میں ایسے حقائق مسلسل منظر عام پر آ رہے تھے اور ذی شعور مسلمان رہنماؤں کو قادیانی سیاست کی بوالعجبیوں پر غور کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ علامہ اقبال بھی ان سے آگاہی رکھتے تھے اور کسی مناسب موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ وہ پنجاب میں مسلم مفادات کے تناظر میں قادیانیوں کی سیاسی حکمت عملی کا مطالعہ کر رہے تھے جو یونینسٹ پارٹی کے حلیف اور سر فضل حسین کے حامی تھے جبکہ علامہ اقبال ان کے خلاف تھے۔

آل انڈیا نیشنل لیگ:

جنوری 1935ء میں مرزا محمود نے ایک نیم سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل لیگ قائم کی اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں تھا اور بشیر احمد ایڈووکیٹ اس کے پہلے صدر تھے۔ اس کے ساتھ نیم فوجی دستے احمدیہ کورز منسلک کیے جس کا پہلا کمانڈر ظفر اللہ کا بھائی اسد اللہ تھا۔ یہ تنظیم قادیان کی سیاسی پالیسی اور اس کے نظریات کی ترجمان تھی۔

مولانا ظفر علی خاں اور زمیندار

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب مولانا ظفر علی خاں: حیات، خدمات و آثار، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1993ء میں رقمطراز ہیں۔

1935ء میں اقبال نے قادیانیت کے خلاف لکھا۔ اقبال کے اس تغیر کو اقبالی مصنف عام طور پر کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کے کردار کے مشاہدے سے منسوب کرتے ہیں۔ فوری ردعمل کے لحاظ سے یہ بات ایک حد تک مانی جا سکتی ہے مگر اس ذہنی تبدیلی میں ظفر علی خاں کی تحریک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال پر ظفر علی خاں کے اثرات کی یہ بات شاید بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ اقبال اور ظفر علی خاں کے تعلقات 1910ء سے آخر دم تک ذاتی سطح پر سوائے سائمن کمیشن کے موقع پر جزوی اختلافات کے، بڑے گہرے رہے۔ ان کے مزاجوں میں کچھ فرق تھا اور یہ قدرتی

امر ہے مگر مقاصد ملی میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ دونوں صاحبان ایک دوسرے کی قدر پہچانتے تھے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ زمیندار اور ستارہ صبح میں اقبال کا کلام چھپتا تھا اور اقبال ان جریدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تھے۔ پھر وہ ان مباحث سے کیسے بے خبر رہ سکتے تھے جو ظفر علی خاں نے قادیانی نبوت کے بارے میں ستارہ صبح اور زمیندار میں اٹھا کر عالم اسلام میں ایک تحریک پیدا کی ص: 466

22 نومبر 1934ء کو مولانا ظفر علی خاں نے قیصر ہند شاہ برطانیہ اور ان کے توسط سے پوری مسیحی دنیا کے نام اردو اور انگریزی میں ایک کھلا خط شائع کیا جس پر زمیندار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اس پر انہوں نے ایک اداریہ زمیندار کا نیا امتحان لکھا جس میں ظفر اللہ کے تقرر کو منسوخ کرنے اور قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

پروفیسر ذوالفقار لکھتے ہیں: ''اس زمانے میں جسٹس مرزا سر ظفر علی نے بھی قادیانیوں کو ازروئے شریعت دائرہ اسلام سے خارج سمجھ کر حکومت سے انہیں جداگانہ جماعت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح یہ تحریک مسلم عوام اور جدید تعلیم یافتہ اہل فکر و نظر سب کی اجتماعی تحریک بن گئی''۔ ص: 501

قادیانیت کے خلاف کتابیں اور مضامین

1933-35ء میں قادیانیوں کے خلاف کئی عمدہ کتب منظر عام پر آئیں جن سے اس تحریک پر پڑے پردے اٹھتے چلے گئے اور یہ مسئلہ سنجیدہ مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ان کتب اور مضامین میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سید حبیب کی 'تحریکِ قادیان' 1933ء

سید حبیب مدیر اخبار سیاست لاہور نے تحریک قادیان کے نام سے اپریل. اگست 1933ء میں قادیانیت کے خلاف تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جو نہایت مقبول ہوا۔ الفضل قادیان نے جوابی مضامین لکھے۔ لاہور جماعت کے اخبار پیغام صلح نے ان اعتراضات کا جواب دیا جو دسمبر

1933ء میں آئینہ احمدیت کے نام سے شائع کیا گیا۔(14)

مرزا ظفر علی کے مضامین 35-1934ء

35-1934ء میں مرزا ظفر علی ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ لاہور نے قادیانیت کے خلاف بعض عمدہ مضامین لکھے اور انہیں مسلمانوں سے علیحدہ قرار دینے کا مطالبہ کیا۔(15)

کے ایل گابا کا مطالبہ 1935ء

ممتاز قانون داں خالد لطیف گابا نے جماعت احمدیہ کو اسلام سے خارج کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اخبارات میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں کہا کہ مسئلہ خلافت کے بعد مرزائیت ایسا مسئلہ [illegible] نے مسلمانان ہند کو اتنا مشتعل کیا ہے جیسے کہ وہ آج کل ہیں اس لئے انہیں مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے۔(16)

مقدمہِ بہاولپور کا فیصلہ 1935ء

فروری 1935ء میں مقدمہ بہاولپور کا فیصلہ شائع ہو گیا جو قادیانیوں کے خلاف تھا۔ محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج بہاولپور نے قادیانیوں کو ان کے عقائد کی بناء پر غیر مسلم قرار دیا۔ مقدمے کے دوران مسلمانوں کی طرف سے مفتی محمد شفیعؒ، مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا مرتضیٰ حسنؒ اور قادیانیوں کی طرف سے جلال الدین شمس اور غلام احمد بدوملہی پیش ہوئے۔ مقدمہ کی پوری کاروائی چھپ چکی ہے۔ اس فیصلے کا ہندوستان کے طول وعرض میں بڑا چرچا ہوا۔(17)

پروفیسر الیاس برنی کی 'قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ'

مولانا محمد الیاس برنی، پروفیسر معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے قادیانی تحریروں کے اقتباسات کو عمدہ طریقے سے جمع کر کے قادیانیوں کو ان کے عقائد اور تحریک کے خدوخال کا ایک آئینہ دکھایا۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کا ایک منفرد انداز تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن

1352ھ (1933)ء کے آخر میں منظر عام پر آیا اگلے سال دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ یہ کتاب علامہ اقبال کو بھی ارسال کی گئی۔ انہوں نے مولانا الیاس برنی کو ایک خط لکھا جس کا ذکر مولانا نے کتاب قادیانی مذہب کے چوتھے ایڈیشن کے دیباچے (1354ھ 1935ء) میں کیا ہے۔ مولانا برنی کہتے ہیں:

''آج علماء سے بڑھ کر قومی لیڈر اس کتاب کی اہمیت محسوس کرتے ہیں من جملہ اکابرِ ملت سر محمد اقبال نے دوسرے ایڈیشن پر رائے دی ہے کہ یہ کتاب ملک میں وسیع پیمانے پر شائع ہونے کے قابل ہے''(18)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اس کتاب کی افادیت کے معترف تھے۔ کتاب کی تعریف میں ان کے اور خطوط بھی مولانا برنی کے نام ہیں۔ جسٹس (ر) عطاء اللہ سجاد ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے 1934ء میں اپنی بیماری کے دوران اس کتاب کا مطالعہ کیا اور پھر اصل قادیانی کتب منگوا کر پڑھیں۔ اس کے بعد انہوں نے تحریک احمدیت کے متعلق حتمی رائے قائم کی۔(18-A)

علامہ اقبال نے مولانا الیاس برنی کو 27 مئی 1937ء کو ایک خط لکھا جس میں مسئلہ بروز پر تحقیق کی ضرورت بیان کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس تحقیق سے قادیانیت کے خاتمہ میں مدد مل سکتی ہے۔(19) اسی قسم کا ایک خط انہوں نے سید سلیمان ندوی کو 17 اگست 1936ء کو لکھا اور بروز کے متعلق سوال کیا کہ صوفیا کی کتب میں یہ بحث کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔(20)

'ہز ہولی نِس'

1935ء میں مرزا محمود کی شخصیت اور قادیانیت کے خلاف انگریزی زبان میں لاہور سے ایک نہایت عمدہ کتاب ہز ہولی نِس شائع ہوئی۔(21) اس کا پیش لفظ مولانا ظفر علی خان نے لکھا۔ اس کے مصنف نے بعض وجوہ کی بناء پر اپنا قلمی نام فونکس Phoenix استعمال کیا۔ پیش لفظ میں مولانا ظفر علی نے لکھا کہ قادیانیت بہائیت کا چربہ ہے جو غلطیاں باب اور بہاء اللہ نے کیں اور اسلام سے

الگ ہو گئے، مرزا غلام احمد نے ان کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کے دین وایمان پر ڈاکہ ڈالا۔

فاضل مصنف فونکس نے دیباچے میں پروفیسر الیاس برنی کی کتاب قادیانی مذہب سے استفادہ کرنے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ مصنف نے ڈاکٹر اقبال کی بھی تعریف کی اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس کتاب کو دیکھا اور اس کے آخری باب کو سنا۔ یہ باب مرزا صاحب کی ابتدائی زندگی، دعاوی ان کے اوہام والہام، ذہنی وجسمانی عوارض، پیش گوئیوں، شخصیت کے تضادات، مضحکہ خیز تاویلات وغیرہ پر مشتمل ہے شاید اسی لئے علامہ نے اپنے ایک مضمون میں مرزا صاحب کے الہامات کی روشنی میں ان کے نفسیاتی تجزیے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس وقت مرزا صاحب کے الہامات کا ایک مجموعہ موجود تھا جو بابو منظور الٰہی (22) نے البشریٰ کے نام سے دو حصوں میں 1913ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ بہت مختصر تھا بعد میں قادیانیوں نے تذکرہ کے نام سے مرزا صاحب کے تمام کشوف والہامات شائع کر دیئے۔

فاضل مصنف فونکس دیباچے میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی ہدایت پر اس کتاب میں ایک باب غلام احمد قادیانی اور بہاء اللہ کی تحریکوں میں مماثلت پر شامل کیا گیا ہے جس کا عنوان قادیان اور عکہ ہے، اس میں احمدیت اور بہائیت کا تقابل کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے 1935ء میں قادیانیت کو بہائیت کا چربہ قرار دیا تھا۔(23)

ہمیں یقین ہے کہ 1934ء اور وسط 1935ء تک کی تمام قادیانیت مخالف تحریکیں اور قادیانیت پر لکھی گئی اہم کتب علامہ اقبال کے پیش نظر رہی ہوں گی۔ انہوں نے قادیانیت کے خلاف اپنی نفرت اور بیزاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا

''ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت، بانیٔ اسلام ﷺ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آں حضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔(24)

کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کے کردار کے عملی مشاہدے اور ان کے خلاف جاری تحریکات اور قادیانی مذہب و سیاست کو آشکار کرنے والے مواد نے ان کے فکری ارتقاء کو ایک جہت عطا کی۔ ان دو سالوں 1933-34ء میں وہ Receiving End پر رہے اور جب ان کی فکر اور رائے پختہ ہوگئی تو وہ حقائق سامنے لے آئے۔

یہ ایک مختصر پس منظر تھا، اب ہم اس کا پیش منظر بیان کرتے ہیں اور ان محرکات کا ذکر کرتے ہیں جن کے باعث علامہ اقبال نے قادیانیت کیخلاف کھل کر مضامین لکھے۔

علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف مضامین کیوں لکھے؟۔ فوری محرکات

علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان کے بعض فوری محرکات بھی تھے جن کی وقتاً فوقتاً نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ شیخ بشیر احمد قادیانی ایڈووکیٹ صدر نیشنل لیگ اس کی وجہ پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کے بیان کو قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'علامہ اقبال کی طرف سے جو بیان احمدیت کے خلاف شائع ہوا اس کے متعلق ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی طرف سے اس کا جواب پیش کیا جائے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ بحث ہز ایکسی لینسی گورنر بہادر کی مسلمانان پنجاب کو نہایت دانشمندانہ نصیحت پر شروع ہوئی جو مختلف فرقوں کے سیاسی وملکی اتحاد کے متعلق تھی کیونکہ ایسے اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ مختلف مسلمان جماعتیں باہمی تنازعات کو نظر انداز کر کے اپنی قومی عمارت کی بنیاد اس عقیدت پر رکھیں جو اسلام کے ساتھ ہے'۔(25)

علامہ اقبال نے بھی اپنے مضمون 'قادیانی اور جمہور مسلمان' میں گورنر پنجاب کے بیان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'ہندوستان کے مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی سے لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگے ہیں اور ہندوستانی دماغ مذہب کی جگہ اور بدل روس کی دہری مادیت کی ملتی جلتی شکل پیدا کر دے گا۔ لیکن پنجابی مسلمانوں کی پریشانی کا باعث محض مذہبی سوال نہیں ہے۔ کچھ جھگڑے سیاسی بھی ہیں جن

کی طرف سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے یہ اگرچہ خالص سیاسی جھگڑے ہیں لیکن ان کی اہمیت مذہبی سوال سے کسی طرح کم نہیں۔ جہاں مجھے حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے اسے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کا احساس ہے وہاں میں حکومت کو اپنے احتساب کا مشورہ دوں گا میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شہری۔ دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لئے کون ذمہ دار ہے جس کی بدولت مسلمان جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے جو ہر دم آپس میں برسر پیکار ہیں (یونینسٹ پارٹی اور سر فضل حسین کی طرف اشارہ ہے۔ مصنف) سر ہربرٹ پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں لیکن شہری۔ دیہاتی تمیز کو حکومت خودغرض اور سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعے برقرار رکھے ہوئے ہے اور یہ حربہ صحیح رہنما کے پیدا ہونے سے روکنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ سر ہربرٹ ایمرسن صحیح رہنما کی عدم موجودگی کا رونا روتے ہیں اور میں اس نظام کا رونا روتا ہوں جس نے ایسے رہنما کی پیدائش کو ناممکن بنا دیا ہے'(26)

احراری۔قادیانی نزاع

جماعت احمدیہ لاہور کے ایک ممتاز مناظر اختر حسین گیلانی نے 1944ء میں اقبال اور تحریک احمدیت نامی کتاب میں ان مضامین کی وجہ احراری۔ قادیانی نزاع بتائی ہے، فرماتے ہیں۔

i) 1935 میں احراری۔ قادیانی نزاع کے باعث مخالفت کا جو طوفان بپا ہوا، وہ عوام سے بڑھ کر بہت سے خواص کو بھی اپنی رو میں لپیٹ کر لے گیا۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہمیں علامہ اقبال 'اسلام اور قادیان ازم، اور 'اسلام اور احمد ازم، کے نام سے بیانات شائع کرتے نظر آتے ہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جس کے بعد اقبال کے کلام میں تحریک احمدیت کے متعلق طنزیہ اشعار کا وجود نظر آتا ہے کہیں تو علامہ اقبال حضرت مجدد (مرزا غلام احمد) کو''مجوسی'' کا نام دیتے ہیں کہیں 'یہودی آریائی' تصوف کا حامل قرار دیتے ہیں اور کہیں 'مذہبی چلتا پرزہ' نام رکھتے ہیں۔

ii) تحریک احمدیت کے متعلق آپ کے آخری بیانات درحقیقت کسی عرصہ دراز کی محققانہ کاوش کا

نتیجہ نہ تھے بلکہ اس ہنگامہ سے اثر پذیری کا نتیجہ تھے جو مرزا محمود احمد صاحب کی عنایت سے ''احراری۔قادیانی'' نزاع کے نام سے مشہور ہوا تھا علامہ اقبال کے ایک نیاز مند، جناب سید نذیر نیازی علامہ اقبال کی آخری علالت پر مضمون لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''قادیانی۔ احراری نزاع سے متاثر ہو کر حضرت علامہ جن خیالات کا اظہار وقتاً فوقتاً کر چکے تھے اب انہیں کا تقاضا تھا کہ ایک مفصل بیان اس قضیے کے متعلق شائع کریں۔'' رسالہ اردو اقبال نمبر 1938ء انجمن ترقی اردو حیدر آباد دکن ص312 (27)

قادیانی مبلغ کا خیال

لیون سپنسر نے اپنی کتاب احمدیہ موومنٹ (1974)ء کی تالیف کے دوران نیو یارک میں قادیانی مبلغ خلیل ناصر سے 25 جنوری 1970ء کو انٹرویو کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ تمام محرکات جو علامہ اقبال کے قادیانیوں کے خلاف مضامین لکھنے کا باعث بنے ان کا پتہ لگانا مشکل ہے لیکن خلیل ناصر کا نظریہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی جماعت احمدیہ کے خلاف پہلی واضح تنقید کشمیر کمیٹی سے ان کے استعفیٰ کے وقت (20 جون 1933ء۔مصنف) سامنے آئی۔ اقبال جب کشمیر کمیٹی سے وابستہ تھے اس وقت وہ عام زندگی سے ریٹائر ہو چکے تھے ان کی وکالت نہ چلتی تھی اب وہ بحیثیت شاعر اپنی شہرت و ناموری قائم رکھنا چاہتے تھے۔

جب مرزا محمود نے کمیٹی سے استعفیٰ دیا اور علامہ اقبال صدر بن گئے تو اس کمیٹی کی موجودگی کے باوجود مرزا محمود نے پرانی کمیٹی کے برقرار ہونے کا اعلان کیا اور بعض ممبروں کی مدد سے انکا ایک اجلاس بلا کر کمیٹی قائم کرنے کی کوشش کی تو علامہ اقبال نے ان اقدامات سے محسوس کیا کہ ایک تو قادیانی ان کی صدارت اور کمیٹی کے دیانتدارنہ کام کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں دوسرے اب وہ کھل کر ان کے خلاف ہو گئے ہیں اس لئے انہوں نے بعد میں یہ مضامین لکھ کر اس مخالفت کا جواب دیا۔

سپنسر کہتا ہے کہ خلیل ناصر کا یہ نظریہ اس مسئلے پر نئی روشنی ڈالتا ہے ساتھ ہی وہ علامہ اقبال کا وہ بیان نقل کرتا ہے جس میں انہوں نے خود کہا تھا کہ ذاتی طور پر انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج کی

امید تھی لیکن جب انہوں نے خود ایک قادیانی کو نبی کریمﷺ کی ذات گرامی کے خلاف نازیبا کلمات کہتے سنا تو وہ اس تحریک کے سخت خلاف ہو گئے۔(28)

ریویو آف ریلیجنز کا تبصرہ

علامہ اقبال کے مضامین پر ریویو آف ریلیجز قادیان بابت ماہ جون 1935ء میں جو تبصرہ شائع ہوا اس میں کہا گیا:

ڈاکٹر اقبال مولویوں کے اس مخصوص طبقے سے ملے ہوئے ہیں جن کو تیسرے درجے کے چند سیاست دانوں اور بدنامی مول لینے کے خوگر عناصر کی مدد اور تائید حاصل ہے اس کے بعد فکر سے عاری اور دلائل سے تہی طبقے ہیں جو ان کے ساتھ مل گئے ہیں اس لئے وہ نہایت جھوٹا اور احمدیوں کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ ریویو ان مضامین کا ایک محرک یہ بتاتا ہے کہ ظفر اللہ نے دوسری گول میز کانفرنس میں جو کردار ادا کیا اس پر انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا، اس نے ڈاکٹر اقبال کے دل میں مخالفت، حسد اور رقابت پیدا کر دی۔

ریویو کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے سیاسی وجوہات کی بناء پر یہ مضامین لکھے وہ مسلمانوں کے سیاسی رہنما بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔(29)

سر ظفر اللہ کا موقف

سر ظفر اللہ نے منیر احمد منیر ایڈیٹر پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور کو ایک طویل انٹرویو دیا جو مئی 1981ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ وہ علامہ اقبال کے ایک قریبی دوست چوہدری محمد حسین کو ان مضامین کا ذمہ دار ٹھیراتے ہیں جو پنجاب پریس برانچ میں کام کرتے تھے۔ اس انٹرویو کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

منیر احمد منیر: کیا علامہ اقبال صاحب بھی کسی زمانے میں احمدی رہے؟

ظفر اللہ: نہیں

س: ایک کتابچہ ان کا لکھا ہوا ہے آپ کے عقیدے کے متعلق ٹریٹرز آف اسلام انگریزی زبان میں!

ج: آخر میں ان پر زیادہ اثر ان کے حاشیہ نشینوں کا ہو گیا تھا جن میں زیادہ ان کے پاس بیٹھنے والے اور انہیں ان امور پر اکسانے والے تھے چوہدری محمد حسین پہاڑنگی، پہاڑنگ ضلع سیالکوٹ میں ایک گاؤں ہے وہاں کے تھے وہ اس سلسلے کے بڑے سخت مخالف تھے۔ ان کے ساتھ ایک دو اور آدمی تھے لیکن شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب کی بانی سلسلہ جماعت کے متعلق رائے بڑی اچھی تھی۔ شاید علی گڑھ میں تقریر کی تھی کہ اگر اس زمانے میں ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ دیکھنا ہو تو احمدیہ جماعت کو دیکھو۔ سعد اللہ لدھیانوی بانی سلسلہ کے سخت مخالف تھے اس پر ڈاکٹر صاحب نے نظم لکھی، اسے کنڈم کیا، اس وقت ڈاکٹر صاحب کالج میں پڑھتے تھے۔(30)

سر ظفر اللہ کو باقی قادیانیوں کی طرح گلہ ہے کہ پہلے علامہ اقبال احمدیت کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے بعد میں مخالف ہو گئے حالانکہ خود اس بات کی ذمہ دار قادیانی منافقت ہے۔ اگر شکایت کریں تو مسلمان کر سکتے ہیں کہ ان کے حسن ظن اور حسن سلوک سے کس درجہ ناجائز فائدہ اٹھایا گیا اور در پردہ ان کے دین وملت کی بیخ کنی کی گئی اور اوپر سے سینہ زوری کہ ان سے الٹی شکایت ہو رہی ہے۔

سر ظفر اللہ نے اپنے ایک دوسرے انٹرویو میں جو ہفت روزہ 'لاہور' لاہور کو دیا فرمایا۔

ثاقب زیروی۔ علامہ اقبال کا جماعت احمدیہ کے متعلق منفی رویہ کس طرح شروع ہوا۔ ٹرننگ پوائنٹ کیا تھا؟

حضرت چوہدری صاحب: میرا خیال ہے کہ جب احرار نے شور مچانا شروع کیا کہ کشمیر کمیٹی کو اس کے صدر نے اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہوا ہے اس سے یہ رو شروع ہوئی ورنہ جب حضرت صاحب نے پہلی میٹنگ میں ہی یہ کہا تھا کہ مجھے صدر نہ بناؤ تو ڈاکٹر اقبال نے اصرار سے یہ کہا تھا کہ مرزا صاحب ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کو حقوق ملیں اور ہمارے کرنے سے تو کچھ ہونا نہیں۔ حضرت صاحب نے فرمایا جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے وہ تو ہمارا فرض ہے ہم کو یہ حقوق دلانے کی

پوری کوشش کرنی چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پھر آپ صدارت سنبھالیں۔ آپ کے پاس تنظیم ہے، افراد ہیں۔ اس طرح سے اقبال نے اصرار کر کے آپ کو بنوایا پھر جب ایک سال مکمل ہو گیا تو حضرت صاحب نے کہا کہ اب کام اچھا ہو گیا ہے اب کسی اور کو مقرر کیا جائے تو پھر اقبال نے اصرار کر کے آپ کو دوبارہ مقرر کروایا۔ اس وقت تک تو ان کی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوئی اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رویہ بدل گیا۔ یہ تو ہے ایک بات۔

دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر اقبال اپنے ہجولیوں سے بڑا اثر قبول کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں ایک صاحب چوہدری محمد حسین پہاڑنگی تھے۔ جماعت احمدیہ کے مخالف تھے دوسرے رانا محمد احسن یا محمد حسن۔

ایک دفعہ جب کہ ابھی کشمیر کمیٹی نہیں بنی تھی تو حضرت صاحب لاہور تشریف لائے۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر اقبال بیمار ہیں ان کو کوئی سخت درد وغیرہ تھی۔ حضرت صاحب نے کہا چلو عیادت کے واسطے چلیں۔ ان کے کمرے میں گئے۔ ان کا گھر کا لباس بنیان اور تہمد ہی ہوتا تھا باہر جانے کے لئے سوٹ وغیرہ پہنتے تھے۔ تو وہ اسی لباس میں تھے۔ ان کو بیماری کی تکلیف بہت تھی وہ ملاقات میں سارا وقت یہی کہتے رہے مرزا صاحب میرے لئے دعا کرنا، مرزا صاحب میرے لئے دعا کرنا، مرزا صاحب میرے لئے دعا کرنا۔ تو جو شخص کسی کو کافر سمجھتا ہو اس کو دعا کے لئے تو نہیں کہتا۔ (31)

ڈاکٹر جاوید اقبال کا تجزیہ

ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں:

کشمیر کمیٹی سے جب اقبال مایوس ہوئے تو ممکن ہے احراریوں نے ان سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی ہو کیونکہ ان کی جماعت احمدیہ سے پرانی عداوت تھی لیکن علامہ اقبال اور احرار کے نظریات میں ہمیشہ فرق رہا احرار جمعیت العلمائے ہند کی طرح نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت اور کانگریس کی ہمنوا تھی۔ وہ کبھی پارلیمانی سیاسی جماعت نہ بن سکی۔ علامہ اقبال احرار اور اتحاد ملت کا مسلم لیگ سے اتحاد کرا کر انہیں یونینسٹ پارٹی کے مقابلے پر لانا چاہتے تھے۔

وہ مزید کہتے ہیں:

علامہ اقبال کے قادینوں کے خلاف مضامین کا پس منظر سمجھنے کے لئے تین چار امور ذہن میں رکھنے ضروری ہیں جنہوں نے مستقبل میں پنجاب کی مسلم سیاست پر اثر انداز ہونا تھا یہ امور تھے کمیونل ایوارڈ، 1934ء میں محمد علی جناح کے ہاتھوں مسلم لیگ کا احیاء، 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خود مختاری کا مسئلہ، سر فضل حسین کا یونینسٹ پارٹی کا پروگرام اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں درپیش خطرات ۔ان امور کے پس منظر میں محمد علی جناح،اقبال اور پنجاب کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں، احراریوں، یونینسٹوں اور احمدیوں کے سیاسی عزائم نے 1935ء تک جو شکل اختیار کی ان کی روشنی میں اقبال کے تحریک احمدیہ کے خلاف بیانات کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔(32)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ پنجاب میں نہایت قلیل اکثریت کے باعث مسلمان الگ وزارت تشکیل نہ دے سکتے تھے جب تک ہندوؤں اور سکھوں کو ساتھ نہ ملائیں۔ علامہ اقبال کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر احمدیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا (1935ء میں ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی تعداد 56 ہزار سے زائد ہو گئی ہے اور لوگ تیزی سے بیعت کر رہے ہیں۔ مرزا محمود نے ہر قادیانی کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے کم از کم ایک آدمی کو قادیانی بنا کر جماعت کی تعداد میں اضافہ کرے) تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ انگریزی حکومت کے ایماء پر یا یونی نیسٹ پارٹی کے اثر و رسوخ کے ذریعے مسلمانوں کی معمولی اکثریت کو صوبائی اسمبلی میں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ ان کا یہ خدشہ بعد کے سیاسی حالات اور قادیانیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ نہ ہونے کی وجہ سے درست ثابت نہ ہوا، لیکن یہ بلا جواز نہ تھا۔

اس پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ 33-1934ء کی مذہبی تحریکات، قادیانیت کے خلاف شائع ہونے والے لٹریچر اور نئے سیاسی تقاضوں اور خطرات خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے سوال کے پیشِ نظر علامہ نے یہ مضامین لکھے۔

باب 6:

حوالے وحواشی

(1) شیخ اعجاز احمد، مظلوم اقبال، ص:184

(2) B.A Dar, Letters and Writings of Iqbal, Iqbal Academy, Lahore, P. 93

(3) علامہ اقبال: حیات، فکر وفن۔ مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر مقالہ اقبال کی موعودہ تصانیف از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ص:219 تا 231

(4) حرف اقبال، ص:198

(5) حرف اقبال، ص:174

(6) چوہدری افضل حق، تاریخ احرار ملتان، 1968ء ص:180

(7) ایضاً

(8) تاریخ احمدیت، جلد ہفتم، ص:501

(9) Y.B. Mathur, Growth of Muslim Politics in India, Lahore. p.109

(10) سر فضل حسین کے خطوط، ص:385

(11) الفضل قادیان، 25۔27 مارچ 1936ء

(12) ملخص خطبہ محمود احمد، الفضل قادیان، 6راگست 1935ء

(13) پیغام صلح لاہور، 5 جنوری 1935ء

(14) دوست محمد، آئینہ احمدیت، حصہ اول ودوم، انجمن احمدیہ لاہور، دسمبر 1933ء

(15) الفضل قادیان، 3 مئی 1935ء قادیانیوں نے مرزا ظفر علی پر جو سب وشتم کیا اس پر مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم وفاداران مادرزاد (ارمغان قادیان ص، 61-63) قابل ذکر ہے۔

(16) الفضل، قادیان، 30 مئی، 1935ء

(17) روداد مقدمہ بہاولپور، اسلامک فاؤنڈیشن لاہور

(18) قادیانی مذہب، ص 34 مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کا ایڈیشن

(18)-A روزنامہ نوائے وقت 21 اپریل 1999ء

(19) اقبال نامہ حصہ اول، ص:419

(20) بشیر احمد ڈار، اقبال اور احمدیت، ص:25

(21) Phoenix, His Holiness, The Islamic Literature Publishing House, Lahore, 1935

(22) لاہوری جماعت میں شامل ہو گئے۔ مجموعہ الہامات وحی 'البشریٰ' 1913ء میں شائع ہوا۔

(23) علامہ اقبال کے ریمارکس۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، تصانیف اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ، ص 449

(24) حرف اقبال، ص:112

(25) شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ کا مضمون اصلاح و ارتقاء کے مقابلے میں دقیانوسیت پر اصرار، احمدیت کے خلاف ڈاکٹر اقبال کا بیان۔ الفضل قادیان، 5 جون 1935ء

(26) حرف اقبال، ص:108

(27) اختر حسین گیلانی، اقبال اور تحریک احمدیت، احمدیہ انجمن لاہور، 1944ء، ص:13

(28) Lavan Spencer, Ahmadyyah Movement, Delhi, 1974, p. 184

(29) Review of Religions, Qadian, June 1935 (Dr. Iqbal and the Ahmadyyah Community)

(30) پندرہ روزہ آتش فشاں، لاہور، مئی 1981ء، ص:34

(31) ماہنامہ انصار اللہ ربوہ، نومبر، دسمبر 1985ء، ص:102

(32) زندہ رود حصہ سوم ص:589

۱

باب 7

کیا علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف اس لئے مضامین لکھے کہ وہ وائسرائے ہند کی ایگزیکٹوکونسل کے ممبر نہ بن سکے اور سر ظفر اللہ ممبر بنا دیئے گئے؟

شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں احمدیت کے متعلق علامہ اقبال کے بیانات میں تلخی کی وجہ ایک سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں جس میں ایک ذاتی معاملے میں ان کا احساس محرومی بھی شامل ہوگیا۔ شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ ذاتی معاملہ وائسرائے کونسل کا ممبر نہ بننا تھا۔(1)

قادیانی ماہنامہ الفرقان ربوہ میں جماعت احمدیہ کے ایک سابق مبلّغ شیخ نور احمد منیر نے ایک مضمون 'علامہ اقبال اور احمدیت ۔حقائق کے آئینے میں' لکھا۔ اس میں انہوں نے یہی موقف اختیار کیا ہے اور کہا ہے خالصتاً سیاسی محرکات اور ذاتی وقار کے لئے علامہ اقبال نے مخالفانہ اقدام اٹھایا جیسا کہ سید حبیب مدیر سیاست اور دوسری آراء اس امر پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈال رہی ہیں۔(2)

اس کے برعکس ڈاکٹر جاوید اقبال کا موقف ہے کہ علامہ اقبال وائسرائے کونسل کے ممبر نہ بن سکتے تھے اس لئے کہ اس زمانے میں وہ بیمار تھے اور انگریز کی ملازمت کے لئے تیار نہ تھے، انگریز کی توقعات پر پورا نہ اترتے تھے کیونکہ انہوں نے انگریزی حکومت کو کئی بار تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

وہ لکھتے ہیں کہ ظفر اللہ کا تقرر سر فضل حسین کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار، ویکلی میل اور مجاہد میں تیز و تند بیانات یا احرار کی ایجی ٹیشن صرف سر ظفر اللہ کے تقرر یا احمدیوں کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کے خلاف بھی تھی۔ اقبال کو اگر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت میں دلچسپی ہوتی تو سر فضل حسین کی ڈائری یا خطوط میں اس کا ذکر ملتا۔ انگریز اتنے کمزور نہ تھے کہ احرار کی ایجی ٹیشن یا زمیندار کی حمایت کے باعث اقبال کو ممبر مقرر کر دیتے۔ اقبال نے کئی بار انگریزی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا اس لئے ان کے تقرر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ 35-1934ء سے خود بیمار چلے آرہے تھے اور اس قابل ہی نہ تھے کہ رکنیت قبول

کرتے، پھر ان کی اہلیہ محترمہ سردار بیگم سخت بیمار تھیں ان کی ناگہانی وفات اور نابالغ بچوں کی نگہداشت ایسے مصائب وآلام نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔(3)

قادیانیوں کا یہ الزام کہ علامہ اقبال احرار کے کسی سیاسی دباؤ میں آگئے تھے اس لئے یہ مضامین لکھے قطعاً بے بنیاد اور حقائق کے خلاف ہے۔

علامہ اقبال کے احرار رہنماؤں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ سے دوستانہ تعلقات تھے لیکن یہ بات غلط ہے کو وہ احرار کے زیر اثر یا دباؤ میں آگئے۔ وہ احرار کے کانگریس نواز کردار سے بخوبی آگاہ تھے۔ احرار رہنما چوہدری افضل حق لکھتے ہیں کہ علامہ سر محمد اقبال ذہنی طور پر احرار تھے انہیں مرزائیوں کے عزائم میں اسلام کے لئے خطرہ نظر آتا تھا وہ مرزائیوں کی اسلام دشمنی کے اول سے قائل تھے اور کبھی آنکھوں میں جگہ نہ دیتے تھے کشمیر کمیٹی (جس کے صدر مرزا بشیر الدین تھے) کے وہ ضرور ممبر ہو گئے تھے لیکن یہ کیفیت اضطراری تھی وہ فوراً سنبھل کر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں لگ گئے اور احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے عرف عام میں ان کے مرزائی شکن بیانات نے تعلیم یافتہ طبقے پر گہرا اثر کیا اور ہوا کا رخ ادھر سے ادھر پھر گیا۔(4)

احرار نے ہمیشہ علامہ اقبال کی عزت کی مولانا انور شاہ کاشمیریؒ نے مسئلہ قادیانیت اور ختم نبوت پر علامہ کی رہنمائی کی (5) شاید احرار لیڈر علامہ اقبال کے قادیانیوں کے خلاف مضامین لکھنے کا کچھ کریڈٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لئے ایسی باتیں بیان کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے علامہ اقبال پر سیاسی اثر یا دباؤ ڈال کر مطلب برآری کی۔ ایسی کوئی بات واقعات اور تاریخی حقائق سے ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ شہید گنج مسجد کی تحریک 1935ء میں سر فضل حسین نے احرار کی سیاسی ساکھ کو تباہ کر دیا تھا اور قادیانیوں نے ان کے خلاف اس زمانے میں اتنا وسیع اور مکروہ پروپیگنڈا کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے وہ کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کے قابل نہ تھے وہ خود مسلمانوں سے ڈر کے مارے منہ چھپاتے پھرتے تھے کیونکہ انہوں نے تحریک میں حصہ نہ لیا تھا۔ اتحاد ملت پارٹی اور مولانا ظفر علی خان ان پر الگ برس رہے تھے۔ علامہ اقبال احرار کی کانگریس نواز نیشنلسٹ روش کے بھی خلاف تھے

ان کے مسلم قومیت کے متعلق الگ نظریات تھے اس لئے احرار کے کسی دباؤ کا یا ان سے تعاون کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

کیا علامہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر بننے کے خواہشمند تھے؟

کیا اس بات کے کوئی تاریخی شواہد موجود ہیں کہ علامہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر بننے کے خواہشمند تھے۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں:

بنیادی بات یہ ہے کہ اگر علامہ اقبال وائسرائے کی کونسل کا ممبر بننا چاہتے تو وہ سر فضل حسین سے بنا کر رکھتے، انگریز اور یونینسٹ پارٹی کی مخالفت نہ کرتے اور پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نو نہ کرتے۔ سر فضل حسین کی ڈائری اور ان کے خطوط میں علامہ اقبال کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بننے کے بارے میں کوئی ذکر تک نہیں۔ نہ ہی کہیں متبادل امیدوار کے طور پر بھی ان کا نام لیا گیا ہے، نہ ہی ان کی ایسی کسی خواہش کو بیان کیا گیا ہے نہ ہی سر فضل حسین کا ظفر اللہ کے علاوہ کسی بھی شخص کے بارے میں ممبر بنوانے کا خیال یا ارادہ تھا۔ برٹش بیورو آف انٹیلی جنس کی رپورٹ کے مطابق اقبال ہندوستان میں ایک گھنا ترین بدمعاش The Quietest Rogue In India تھا۔(6) جب کہ سر ظفر اللہ انگریز کے نفس ناطقہ ان کی ہر سیاسی پالیسی کے مؤید اور مذہبی عقیدے کی رو سے برطانوی سامراج کے وفادار اور خیر خواہ تھے۔ اس لئے علامہ اقبال کے ممبر بنائے جانے کا سرے سے امکان ہی نہ تھا انگریز کا انتخاب محض ظفر اللہ تھے۔

زندگی کے آخری سالوں میں علامہ اقبال کی صحت گر رہی تھی، پریکٹس کم ہو گئی تھی اور انہیں مالی دشواریوں نے گھیر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ مسلمانوں میں بہت مقبول تھے اور مسلمان ان پر دل و جان نچھاور کرتے تھے لیکن پیشہ ور سیاست دانوں نے ان کو ہمیشہ نظر انداز کئے رکھا۔ تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آ کر وہ سیاست سے ایک لحاظ سے کنارہ کش ہو گئے تھے اگرچہ وہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن وہ اس وقت ایک کاغذی تنظیم تھی۔ پنجاب کے سیاست دان سر فضل حسین سے تعلقات کو اہمیت دیتے تھے اور اس کو اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے ممبر ہیں وہ ان سے عہدے اور

مراعات حاصل کرتے تھے اور انگریز کے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ سر فضل حسین علامہ اقبال کی بطور شاعر عزت کرتے تھے لیکن ان کے سیاسی نظریات اور اور ان کے انداز سیاست کو ناپسند کرتے تھے۔ اقبال کا خیال تھا کہ سر فضل حسین خود غرض اور موقع پرست شخص ہیں، وہ اپنی لیڈری کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں کم دلچسپی رکھتے ہیں۔ سر فضل حسین کے بیٹے عظیم حسین نے اپنے والد کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ان کے والد ہر سطح پر اقبال کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن اقبال نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کیا۔ مثال کے طور پر:

1- 1924ء میں سر فضل حسین نے پنجاب کے گورنر سر میلکم ہیلی کو اس بات پر راضی کیا کہ اقبال کو ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا جائے لیکن اس سے قبل اقبال نے برطانوی حکمرانوں پر سخت تنقید کر کے ان کی ہمدردیاں کھو دیں۔

2- 1927ء میں سر فضل حسین نے ایک تجویز پیش کی کہ ایک مسلم وفد اقبال کی سربراہی میں لندن جائے اور سکریٹری آف سٹیٹ برائے ہند کو سیاسی اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کرے لیکن اس وفد کے لئے فنڈ جمع کرنے کی تجویز کو علامہ اقبال نہ مانے بعد میں سر ظفر اللہ یہ وفد لے کر لندن گئے جن پر فضل حسین کو مکمل اعتماد تھا۔

3- سر فضل حسین اقبال کو پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا صدر منتخب کرانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے یونینسٹ پارٹی پر تنقید جاری رکھی جس کے باعث یونی نیسٹ رہنماؤں نے ان کی مخالفت کی اور ان کی جگہ سر شہاب الدین کو صدر منتخب کیا گیا۔

4- ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس لندن کے لئے علامہ اقبال کو سر فضل حسین کے ایماء پر مدعو کیا گیا۔ یہ بات غلط ہے ان کو خود وائسرائے ہند نے وفد میں شامل ہونے کی دعوت دی کیونکہ وہ اس وقت مسلم لیگ کے صدر تھے۔ (7)

5- سر ظفر اللہ کہتے ہیں کہ تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال کو انہوں نے مسلم وفد میں شامل کرایا۔ سر ظفر اللہ اس وقت سر فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے عارضی ممبر تھے وہ

کہتے ہیں:

تیسری گول میز کانفرنس میں گورنمنٹ برطانیہ ان کو نہیں بھیج رہی تھی اور نہ قائداعظم کو۔ تیسری گول میز کانفرنس کے لئے جب ڈاکٹر صاحب کا نام آیا تو وائسرائے نے مجھے بتایا کہ پچھلی کانفرنس میں انہوں نے کوئی کنٹری بیوشن نہیں کی نہ دلچسپی لیتے تھے میں نے کہا دلچسپی تو وہ اب بھی نہیں لیں گے۔ نہ میں گارنٹی دے سکتا ہوں کہ وہ تقریر کریں گے لارڈ ولنگڈن میرے ساتھ بے تکلف تھے انہوں نے کہا ' میرے پیارے پھر تم کیوں اصرار کرتے ہو،؟

My dear then why do you insist?

میں نے کہا کہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان طبقے میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا احترام ہے اگر یہ چلے جائیں تو وہ سمجھیں گے کہ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں کوئی کام کی بات ہو رہی ہے ڈاکٹر صاحب جو گئے [illegible] یں، میں تو اس پرسٹیج کے لئے چاہتا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تار میں لکھ دیا ہوگا [illegible] سیکرٹری آف سٹیٹ مان گئے تھے۔ میں اس وقت میاں صاحب کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تھا ورنہ تو میرا کوئی واسطہ ان باتوں سے نہ ہوتا۔ (8)

یہ بات ہم سر ظفر اللہ کی نیت پر چھوڑتے ہیں کہ انہوں نے علامہ اقبال سے دوستی کی بنیاد پر ان کا نام وفد میں شامل کرایا یا انگریز کی محبت میں کیا تا کہ مسلمانوں کا گول میز کانفرنس پر اعتماد برقرار رہے۔

اقبال نے کبھی کسی چھوٹے بڑے سرکاری عہدے کے لئے تگ و دو نہ کی۔ بعض اوقات انہوں نے مالی وجوہات کی بناء پر کسی منصب کے لئے سوچا بھی تو وہ وقتی نوعیت کا فیصلہ تھا۔ وہ دوستوں میں گھرے رہنے پر خوش رہتے تھے۔ وہ عوامی روابط نہ بڑھاتے تھے اور مشاعروں میں بہت کم جاتے تھے۔ سرکاری تقریبات میں تو شاذ ہی جاتے تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بننے کے لئے کس قسم کے سیاسی کردار اور اہلیت کی ضرورت تھی اور یہ عہدہ کن خدمات کے صلے میں دیا جاتا تھا اب ہم اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

سر ظفر اللہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر کیسے بنے؟

سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے اور ان کے پاس وزارت تعلیم کا قلم دان تھا۔ وسط ماہ جون 1932ء میں بیماری کے باعث انہوں نے چار ماہ کی چھٹی لی اور انگریزی حکومت نے فضل حسین کی سفارش پر ان کی جگہ ظفر اللہ کو عارضی رکن نامزد کر دیا ان کو محکمہ تعلیم وصحت دیا گیا۔

واضح رہے کہ جب کبھی ایسی اہم پوسٹ خالی ہو جاتی تھی یا خالی ہونے کی صورت پیدا ہوتی تھی تو ہندوستانی پریس میں افواہوں اور طرح طرح کی قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، کوئی اخبار کسی اہم شخصیت کا نام لیتا اور کوئی کسی کا ذکر کرتا۔ اس طرح اپنی پسند کے آدمی کو اس اہم منصب پر فائز کرانے کے لئے کئی قسم کے جواز تراشے جاتے تھے۔ سر ظفر اللہ سر فضل حسین کے پروردہ تھے اور فضل حسین کا حکومت میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ وہ جماعت احمدیہ کے ہمدرد تھے ان کے والد کے مرزا غلام احمد قادیانی سے خاندانی تعلقات تھے، خود انہوں نے دو تین بار مرزا صاحب سے ملاقات کی تھی۔

سر ظفر اللہ اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

سر فضل حسین کے بارے میں یہ ہے کہ ایک دفعہ جب آپ پہلی بار ولائت سے تشریف لائے، بیرسٹری کر کے، تو ابھی انہوں نے پریکٹس شروع نہیں کی تھی کہ ان کے والد صاحب نے انہیں قادیان بھیجا۔ ان کے شہر بٹالہ میں بعض احمدی خاندانوں سے تعلقات تھے ان کو ساتھ لے کر یہ قادیان آئے، میں اتفاق سے وہیں تھا۔ میں ان دنوں طالب علم تھا۔ خاصی دیر انکی ملاقات حضرت بانی سلسلہ سے ہوئی۔ ایک بات مجھے یاد ہے۔ میاں صاحب نے کچھ پریشانی کا اظہار کیا کہ آریہ بہت بڑھتے چلے جا رہے ہیں ان کے بارے میں تشویش ہے تو حضرت بانی سلسلہ نے فرمایا ''میاں صاحب ان لوگوں کی بنیاد روحانیت پر نہیں ہے اس لئے یہ زیادہ عرصہ نہیں چلیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دے یا فرمایا لمبی عمر دے آپ دیکھیں گے کہ یہ ختم ہو جائیں گے''۔

ایک یہ واقعہ یاد ہے، میاں صاحب کا لباس بھی یاد ہے سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ اچھی صحت والے تھے۔ اور پھر ایک بار میں موجود نہیں تھا میاں صاحب حضرت بانی سلسلہ سے اکیلے بھی ملے تھے۔ یہ

حضور کا آخری سفرِ لاہور تھا مئی 1908ء کی بات ہے۔

پھر رؤساء کی جو دعوت کی گئی تھی حضرت صاحب کی اجازت سے اور اس میں حضور نے خطاب بھی فرمایا تھا، اس میں بھی شامل ہوئے تھے۔

لیکن جو واقعہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ 1934ء میں جب میں ولایت میں تھا اس وقت یہاں یہ بڑا شہرہ ہو رہا تھا کہ میاں صاحب کی جگہ پر آئندہ اپریل میں کونسا شخص ہوگا۔ سر فضل حسین نے کہا میرے پاس چند علماء وفد لے کر آئے اور مجھے کہا کہ یہ کرو، وہ کرو اور احمدیوں کو آگے نہ آنے دو۔ میں نے کہا کہ تم کو کیا اعتراض ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ مسلمان کی جگہ ہے اور ظفر اللہ مسلمان نہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا اگر وہ مسلمان نہیں تو اس نے مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے بڑھ کر ہماری خدمت کی ہے تو تم کو اور کیا چاہئے۔ انہوں نے کہا نہیں ہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ یہ سیٹ جو مسلمانوں کی ہے اس پر غیر مسلم قبضہ کر لیں۔ میاں صاحب نے کہا آپ ان کو کیوں غیر مسلم سمجھتے ہیں؟ انہوں نے حضرت بانی سلسلہ کے عقائد کے بارے میں بعض باتیں کہیں کہ وہ فلاں فلاں عقیدہ رکھتے تھے۔ میاں صاحب نے کہا میں زیادہ مسئلے مسائل نہیں سمجھتا۔ خود انہوں نے مجھے بعد میں بتایا کہ میرے پاس دُرِّثمین (مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک تصنیف) تھی میں اٹھا اور دوسرے کمرے سے جا کر وہ کتاب اٹھا لایا اور ان کو دی اور کہا کہ یہ لے جاؤ اس کا اچھی طرح مطالعہ کرو اگر اس کتاب کے مصنف سے زیادہ کسی عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تمہیں پتہ ہو تو مجھے آ کر بتانا۔

ان کے بڑے بیٹے نے بیعت کی آپ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ تو وہ احمدی تو نہیں تھے لیکن حضرت بانی سلسلہ کو مفتری نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے انہوں نے اپنی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں بڑا زور لگا کر رکن بنوایا حالانکہ ملک فیروز خاں نون کو مجھ سے زیادہ تجربہ تھا۔ وہ صوبے میں وزیر بھی رہ چکے تھے اور ان کا بھائی میاں فضل حسین صاحب کا داماد بھی تھا۔ اور بھی تھے میاں صاحب کے تعلقات والے احمد یار خاں دولتانہ، سکندر حیات وغیرہ''۔(9)

سر فضل حسین کو ظفر اللہ کی وفاداری پر یقین تھا۔ اور یہی اعتماد حکومت برطانیہ کو تھا۔ سر فضل حسین

جماعت احمدیہ کو نوازنے اور مرزا محمود خلیفہ قادیان کو زیر بار احسان رکھنا چاہتے تھے وہ ان سے یونینسٹ پارٹی اور سرکار برطانیہ کے لئے خدمت لیتے رہتے تھے کچھ ظفر اللہ کی اپنی لیاقت کا بھی اس میں کسی قدر دخل تھا۔ پریس میں جیسے ہی سر ظفر اللہ کی تقرری کی خبر اڑتی تھی ہندو پریس مسلم دشمنی کے باعث ان کی مخالفت کرتا اور مسلم پریس ان کے غیر مسلم (قادیانی) ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف اداریے لکھتا۔ بعض اخبارات ایسے بھی تھے جو ان کی حمایت میں دلائل تراشتے ان میں زیادہ تر لبرل خیالات اور قومی فلاح و بہبود کے نام لیوا سرکار کے حامی اخبارات تھے۔ وہ سیاسی عناصر جو قادیانی خلیفہ اور جماعت احمدیہ سے تعاون کو اپنی ترقی کا زینہ سمجھتے تھے اور مستقبل میں فوائد حاصل کرنے کی امید رکھتے تھے ظفر اللہ کے تقرر کو نہایت دانشمندانہ اور درست فیصلہ قرار دیتے اور قادیانی اکابر اور انگریز حکام سے ملاقاتوں میں ان کے انتخاب کی داد دیتے تھے۔

1932ء میں چار ماہ کے لئے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر نامزد ہونے کے وقت سر ظفر اللہ دہلی سازش کیس میں کراؤن کونسل یا سرکاری وکیل تھے۔ یاد رہے پنجاب کے دو انقلابیوں بھگت سنگھ اور دت نے مرکزی اسمبلی کے ایوان میں 18 اپریل 1929ء کو دو بم پھینکے۔ یہ لاہور سازش کیس کہلاتا ہے اس جرم میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو 22 مارچ 1931ء کو لاہور میں پھانسی دے دی گئی۔ ابھی یہ مقدمہ چل رہا تھا کہ 23 دسمبر 1929ء کو دہلی کے قریب وائسرائے کی ٹرین کو بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ بچ گئے۔ اسے دلی سازش کیس کہتے ہیں اس کیس کی پیروی کرنے اور حریت پسند انقلابیوں (جنہیں قادیانی اور برطانوی حکومت باغی اور دہشت پسند کہتے تھے) کو سزا دلانے کے لئے حکومت نے ظفر اللہ کی خدمات حاصل کیں اور ان کو بھاری فیس ادا کی گئی تھی یہ خدمت صرف ایسے شخص کو سونپی جا سکتی تھی جو سرکار برطانیہ کا پکا وفادار ہو اور آزادی پسندوں کو ہر ممکن قانونی ہتھکنڈوں سے تختہ دار پر لٹکوانے میں ماہر ہو۔ انقلابیوں کی طرف سے آصف علی (ارونا آصف علی کے شوہر) اور سیف الدین کچلو پیش ہوئے۔

خیر یہ تو چار ماہ کی مدت کے لئے ظفر اللہ کی وائسرائے کونسل میں تقرری کا مسئلہ تھا جب سر فضل حسین

بیماری کے باعث ایبٹ آباد میں چھٹیاں گزار رہے تھے، تو اس تقرری نے ان کے آئندہ ممبر بننے کے امکانات پیدا کر دیئے کیونکہ فضل حسین تھوڑے عرصے بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔

سر ظفر اللہ کا وائسرائے کی کونسل میں مستقل تقرر

تیسری گول میز کانفرنس 17 نومبر سے 24 دسمبر 1932ء تک منعقد ہوئی جس میں ظفر اللہ نے شرکت کی۔ سر فضل حسین نے ان کو محمد علی جناح کو دوبدو جواب دینے کی ہدایت کر رکھی تھی۔(10) کیونکہ وہ ان کے سیاسی نظریات کے خلاف تھے۔ انہوں نے چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم کی مخالفت کی(11) اور اسے طلباء کی سکیم اور ناقابل عمل بتایا۔

جولائی 1934ء کے اوائل میں سر ظفر اللہ اپنے خرچ پر لندن گئے انہوں نے سکریٹری آف سٹیٹ اور دیگر اعلیٰ برطانوی افسروں سے ملاقاتیں کیں تاکہ اپنے سیاسی مستقبل کی راہ ہموار کر سکیں۔ انہوں نے لندن کے پارک لین ہوٹل میں سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند سر سموئیل ہور کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ وزیر ہند نے ان کی گول میز کانفرنسوں اور جائنٹ سلیکٹ کمیٹی میں انجام دی گئی خدمات کو سراہا اور انہیں یقین دلایا کہ ہندوستان میں ان کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور امید ظاہر کی کہ وہ برطانیہ کے ہمیشہ مخلص رہیں گے۔(12)

سیکرٹری آف سٹیٹ سر سیموئل ہور نے سر ظفر اللہ سے کہا کہ دو سال ہوئے انہوں نے سر فضل حسین کی جگہ کام کیا تھا۔ اب ان کی اور وائسرائے ہند (لارڈ ولنگڈن) کی خواہش ہے کہ آئندہ سال تم سر فضل حسین کی جگہ لو۔ ظفر اللہ کہتے ہیں کہ انہوں نے سکریٹری آف سٹیٹ کو بتایا کہ پنجاب سے دو آدمی میاں سر شفیع اور میاں سر فضل حسین پہلے ہی کونسل کے ممبر رہ چکے ہیں اب ان کا تقرر ہوا تو بنگال، یوپی وغیرہ کے مسلمانوں کو شکوہ ہوگا لیکن سکریٹری آف سٹیٹ نے جواب دیا کہ حکومت برطانیہ کسی صوبہ وارانہ انتخابی قاعدے کی پابند نہیں۔ ظفر اللہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نواب چھتاری اور سر سکندر حیات کے نام موزوں امیدواروں کے طور پر پیش کئے لیکن سکریٹری آف سٹیٹ نہ مانے (13) اور انہوں نے ظفر اللہ کو ہی یہ 'سعادت' بخشی۔

سر ظفر اللہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے وزیر ہند سے یہ بھی کہا کہ وہ احمدی ہیں، مسلمان اس پر احتجاج کریں گے، سکریٹری آف سٹیٹ نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا اس پر ظفر اللہ نے جواباً کہا کہ وہ شروع ہی سے اپنے تقرر پر رضامند ہیں۔

3 اکتوبر 1934ء کو ان کی وزیر ہند سر سیموئل ہور سے پھر ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے بتایا کہ ان کی تقرری کے بعد انہیں ہندوستان سے بہت سے تار اور مراسلات اس کی مخالفت میں آئے ہیں لیکن انہوں نے اپنے سیکرٹری کر ودفٹ کو کہہ دیا ہے کہ جو بھی خط یا تار اس سلسلے کا آئے اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دے۔ انہوں نے کر ودفٹ کو بلوا کر کہا کہ وائسرائے کو جلد اطلاع کرو کہ ظفر اللہ اس تقرر پر رضامند ہے آئندہ ہفتے اس کے تقرر کا اعلان کر دیا جائے۔ وزیر ہند انہیں فضل حسین کے قلمدان کے بجائے سر جوزف بھور ممبر وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کا قلمدان تجارت اور ریلوے دینا چاہتے تھے۔

سر ظفر اللہ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں کہ نومبر 1934ء میں وہ لندن سے واپس ہندوستان آئے۔ ہندوستان میں سر فضل حسین کی جگہ نئے آدمی کے تقرر کی بحث اخبارات اور سیاسی حلقوں میں جاری تھی۔ اس سلسلے میں کئی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ظفر اللہ نے وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن سے دہلی میں ملاقات کی اور انہوں نے ان کو (سیکرٹری آف سٹیٹ کی ایماء پر) کونسل کا ممبر بننے کی تجویز پیش کی۔ ظفر اللہ کہتے ہیں کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ سر سموئل ہور برطانوی سکریٹری آف سٹیٹ پہلے ہی "پختہ طور پر" اس کو فرما چکے تھے لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ خود اس کا ان سے ذکر کریں۔ (14)

وہ اسمبلی میں یورپین اراکین جوزف بھور وغیرہ سے وائسرائے کی ہدایت پر ملتے رہے اس دوران وزیر ہند سر سیموئل ہور نے وائسرائے کو ایک سخت ڈانٹ کا خط لکھا کہ ظفر اللہ کے تقرر میں دیر کیوں کی جا رہی ہے۔ اور اس طرح ظفر اللہ کو اپنی مرضی کا محکمہ اور وائسرائے کونسل میں تقرر کا پروانہ مل گیا۔ واضح رہے کہ 1934ء میں حکومت ظفر اللہ کو سر شادی لال کی جگہ ہائی کورٹ کا جج بنانے پر رضامند تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ وائسرائے ہند نے انہیں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ کی پیشکش کی لیکن انہوں نے اس کو بھی قبول نہ کیا اور مئی 1935ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر مقرر

کئے گئے۔(15) جس میں ان کو دلچسپی تھی۔

اخبار الفضل ان کے تقرر میں تاخیر کے متعلق لکھتا ہے:

اخبار احسان نے لکھا ہے کہ ظفر اللہ کو عارضی طور پر وائسرائے کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا ہے یعنی جب تک سر جوزف بھور لندن سے واپس نہیں آتے۔ اخبار نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس عارضی تقرر کے دوران وہ اپنے حامی پیدا کریں گے اس لئے مسلمانوں کے احتجاج میں فرق نہیں آنا چاہئے اسی لئے احراریوں نے شور جاری رکھا ہوا ہے۔

''اب احراریوں کو یہ سن کر خودکشی کر لینی چاہئے کہ ملک معظم نے جناب چودھری صاحب کو 26 مئی 1935ء (16) سے وائسرائے کی کونسل کا مستقل ممبر مقرر کر دیا ہے۔ اور اس کا اعلان گزٹ آف انڈیا میں ہو گیا ہے۔ اس طرح ایک بار پھر نہ صرف مدیر و سردبیر احسان کی حماقت اور نادانی کی یاد تازہ ہو گئی بلکہ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جناب چودھری صاحب کے خلاف احراریوں کو شور و شر مچانے میں کلیۃً ناکامی و نامرادی حاصل ہو چکی ہے۔''(17)

اس شمارے میں اخبار الفضل نے سر ظفر اللہ کو نائٹ ہڈ کا خطاب دینے کا ذکر کیا ہے جو ملک معظم کے یوم ولادت اور سلور جوبلی کی تقریب پر انہیں دیا گیا۔ اخبار نے جماعت احمدیہ کی طرف سے انہیں ہدیہ تبریک پیش کیا اور دعا کی کہ خدا انہیں بیش از بیش انعامات کا مورد بنائے۔ وہ پہلے احمدی ہیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔(18)

یہ پس منظر ہم نے اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ برطانوی حکومت وزارت اور شرکت اقتدار کے لئے ہر شخص کو دعوت نہ دیتی تھی بلکہ کئی باتوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا علامہ اقبال اس وفاداری اور اطاعت سرکار کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ کیا انہوں نے اس تقرری کے دوران کسی مسلم ادارے، جماعت یا تنظیم سے اپنے حق میں پروپیگنڈا کرایا، پس پردہ مسلمانوں کو ظفر اللہ کے تقرر کے خلاف احتجاج پر اکسایا یا کوئی اور سیاسی حربہ استعمال کیا؟ کیا انہوں نے

کسی انگریز حکمران، اپنے کسی دوست، ریاستوں کے کسی فرماں روایا سیاسی شخصیت سے کوئی ملاقات کی یا کوئی خط لکھا جس میں یہ کہا گیا ہو کہ سر ظفر اللہ کے ممبر بننے سے ان کی حق تلفی ہوئی ہے؟ کیا وہ اس سلسلے میں گورنر پنجاب سر ایمرسن یا وائسرائے لارڈ ولنگڈن سے ملے۔ (19) کیا انہوں نے اس تقرر کے خلاف خود کوئی احتجاجی بیان دیا یا کسی سے دلوایا؟ کیا انہوں نے سر فضل حسین کے در دولت پر حاضری دی؟ کیا انہوں نے ظفر اللہ کے تقرر کے سرکاری فیصلے کے بعد کسی مرحلے پر اپنی وفات تک کبھی کسی سے اشارتاً یا کنایتاً کوئی ذکر کیا، اگر ایسی کوئی بات نہیں تو اس کو محض الزام ہی کہا جا سکتا ہے۔

سر ظفر اللہ لکھتے ہیں کہ 1932ء میں جب ان کے سر فضل حسین کی چار ماہ کی رخصت کے دوران عارضی تقرر کی بحث جاری تھی اور وہ دلی سازش کیس میں سرکاری وکیل کے فرائض انجام دے رہے تھے تو روز نامہ ٹریبون (ایک کانگریسی اخبار) میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ان کی جگہ اس عرصے کے لئے لاہور کے ایک وکیل کا تقرر ہو گا۔

ظفر اللہ کہتے ہیں کہ خبر پڑھ کر صفدر علی اسسٹنٹ جیلر نے جو مقدمہ سازش کے ملزمان کو جیل خانے سے عدالت لاتے اور لے جاتے تھے ٹیلی فون پر انہیں مبارک باد دی۔ ظفر اللہ کہتے ہیں "میں نے انہیں بول دیا کہ خبر میں کوئی نام درج نہیں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا ہی تقرر ہو گا دوسری صبح انہوں نے پھر ٹیلی فون کیا کہ آج نام چھپ گیا ہے لیکن ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام ہے تمہارا نہیں، میں (ظفر اللہ) نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میری نسبت کہیں زیادہ اس کے اہل ہیں"۔ (20)

ظفر اللہ چاہے خود 1932ء میں علامہ اقبال کی اہلیت کی بناء پر ان کی تقرری کے معترف ہوں لیکن ان کو معلوم تھا کہ قرعہ فال انہی کے نام نکلے گا۔ اصولی طور پر تو علامہ اقبال اس کے اہل تھے لیکن انگریز کی کتاب میں کچھ اور مقاصد اور سیاسی تقاضے بھی تھے جن کو پورا کرنا ضروری تھا اس لئے یہ بات ہر لحاظ سے غلط ہے کہ علامہ اقبال کو سر ظفر اللہ کے تقرر سے کوئی رنجش یا احساس محرومی ہوا اور انہوں نے اس کو قادیانیت کے خلاف مضامین لکھ کر نکالا۔ قادیانیت کے خلاف مضامین میں انہوں نے کسی فرد پر

کسی قسم کی تنقید نہیں کی بلکہ مجموعی طور پر تحریک کے اسلام مخالف کردار کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کو اس کے تہذیبی اور سیاسی مضمرات سے آگاہ کیا ہے جس کو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ ایکٹ آف 1935ء کے نفاذ کے بعد پنجاب میں جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہونے والی تھیں ان کی روشنی میں مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ پر ان کی نظر تھی۔ علامہ اقبال کے مضامین پر سید حبیب کے اخبار سیاست اور بعض دوسرے اور تیسرے درجے کے اخبارات جیسے روزنامہ حق لکھنو نے جو تنقیدی اداریے لکھے ان میں اور باتوں کے علاوہ یہ شوشہ چھوڑا کہ علامہ اقبال کو چونکہ وائسرائے کونسل کا ممبر نہیں بنایا گیا اس لئے وہ احمدیت کے مخالف ہو گئے اور ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تا کہ یہ ظاہر ہو کہ ظفر اللہ غیر مسلم ہیں، انکا تقرر مسلم سیٹ پر کیوں کیا گیا۔ ظفر اللہ کے تقرر کی خبر 1934ء سے اڑ رہی تھی علامہ اقبال کوئی تحریک چلاتے تو اس زمانے میں چلاتے جب اس کا کوئی اثر پڑتا، جب یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ ظفر اللہ ہی ممبر بنیں گے، پھر احمدیوں کی مخالفت کا کیا فائدہ تھا۔ علامہ اقبال نے ان الزامات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

سر ظفر اللہ کا ایک غیر مطبوعہ انٹرویو قادیانی ماہنامہ انصار اللہ ربوہ میں شائع ہوا اس میں وہ فرماتے ہیں کہ 1940ء میں وائسرائے کونسل کے ممبر کے طور پر ان کے عہدہ کی معیاد ختم ہونے والی تھی لیکن اس معیاد کے ختم ہونے سے پہلے سپیشل وارنٹ آف کنگ (Warrant of King) کے ذریعے انہیں مزید پانچ سال کے لئے ممبر مقرر کیا گیا لیکن انہوں نے ایک سال پانچ ماہ بعد فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج کا عہدہ قبول کر لیا۔

سوال: محترم چوہدری صاحب آپ کی پبلک لائف کا آغاز کب ہوا؟

جواب: پبلک لائف سے نجانے آپ کی کیا مراد ہے۔ میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز وکالت کی پریکٹس سے کیا۔ پھر 1926ء میں میں صوبائی کونسل کا رکن منتخب ہوا اور اس طرح سے پنجاب کی سیاست میں میرا عمل دخل شروع ہوا اور ایک لحاظ سے پہلا پبلک عہدہ 1932ء کے موسم سرما میں حاصل کیا جبکہ میں میاں سر فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں عارضی طور پر رکن مقرر ہوا۔ اس کے بعد 1935ء

(17) اخبار الفضل قادیان 5 جون 1935ء۔ آنرایبل سر چوہدری ظفراللہ خان صاحب کا وائسرائے کی کونسل میں مستقل تقرر

(18) ایضاً

(19) میاں شفیع (م ش) لکھتے ہیں کہ جن دنوں فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیر غور تھا وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ایک ملاقات میں علامہ اقبال سے کہا کہ اب ہم اکثر ملتے رہا کریں گے۔ علامہ اقبال کے وائسرائے سے ملنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ولینگڈن 1931ء سے 1936ء تک وائسرائے ہند رہا۔ 1934ء یا اس سے پہلے علامہ اقبال کے ان سے ملنے کی کوئی شہادت نہیں۔ م ش نے یہ روایت قادیانی موقف کو تقویت پہنچانے کے لئے گھڑی ہے جیسا کہ ان کا وطیرہ تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اس بات کی تردید کی (زندہ رود، ص: 582)

(20) تحدیث نعمت ص 299

(21) ماہنامہ انصاراللہ ربوہ، نومبر دسمبر 1985ء

باب 8

قادیانیت کے حقیقی خدوخال

علامہ اقبال نے مئی 1935ء کے دوسرے ہفتے میں اپنا پہلا بیان 'قادیانی اور جمہور مسلمان' سٹیٹس مین دہلی میں شائع کرایا۔ انہوں نے اسلام میں عقیدہ ختم نبوت کی تمدنی اہمیت، اس عقیدے کے خلاف قادیانیوں کی بغاوت، قادیانیت کے دیگر عقائد، اس کا یہودیت کی طرف راجع ہونا اور دین کی باغی اس جماعت سے مسلمانوں کو پہنچنے والے معاشی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی نقصانات کی نشاندہی کی۔(1)

اس بیان اور اس پر سٹیٹس مین کے تبصرے 14 مئی 1935ء کے بعد بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ علامہ اقبال نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانیوں کو کچل دے۔ علامہ نے اس بات سے انکار کیا۔ 10 جون کو انہوں نے اخبار سٹیٹس مین کو ایک خط لکھا جس میں کہا کہ حکومت کیلئے بہترین طریق یہ ہے کہ وہ ان کو الگ جماعت تسلیم کرے جو قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہو گا، مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لیں گے جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتے ہیں۔(2)

علامہ اقبال کے بیان کے اہم نکات

- ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لئے ایک خطرہ تصور کریں گے اور یہ اس لئے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہے۔
- اسلام جو تمام جماعتوں کو ایک لڑی میں پرونے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی تحریک کے ساتھ کوئی

ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لئے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لئے مزید افتراق کا باعث بنے۔

- بہائیت قادیانیت سے زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن قادیانیت اسلام کی چند اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لئے مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصور جس کے پاس دشمنوں کے لئے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہیں، اس کا نبی کے متعلق کاہن کا تخیل اور اس کا روح مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔
- اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے تحت جو ملحدانہ تحریکیں اٹھیں انہوں نے بروز، ظل، حلول وغیرہ کی اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کے تصور کو چھپا سکیں۔ مسیح موعود کی اصطلاح بھی اسلام کے دور اول کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔
- قادیانیوں نے معاشرتی طور پر مسلمانوں سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور دنیائے اسلام کو کافر کہتے ہیں۔ وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے پر کیوں مصر ہیں؟
- علامہ ذاتی طور پر تحریک سے اس وقت بیزار ہوئے جب ایک نئی نبوت، بانی اسلام ﷺ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا، اور ایک قادیانی کی زبان سے خود انہوں نے آنحضرت ﷺ کے خلاف نازیبا کلمات سنے۔
- قادیانیوں کے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کی رو سے مسلمانوں سے الگ ہو جائیں۔ حکومت کے لئے بھی بہتر طریق یہی ہے کہ وہ ان کو الگ جماعت قرار دے۔(3)

حقائق پر مبنی دلائل

مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک کی ابتداء اور اس کی مخالفت کے آغاز 1891ء سے لے کر 1935ء تک اہل علم حضرات نے سیکڑوں کتب، رسائل اور اشتہارات شائع کر کے مرزا صاحب کے

دعاوی اور دلائل کی تردید کی۔ یہ تمام لٹریچر مرزا غلام احمد کی پیش گوئیوں کے جھوٹا ہونے، حیاتِ مسیح کے دلائل، مہدی اور مجدد کے عقیدے اور ختم نبوت کے دینی ثبوت پر مشتمل ہے۔ اس کے جواب میں مرزا غلام احمد نے اپنے مخالفین کو نہایت سخت اور تحقیر آمیز انداز سے مخاطب کیا اور اپنے دعوؤں کو اپنی وحی سے تقویت دی۔

مسلمانوں نے تحریک احمدیت کے حقیقی مقاصد اور اس کے عواقب وعوامل کا بہت کم جائزہ لیا تھا، علامہ اقبال نے پہلی دفعہ کھل کر بتایا کہ تحریک احمدیت کے مسلمانانِ عالم خصوصاً اسلامیانِ ہند کے لئے سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی مضمرات کیا ہیں انہوں نے اپنے مضامین میں واضح کیا کہ مرزا غلام احمد نے نئی نبوت کا دعویٰ کیا اور بروز اور ظل کی متصوفانہ اصطلاحات کی آڑ میں ختم نبوت کا انکار کیا اور نبی کریمؐ کے ختم نبوت کے منصب پر ڈاکہ ڈالا۔ انہوں نے اپنی وحی کی بنیاد پر امت محمدیہ کی شکست و ریخت کر کے ایک نئی امت تشکیل دی جس کے لئے مسلمانوں کو کھل کر کافر قرار دیا، ان سے رشتہ ناطہ خدا کے حکم سے ممنوع قرار دیا، غیر احمدی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی ممانعت کی اور مسلمانوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ایک نئی جماعت کی نیو اٹھائی۔ یہ اسلام سے کھلی غداری اور بغاوت تھی چونکہ انہوں نے انگریز کی اطاعت اور وفاداری کا درس دیا اور اس کی مذہبی رواداری سے فائدہ اٹھا کر اپنے باطل نظریات کی ترویج کی اس لئے مسلمانوں کو اپنے ملی استحکام اور دینی وحدت کے تحفظ کے لئے ایسی باغی جماعت کو اپنے سے الگ قرار دینے کا حق حاصل ہے اور حکومت کو چاہئے کہ ان کو مسلمانوں سے الگ قرار دے۔

قادیانی اپنے اس جرم یعنی اسلام دشمن معتقدات اور دین کے خلاف کھلی بغاوت کا ذکر نہیں کرتے جس کا مرزا غلام احمد نے ارتکاب کیا بلکہ اپنے گھسے پٹے دلائل دہراتے رہتے ہیں مرزا صاحب کے دو صاحبزادوں مرزا محمود احمد اور مرزا بشیر احمد ایم اے نے جس انداز سے ان کے دعاوی کی صداقت اور مسلمانوں کی قادیانیوں سے مکمل علیحدگی پر زور دیا وہ اس کے مضمرات کو زیر بحث نہیں لاتے، اس کے بجائے علامہ اقبال کی ذات پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ قادیانی مبلغ علامہ

اقبال کے دلائل کا رد پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے کیونکہ جس انداز سے علامہ نے حقائق کو واضح کیا وہی تحریک احمدیت کا مدعا و مقصود اور اس کی حقیقی روح ہے۔ علامہ نے یہ بھی کہا کہ قادیانی جماعت ہی احمدیت کے اصل منشا اور نظریے کی صحیح ترجمان ہے لاہوری جماعت نہیں۔

مرزا صاحب کے دعاوی، الہامات اور تحریرات اور ان کی قادیانی اصول کی فلاسفی کی بنیاد پر علامہ اقبال نے ان کے نفسیاتی تجزیہ کا مطالبہ کیا اور ان کو ایک ذہنی مریض قرار دیا جیسا کہ ان کے وحی و الہامات کے اس وقت کے شائع شدہ مختصر مجموعے البشریٰ سے مترشح تھا بعد میں ان کا ایک جامع مجموعہ، تذکرہ قادیان سے شائع ہوا جو اس مسئلہ کی بہتر تفہیم مہیا کرتا ہے۔

1931ء کے نصف آخر میں علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ لندن مشن کے قادیانی امام فرزند علی نے علامہ اقبال اور وفد کے بعض دوسرے اراکین کو کھانے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال نومسلم انگریزوں کی زبان سے قرآن سن کر خوش ہوئے۔ ایک انگریز نوجوان عبدالرحمٰن ہارڈی کے حسن قرات اور صحیح تلفظ سے بے حد محظوظ ہوئے ایک انگریز بچی سے سورہ فاتحہ سن کر اس کو ایک پاؤنڈ انعام دیا اور امام مسجد لندن کا شکریہ ادا کیا جن کی توجہ سے یہ موقع میسر آیا۔(4)

اس واقعے کے چند ماہ بعد ان کے ایک دوست محمد احسن نے جن کے بھائی محمد حسن لاہوری احمدی تھے ان کو اپنے بارے میں قادیانیت اختیار کرنے کے متعلق ایک خط لکھا۔ انہوں نے 17 اپریل 1932ء کو اس کے جواب میں فرمایا۔

1- مرزا صاحب نے اسلام کو پیش کرنے کا جو طریق اختیار کیا وہ زمانہ حال کی طبائع کے لئے موزوں نہیں۔

2- لاہور جماعت میں ایسے افراد ہیں جو غیرت مند مسلمان ہیں ان کی مساعی میں ان کا ہمدرد ہوں اس جماعت کے اکثر افراد میں اشاعت اسلام کا جو جوش پایا جاتا ہے وہ قابل قدر ہے۔(5)

3- لاہوری جماعت میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ان کی اپنی سمجھ اور رائے پر ہے۔

انہوں نے یہ مشورہ نہ دیا کہ ضرور شامل ہو جاؤ یہ سچے ہیں اور میں بھی احمدی خیالات رکھتا ہوں۔

1935ء میں علامہ اقبال نے قادیان اور لاہور جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں اور بلند بانگ دعوؤں کا ازسرنو جائزہ لیا اور اپنی سابقہ رائے تبدیل کر لی۔ ان کو لاہور جماعت کے ووکنگ مشن کے قیام میں برطانوی حکومت کے سیاسی مقاصد کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت نے جس رواداری کا مظاہرہ کیا تھا اس نے اسلام کے لئے بعض پیچیدہ مسائل کو جنم دیا۔ علامہ فرماتے ہیں:

پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا زوال و انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ کٹ پتلی تھے۔ ایران میں بھی اس قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا لیکن اس میں نہ وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لئے ہندوستان میں پیدا کئے ہیں۔

روس نے بابی مذہب سے رواداری کا برتاؤ کیا اور انہیں عشق آباد میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی انگلستان نے احمدیوں کو ووکنگ میں اپنا پہلا تبلیغی مشن قائم کر کے ویسی ہی رواداری سے کام لیا۔ ہمارے لئے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بناء پر کیا یا وسعت نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لئے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے۔ اسلام کی اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، یقین کامل ہے کہ ان دشواریوں سے وہ زیادہ پاک و صاف ہو کر نکلے گا۔(6)

اسلام کی تبلیغ کے بارے میں علامہ اقبال کے نقطہ نظر کی سید نذیر نیازی نے بہت عمدہ ترجمانی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام کی صرف یہی خدمت اور مطالبہ نہیں کہ تبلیغ کی جائے بلکہ عقائد کی تبلیغ کے علاوہ یہ اس طرز زندگی کی تبلیغ ہے جس کی اسلام نے نوع انسانی کو دعوت دی اور

امت محمد یہ خیر الامت قرار پائی۔ اسکے لئے فرد اور جماعت دونوں کا ایک مخصوص اور مسلسل جدوجہد کرنا ضروری ہے ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کی حیثیت انفرادی نہیں ہوگی بلکہ سیاسی اور اجتماعی ہوگی تا کہ ہم ایک دوسرے سے اپنے روابط، سیرت کردار اور معاملات کی دنیا میں وہ تبدیلی پیدا کریں جس کا اسلام خواہشمند ہے اور جس کے پیش نظر اس میں ریاست کا وجود لازم ٹھیرتا ہے لہٰذا اگر تبلیغ اسلام سے مراد یہ ہے کہ ایک دستور حیات کے طور پر اسلام کی تبلیغ ہو تو اس کا بیڑا وہی جماعت اٹھا سکتی ہے جو خود بھی اس پر عمل پیرا ہو ورنہ ناممکن ہے اس میں کوئی معنی پیدا ہوں۔ لیکن جماعت احمدیہ کا تو یہ نقطہ نظر ہی نہیں، سیاست اس کے نزدیک شجر ممنوعہ ہے اور حکومت خواہ کوئی بھی ہو اس کی وفاداری ان کے ایمان کا جزو اعظم ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ زوال پذیر حالت اور فکر و عمل کی غلطیوں کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں وہ اپنے مخصوص عقائد کی چاردیواری میں بند ہیں۔ 1912ء میں جب ووکنگ مشن لندن میں قائم ہوا تو مسلمانوں نے عقیدہ کے اختلاف کے باوجود مالی مدد کی ان کا خیال تھا کہ یورپ نے اسلام قبول کر لیا تو ان کی شکست فتح مندی میں بدل جائے گی۔ اسلام عالمگیر دعوت کا تقاضا فرد اور جماعت سے کرتا ہے اس کی نوعیت محض تبلیغی نہیں عملی اور اجتماعی ہے۔ (7)

علامہ اقبال کے بیان پر اعتراضات

علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان پر لاہوری جماعت کے ہفتہ وار اخبار لائٹ لاہور نے تبصرہ کیا کہ علامہ اقبال الہام پر یقین نہیں رکھتے۔ علامہ اقبال نے مدیر لائٹ (محمد یعقوب خان) کی توجہ اپنی کتاب تشکیل نوص 21 کی طرف مبذول کرائی جس میں اس بات پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ وہ الہام کے منکر نہیں لیکن ختم نبوت کے بعد کسی شخص کے الہام کو دین میں حجت نہیں سمجھتے۔ جب ان کی توجہ لائٹ کے اس استفسار پر کہ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد آتا ہے مبذول کرائی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ بخاری و مسلم میں یہ حدیث نہیں جو تاریخی عمل کا نہایت حسابی تصور پیش کرتی ہے۔

جب علامہ اقبال کی توجہ ایک دوسرے قادیانی اخبار سن رائز کے ایک خط کی طرف مبذول

کرائی گئی جس میں علامہ کی ایک تقریر کا حوالہ دیکر تناقض خود کا الزام لگایا گیا تھا تو آپ نے جواب میں کہا کہ انہیں افسوس ہے کہ ان کے پاس نہ وہ اصل انگریزی تقریر اور نہ اس کا ترجمہ موجود ہے جس میں جماعت قادیان کو ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ کہا گیا ہے۔ انہوں نے 1911ء یا اس سے قبل یہ تقریر علی گڑھ میں کی تھی اور اس وقت انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ مولوی چراغ علی نے بھی مرزا صاحب کی کتاب براہین احمدیہ کی تصنیف میں ان کی مدد کی تھی۔ کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی اس میں برسوں لگتے ہیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی تنازعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو مرزا صاحب کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ یہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر وہ اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوے جب ایک نئی نبوت، بانی اسلامؐ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا تھا۔(8) اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ یہ بیزاری بعد میں بغاوت میں بدل گئی جب انہوں نے خود تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرتﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ اگر انکے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے تو یہ ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ رائے بدل سکے بقول ایمرسن صرف پتھر آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔(9)

واضح رہے کہ جب علامہ اقبال کو علی گڑھ کی تقریر کا مسودہ مل گیا تو انہوں نے 12 اکتوبر 1935ء کو اس پر نوٹ لکھا کہ اس تحریک کی روح اسلام کے خلاف ہے اور یہ آخر کار بہائیت پر اختتام پذیر ہو گی جہاں سے یہ اثر پذیر ہوئی۔

جب علامہ اقبال سے الہام اور مصلحین کے آنے کے امکانات کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے بتایا کہ ختم نبوت کا مقصد ہی یہ ہے کہ روحانی زندگی میں اب ایسا کوئی الہام یا وحی نہیں ہو سکتی جو ذاتی سند کا درجہ رکھتی ہو اور جس کا انکار مستلزم کفر ہو۔ باطنی واردات اور کیفیات کا تجربہ صوفیاء بلکہ غیر مسلموں نے بھی بیان کیا ہے۔

ایک پارسی کا مراسلہ

ایک پارسی مسٹر اے ڈنشا نے علامہ اقبال کے بیان پر اخبار سٹیٹس مین کلکتہ کو ایک مراسلہ بھیجا۔ 'حرف اقبال' اور اقبال کی تقاریر بیانات اور مضامین کے دیگر مجموعوں میں یہ مراسلہ درج نہیں، علامہ اقبال نے جو جواب دیا ہے وہ موجود ہے۔اس لئے ہم ڈنشا کے انگریزی خط کا ترجمہ روزنامہ الفضل سے نقل کرتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال نے اپنی اپیل میں مذہبی موضوع کو سیاسی بازیگاہ میں لانے کی کوشش کی ہے اس پر آپ کے اخبار سٹیٹس مین کا مقالہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی مبصرانہ تلخ نوائی کے مقابلے میں قابل تحسین اعتدال کا مظہر ہے۔ وہ لوگ جنہیں ڈاکٹر صاحب موصوف سے عقیدت ہے اور وہ ان کے جوہر خداداد کے ثنا خواں ہیں، انہیں یقیناً افسوس ہوا ہوگا کہ انہوں نے اس نوع کی بحث کو اپنی بین الاقوامی شہرت سے وزنی کرنے کی کوشش کی ہے۔ غیر مسلم طبقہ شاید اس سے اتفاق کرے کہ سر محمد اقبال ان تمام واقعات کا جو اسلام کی وحدت ملی پر اثر انداز ہوتے ہیں محاسبہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک ان کے پرزور دلائل کے سیاسی پہلوؤں کا تعلق ہے آپ (ایڈیٹر سٹیٹس مین) نے بہت غیر جانبدارانہ طریق سے انہیں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کے اس مذہبی اختلاف پر جس کے مسلمانوں کی حیات ملی پر اثرات ہو سکتے ہیں مجھے مزید روشنی ڈالنے کی خواہش نہیں اور نہ ہی میں اس سیاسی گورکھ دھندے میں الجھنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد علمی ہے جس کا انحصار صرف دو اصولوں پر ہے۔ اول وہ مجوسی نظریہ جس کے ساتھ سر اقبال نے احمدیت کو وابستہ کیا ہے دوم بحیثیت ایک مذہبی محقق کے مجھے لنکا میں تحریک احمدیت کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اور ایک دفعہ ان کے جلسہ عام کی صدارت کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ایک غیر مسلم سے ان کا یہ رویہ مذہبی رواداری کا بہترین آئینہ دار ہے۔

مجوسی ثقافت آزادی کے طور پر دین زرتشت سے متعلق ہے۔ گو دونوں ایک نہیں۔ بعض کے خیال میں یہ تثلیث و یہودیت دونوں پر ساری و طاری ہے کیونکہ موخر الذکر ادیان کی نمایاں

خصوصیات مجوسی کلچر سے ہی ماخوذ ہیں۔ میں ایک مثال دے کر اسے اور واضح کر سکتا ہوں، دور حاضر کی مذہبی تحقیقات اسے مزید تقویت بخشتی ہے کہ دوزخ، بہشت، وحدت وجود اور جزا وسزا کا مرکزی تخیل یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا مشترکہ تخیل ہے اس کا سرچشمہ دین زرتشت ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حقیقت مختلف ادیان مذکورہ بالا کی عظمت میں سدراہ ہوسکتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی اشارہ کیا ہے کہ مجوسی تمدن کا انحصار نسلی خیالات پر تھا۔ حقیقت میں مجوسی قدیم آریاؤں ہی کی ایک شاخ ہیں اور اگران کا کلچر سمیٹک (Semitic) قوم پر اثر انداز ہوا تو اس کی وجہ مجوس کا عمیق روحانی تصوف ہے وہی مجوسی جو حکیمانِ مشرق کے نام سے مشہور ہیں اور جو بائبل کے توسط سے مذہبی دنیا سے متعارف ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شکایت کا لب لباب یہ ہے کہ قادیانیت کی بنیاد چونکہ مجوسی اصول پر استوار کی گئی ہے اس لئے یہ اتحاد ملت کے لئے زہر قاتل ہے۔ مزید برآں میں اور ثبوت دے سکتا ہوں کہ مسلم لٹریچر نے کہاں تک ایرانی اثر قبول کیا۔ روسی فاضل Inostrounger کی تحقیقات خاص طور پر واضح کرتی ہیں کہ ایرانی عنصر تاریخ اسلام میں خارجی اور داخلی طور پر بیش از بیش پایا جاتا ہے اور جہاں تک تحریک احمدیت کا تعلق ہے علامہ اقبال کی عدم رواداری کی حجت بہت ادق اور انسانی ادراک سے بالا ہے۔ اس میں تو مطلق شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس تحریک کا انحصار یقینی طور پر رسول عربی ﷺ اور قرآن مجید پر ہے اور ان لوگوں کو تو اس میں ذرا بھی کلام نہیں جن کو میری طرح احمدیت سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس تحریک کا ابتدائی مراحل میں غیر مسلموں سے تصادم ہوا اور حکومت کو ناگوار حالات کو رفع کرنے کے لئے اپنا اثر استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، یہ دلیل ہے احمدیوں کے جوشِ اسلامی کی، علی ہذا القیاس مسئلہ اجرائے نبوت جس کو علامہ اقبال نے اسلام کے لئے طوفان مصائب قرار دیا ہے، قادیان نے اس مسئلہ کی صداقت کو نصوص قرآنیہ کی روشنی میں واشگاف کر دیا ہے۔ اگر یہ جماعت اپنا پیغام سب مسلموں اور غیر مسلموں تک پہنچانے کی مدعی ہے تو بھی یہ مقصد سر اقبال کے اپنے ہی فریضے سے ہم آہنگ ہے کہ اسلام اقوام گیتی کو متحد کرنا

چاہتا ہے۔

ایک مذہب میں فروعی اختلافات کے بدنتائج کو سمجھنا سہل امر ہے جن کے بھیانک اثرات سے دنیا کا کوئی مذہب نہیں بچ سکا۔ احمدیت کے تاریخی وجود کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا امرِ دیگر ہے اس بارے میں سر محمد اقبال کے معروضے کو تسلیم کرنا روم کے وقار کی خاطر تاریخ انگلستان پر ریفارمیشن کے اثرات کو مسخ کرنے کے مترادف ہے ان چند سالوں میں سلسلہ احمدیہ نے جس روحانی اور جماعتی نشاۃ ثانیہ کا مظاہرہ کیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اس لیے نتیجتاً ایک صفا باطن انسان یہ امید کر سکتا ہے کہ ہندوستان کے پرستاران توحید احمدیوں کے اسلام کے اندر اور اسلام کی خاطر ایک نئی تحریک کے اجراء کی ضرورت پر صف ماتم نہیں بچھائیں گے بر عکس اس کے قادیان جیسی جماعت کی تاریخی زندگی کو کبھی اور کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا''۔(10)

علامہ اقبال نے اس مراسلہ کے جواب میں فرمایا۔

مجھے اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا ہے سوائے اس کے کہ مجھے ان کے مرکزی خیال سے پورا اتفاق ہے یعنی اسلام کی ظاہری اور باطنی تاریخ میں ایرانی عنصر کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ یہ ایرانی اثر اس قدر غالب رہا ہے کہ سپنگلر (SPENGLAR) نے اسلام پر موبدانہ رنگ دیکھ کر اسلام کو ہی ایک موبد مذہب سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب ''تشکیل نو'' میں کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے اس موبدانہ خول کو دور کر دوں اور مجھے امید ہے کہ اسی سلسلے میں میں اپنی کتاب ''قرآنی تعلیم کا مقدمہ'' میں مزید کام کر سکوں گا۔ موبدانہ تخیل اور مذہبی تجربہ مسلمانوں کی دینیات، فلسفہ اور تصوف کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں بہت سا مواد ایسا موجود ہے جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ تصوف کے چند اسکولوں نے جو اسلامی سمجھے جاتے ہیں اس موبدانہ حالات و واردات کو ہی زندہ کیا ہے میں موبد تمدن کو اسلامی تمدن کے بیشمار مظاہرات میں سے ایک مظاہرہ سمجھتا ہوں۔ میں نے اس لفظ کو برے معنی میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس بھی حکومت کا تصور تھا، فلسفیانہ مباحث تھے، حقائق بھی تھے اور غلطیاں بھی لیکن جب تمدن پر زوال آتا ہے۔ تو اس کے فلسفیانہ مباحث،

تصورات اور دینی واردات کے اشکال میں انجماد اور سکون آ جاتا ہے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو موبد تمدن پر یہی حالت طاری تھی۔ اور تمدنی تاریخ کو جس طرح میں سمجھتا ہوں اسلام نے اس تمدن کے خلاف احتجاج کیا، خود قرآن کے اندر شہادت موجود ہے کہ اسلام نہ محض ذہنی بلکہ مذہبی واردات کے لئے بھی نئی راہ پیدا کرنی چاہتا تھا لیکن ہماری مغانہ وراثت نے اسلام کی زندگی کو کچل ڈالا اور اس کی اصل روح اور مقاصد کو ابھرنے کا کبھی موقع نہ دیا۔(11)

علامہ اقبال کے بیان پر مسلم پریس کا ردعمل

اخبار 'سیاست' کا تبصرہ

علامہ اقبال کے قادیانیت کے بارے میں بیان پر ہندوستان کے مسلم پریس نے اداریے لکھے ۔غیر مسلم اخبارات و جرائد نے بھی اپنی آراء دیں۔ مسلم اخبارات نے ان کے نظریات اور مطالبات سے اتفاق کیا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے مطالبے کی تائید کی انہوں نے علامہ اقبال کی قادیانیت کے متعلق تنقید کو خراج تحسین پیش کیا لیکن اکادکا اخبارات نے چند دیگر سوالات بھی اٹھائے مثلاً اخبار سیاست لاہور نے 15-14 مئی 1935ء کی اشاعتوں میں دو اداریے تحریر کیے۔ اخبار کے مدیر سید حبیب 1933ء میں تحریک قادیان کے عنوان سے قادیانیت پر زبردست تنقید کر چکے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ قادیانیت کے خلاف مضامین لکھتے رہے۔ ان کے اداریوں کے چیدہ چیدہ نکات یہ ہیں:

- اگر مسیح اور مہدی کے عقیدے کے انکار پر مسلمانوں کا اتفاق رائے حاصل کر لیا جائے تو اس سے احمدیت کو سخت نقصان ہو گا۔
- علامہ اقبال نے حکومت پر مرزائیت نوازی کا الزام لگایا ہے لیکن مختلف مذہبی فرقے چکڑالوی اور مرزائی فرقے کے علاوہ ہندوستان اور انگریزی حکومت کے حلقہ اثر سے باہر پیدا ہوئے لہٰذا حکومت برطانیہ کی روش کو افتراق بین المسلمین کا سبب قرار دینا کچھ صحیح نظر نہیں آتا۔

- علامہ اقبال نے چودھری ظفراللہ کے وائسرائے کی ایگزیکٹوکونسل کے ممبر بننے کے بعد قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ کیوں کیا اس سے قبل مرزائیوں کے خلاف علم جہاد کیوں بلند نہ کیا۔
- امت مسلمہ میں جو انتشار رونما ہو چکا ہے وہ بحث یا مناظرہ سے نہیں مٹ سکتا۔ علامہ اقبال کو مجادلہ مقاطعہ کی بجائے بحث مباحثہ ترک کر کے سیاسی لحاظ سے متحد ہونے کا ذکر کرنا چاہئے تھا۔
- میں مدیر سیاست تحریک قادیان نامی کتاب میں لکھ چکا ہوں اور مرزا محمود نے مقدمہ گورداسپور میں بیان دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں لہٰذا مرزائی جماعت کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور میں اس معاملہ میں ان کا ہمنوا ہوں۔
- علامہ اقبال مختلف تمدنی، سیاسی، علمی اور معاشرتی مجالس میں قادیانیوں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے، مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں ظفراللہ کے ساتھ یکساں طور پر بطور مسلمان ممبر کام کرتے رہے اور انہوں نے اعتراض نہ کیا ظفراللہ کے مسلم لیگ کا صدر بننے پر اعتراض نہ کیا۔ علامہ اقبال لیگ اور کانفرنس کے صدر رہے لیکن انہوں نے اعتراض نہ کیا کہ قادیانی ان مجالس میں بطور مسلمان کیوں شامل ہوتے ہیں۔ قادیان سے ان جماعتوں کو مالی امداد ملی۔ پنجاب کونسل، سائمن کمیشن، اور گول میز کانفرنس میں ظفراللہ کو بطور مسلمان چنا گیا لیکن انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ ظفراللہ کے دوش بدوش کام کیا۔ ظفراللہ کے بھائی سیالکوٹ سے پنجاب کونسل کے رکن بنے، لیکن انہوں نے سیالکوٹ کے مسلمانوں کو یہ مشورہ نہ دیا کہ وہ ایک غیر مسلم کو ممبر منتخب نہ کریں۔ لندن میں ملک معظم کی سلور جوبلی کے موقع پر جو جماعت اس غرض کے لئے قائم ہوئی ہے کہ برطانیہ اور دنیائے اسلام سے تعلقات بہتر ہوں اس میں علامہ اقبال اور ظفراللہ دونوں بطور مسلمان شامل ہیں۔ کوئی غیر مسلم انگریز اس کا رکن نہیں ہو سکتا اس میں سر آغا خان، امیر عبداللہ والی شرق اردن، سابق ولی عہد ایران، نواب چھتاری، سر عبدالصمد خان، سر عبدالقادر وغیرہ شیعہ سنی آغا خانی سب موجود ہیں اس

لئے جس طرح عام مفاد ملت میں شیعہ سنی وغیرہ مل کر کام کرنے کو تیار ہیں اس طرح مرزائی اور غیر مرزائی مسلمان بھی اتحاد عمل پر آمادہ ہیں اور یہ وہ بات ہے جو ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان قبول کریں اور اپنا اصول عمل بنائیں۔

علامہ اقبال کی تکفیرِ مرزائیت سے اتفاق کے بعد میرا استدلال یہ ہے کہ نبوت کو توحید باری تعالیٰ سے بڑھایا نہیں جا سکتا اگر توحید رسالت سے بالا تر ہے تو علامہ اقبال خدائی کے دعویدار آغا خان کے ساتھ اتحاد عمل کرتے ہوئے کس طرح مرزائیوں سے اتحاد عمل کو ناروا قرار دے سکتے ہیں۔(12)

ہم گزشتہ صفحات میں بتا چکے ہیں کہ کسی غیر مسلم شخص یا جماعت سے قومی اور اسلامی مفاد کی خاطر سماجی و سیاسی اشتراک عمل یہ ثابت نہیں کرتا کہ ایسا شخص کوئی جرم کر رہا ہے یا وہ اس عقیدے اور مسلک کو درست تسلیم کر رہا ہے۔ یہ وسیع تر قومی مفاد کا تقاضا ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نیرنگی سیاست دوران سے خوب آشنا تھے وہ کسی بھی غیر مسلم ہندو وسکھ کے ساتھ کسی مذہبی بحث وتکرار کے قائل نہ تھے شائستگی کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انہوں نے ملت کی فلاح کے لئے کئی کام کئے۔ انہوں نے بلا وجہ اور بے مقصد کسی کی مخالفت نہ کی بلکہ قادیانیوں نے جب کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران اپنا حقیقی چہرہ دکھایا تو پھر بھی انہوں نے کافی صبر وتحمل اور سوچ بچار کے بعد قادیانیت کے مضمرات سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اپنا فرض منصبی جانا۔

سید حبیب کا اعتراض یہ ہے کہ علامہ اقبال نے ظفر اللہ کے پنجاب کونسل، سائمن کمیشن اور پہلی بار وائسرائے کونسل کے ممبر بننے پر یہ اعتراض کیوں نہ کیا کہ سر ظفر اللہ غیر مسلم ہیں ان کو مسلمانوں کی سیٹ نہ دی جائے، اسی طرح مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں قادیانیوں کی بطور مسلمان رکنیت پر آواز نہ اٹھائی اور گول میز کانفرنس میں ان کے بطور مسلمان نمائندہ شمولیت پر کچھ نہ کہا بلکہ ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔

شاید سید صاحب کو معلوم نہیں کہ 1917ء کے وائسرائے مانٹیگو کے ذمہ دار حکومت کے قیام کے اعلان کے بعد 1919ء کے ایکٹ سے لے کر 1935ء کے ایکٹ تک مسلمان اپنے سیاسی

حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے اور اپنے مطالبات منوانے کے لئے کانگریس اور انگریز سے برسر پیکار تھے انگریز نے جس طرز حکومت اور اقتدار کی منتقلی کے آئینی ڈھانچہ کی نیو اٹھائی تھی اس کی حدود قیود کے اندر ہی جدوجہد کی جا سکتی تھی۔ قادیانیوں کی پالیسی یہ تھی کہ وہ مسلمان بن کر مسلمانوں کے سیاسی حقوق پر ڈاکہ ڈالیں اور ان میں حصہ دار بن جائیں۔ مسلمانوں کے کوٹے پر قادیانیوں کو تعینات کرائیں اور مسلمانوں کی سیاسی انجمنوں میں شامل ہو کر اپنے جماعتی مفادات کا تحفظ کریں۔ سر ظفر اللہ انگریز کی مدد اور سر فضل حسین کی اعانت سے مسلمان کہلوا کر ہی اس جدوجہد میں اپنا کردار ادا کر سکتے تھے۔ سردار سنگھ یا گوپی چند بن کر نہیں کر سکتے تھے۔ ایڈیٹر سیاست اس عہد کے سیاسی حالات اور مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کو سامنے رکھتے تو یہ سوال نہ اٹھاتے کہ علامہ اقبال نے اس زمانے میں قادیانیوں کے خلاف کیوں آواز نہ اٹھائی کیا سید صاحب یہ توقع رکھتے تھے کہ علامہ اقبال ظفر اللہ کو صداقت مسیح موعود اور ختم نبوت پر مناظرے کے چیلنج دیتے لیکن ان جیسے سیاسی مدبر اور تعلیم یافتہ شخص سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ بے وقت اور بلا مقصد کسی فرقے پر تنقید کرتے انہوں نے ہمیشہ قومی اور ملی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا اور اسی مقصد کے لئے نہ صرف قادیانیوں بلکہ دیگر غیر مسلموں سے مناسب حد تک اشتراک عمل میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ پنجاب کونسل، سائمن کمیشن اور گول میز کانفرنسوں میں ظفر اللہ کی شمولیت، انگریز کی پالیسی اور سر فضل حسین کی معاونت کا نتیجہ تھی وہ یونینسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ علامہ اقبال کا اس میں نہ تو کوئی دخل تھا اور نہ ہی ان کا مذہبی بنیادوں پر دیا گیا کوئی بیان ظفر اللہ کی حیثیت پر اثر انداز ہو سکتا تھا جب کہ پورے ہندوستان کے مسلمان ان کو کافر اور غیر مسلم قرار دے رہے تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی خاطر دیگر مسلمان رہنماؤں کی طرح علامہ اقبال نے جو جدوجہد کی وہ قابل داد ہے وہ اخلاص پر مبنی تھی انہوں نے مسلم مطالبات کو منوانے کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا اگر وہ قادیان جا کر صدر انجمن احمدیہ یا قادیانی مجلس مشاورت میں ظفر اللہ کے ساتھ بیٹھ کر معاملات سلجھاتے تو ہمیں ضرور اعتراض ہوتا۔

سر فضل حسین اور انگریز کو ظفر اللہ کے قادیانی ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا وہ ان سے اپنا کام لیتا

تھا۔ نہ ہی قادیانیوں کے کفر سے اس کو سروکار تھا اس کے سامنے اپنا مفاد تھا وہ وفادار عناصر سے تعاون کرتا تھا۔ یہ خطرہ تو مسلمانوں کو درپیش تھا کہ قادیانی مسلمان بن کر ان کی نیابت کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال ایسے مواقع پر کوئی بیان جاری کرتے تو وہ ملی مفاد کے خلاف ہوتا وہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے اور وسیع النظر تھے۔ فضول بحث و مناظرے کے عادی نہ تھے۔ ان سے یہ توقع نہ کی جاسکتی تھی کہ وہ آئینی جدوجہد کا رخ قادیانی مسئلہ کی طرف موڑ کر ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیتے۔ مناسب سیاسی فضا میں انہوں نے اپنے بیان میں قادیانیت کے دینی اور سیاسی پہلو کو اجاگر کر کے ان خطرات کی نشاندہی کی جو نئے سیاسی تقاضوں کے تحت قادیانیوں سے مسلمانان ہند کو درپیش ہو سکتے تھے۔ انہیں سر ظفر اللہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی بلکہ وہ ان کا گورنمنٹ کالج لاہور میں شاگرد رہ چکا تھا دونوں سیالکوٹ سے تعلق رکھتے تھے دونوں بار ایٹ لا اور وکیل تھے معاشرتی سطح پر ان کے ہندوؤں اور سکھوں کی طرح قادیانیوں سے بھی خاص حد تک تعلقات تھے۔ بلکہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد قادیانی تھے اور ان میں اور ان کے بیٹے اعجاز احمد میں جو خوبیاں تھیں ان کے وہ معترف تھے۔ انہوں نے کشمیر کمیٹی کی صدارت کے دوران قادیانیت کا حقیقی چہرہ دیکھ لیا تو پھر انہوں نے مسلمانوں کو اس خطرے کے حقیقی مضمرات سے آگاہ کیا انہوں نے بلا ضرورت، بے وقت اور بلا مقصد کوئی کام نہ کیا جو نہ تو نتیجہ خیز ہوسکتا تھا اور نہ ہی مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کا ضامن! دراصل وہ مسلمانان پنجاب کو قادیانی۔ یونینسٹ گٹھ جوڑ اور نئے سیاسی تقاضوں خصوصاً ایکٹ آف 1935ء کے بعد صوبائی خود مختاری جیسے مسائل کے حل کے لئے تیار کر رہے تھے۔ ان کی نظر مسلم پنجاب اور ابھرتی ہوئی مسلم لیگ کے استحکام اور تنظیم نو کی طرف تھی۔ اس لئے سید حبیب کے یہ اعترض اس عہد کے ٹھوس حقائق، علامہ اقبال کے شائستہ طرز عمل اور مستقبل کے پنجاب اور ہندوستان میں ابھرنے والے سیاسی تقاضوں کی روشنی میں مسترد کرنے کے قابل ہیں۔

روزنامہ حق لکھنو کا اداریہ

'تاریخ احمدیت' میں یوپی کے ایک غیر معروف اخبار حق لکھنو کے 27 جون 1935ء کے

ادار یہ کو نقل کیا گیا ہے اس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے شعر میں کہا ہے

فرقہ بندی ہے اور کہیں ذاتیں ہیں　　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

- فرقہ بندی اور ذات پات کے امتیاز سے اجتناب کے باوجود انہوں نے سیاسی مشورہ دیا ہے کہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھیں اور حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ قانونی حیثیت سے بھی احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھے۔
- ہم ڈاکٹر سر محمد اقبال سے اتفاق کرتے ہیں کہ عام مسلمانوں اور احمدیوں میں اعتقادات کا بہت بڑا اختلاف ہے جس کے باعث ان میں اتحاد عمل ناممکن سا نظر آتا ہے لیکن مختلف فرقے بھی ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں اس لئے ہر کلمہ گو کو مسلمان سمجھا جائے اس طرح احمدیوں کو بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا جب کوئی خود اپنے آپ کو مسلمان کہے تو ہم اسے کیونکر مسلمان نہ سمجھیں؟
- موجودہ سیاسی حالت میں ہر جماعت اپنی شیرازہ بندی، تنظیم اور تحفظ کی فکر میں ہمہ تن مصروف ہے ہندو اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں اگرچہ وہ ان کے بغیر اکثریت میں ہیں وہ ڈرتے ہیں کہ ان کو مسلمان یا کوئی اور اقلیت اپنے ساتھ ملا کر اکثریت نہ بن جائے۔ احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی تحریک سیاسی اعتبار سے ناسمجھی، ناعاقبت اندیشی اور تدبر کے منافی ہے ان کو مسلمانوں سے علیحدہ نہ کرنے میں فائدہ ہے۔
- احمدیوں کو الگ نہ کر کے ہم اپنی مرضی کے لوگ مجالس قانون ساز میں منتخب ہونے دیں گے یا نہ ہونے دیں گے۔ لیکن ان کو الگ کرنے سے ان کی نشستیں علیحدہ ہو جائیں گی اور وہ ان مجالس قانون ساز میں بلا روک ٹوک جا سکیں گے۔ پنجاب میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ 56 فی صد ہیں اگر دس فیصد احمدیوں کو نکال دیا جائے تو وہ 46 فی صد رہ جائیں گے اور سکھ، ہندو اور احمدی مل کر اکثریت ہو جائیں گے۔ حکومت نے جدید اصلاحات کے تحت مسلمانوں

کے لئے 51 نشستیں رکھی ہیں ان میں سے دو نشستیں احمدیوں کو ضرور مل جائیں گی۔ اور کسی نہ کسی وقت ان کی جماعت کے رکن کا وزیر ہو جانا بھی بعید از امکان نہیں اس لئے احمدی فائدہ میں رہیں گے اور مسلمانوں کو نقصان ہوگا احمدیوں سے مذہبی طور پر اتحاد عمل ناممکن ہے لیکن سیاسی طور پر ان سے تعلقات رہ سکتے ہیں۔ (13)

روز نامہ حق نے ایک تو مسلمانوں کی باہمی روش تکفیر کا سہارا لیا ہے حالانکہ یہ فروعی اختلافات پر مبنی ہے جب کہ مسلمانوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا مرزا غلام احمد کی وحیِ نبوت کی بنیاد پر ہے اور یہ بنیادی فرق ہے۔ اچھوت یا دلت آج بھی ہندوستانی معاشرے کا حصہ نہیں بن سکے۔ ڈاکٹر امبید کار کی شخصیت اور تحریرات اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کے انتہائی تعصب کی بناء پر بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ مہاتما گاندھی بھنگی کالونی دہلی جا کر اچھوتوں کے ساتھ مل بیٹھتے رہے لیکن کیا اچھوتوں نے انہیں اپنا رہنما مانا۔ ہندو جہاں ضرورت پڑتی اچھوتوں کو ساتھ ملا کر اپنی اکثریت ظاہر کرتے اور جب ضرورت ختم ہو جاتی پھر اپنے موقف سے پھر جاتے۔ اگر روز نامہ حق کی دلیل مان بھی لی جائے تو پنجاب کی حد تک بھی قادیانیوں کی ایک یا دو نشستوں کا تحفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان کی تعداد 1921ء کی مردم شماری کے مطابق محض 56 ہزار تھی اور ووٹ کے اہل افراد اس سے بھی کم تھے اس کے علاوہ مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا دائرہ پنجاب تک نہیں پورے ہندوستان پر محیط تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا ان سے سیاسی اتحاد عمل کا سوال ہے تو 1936ء میں قادیانی کھلم کھلا کانگرس کے ہمنوا بن گئے وہ مسلم لیگ کی مخالفت کرتے رہے۔ پنجاب میں وہ جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفاد کے لئے کوشاں یونینسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا اور دست بازو تھے۔ 1940ء سے 1947ء تک وہ مطالبہ پاکستان کے خلاف اور اکھنڈ (متحدہ) بھارت کے حامی تھے۔ 46-1945ء کے انتخابات میں انہوں نے یونینسٹ، آزاد زمیندارہ لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ انتخابی تعاون کیا، ساتھ ساتھ مسلم لیگ سے تعاون کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے۔ (14) اور آخر وقت تک پاکستان کے مخالف رہے ایسی جماعت جس کے عمومی مقاصد اور سیاسی

اغراض اس کے جماعتی اور گروہی مفادات کے تابع ہوں وہ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کی تکمیل میں ان کا ساتھ کیسے دے سکتی ہے۔؟ 1974ء میں غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مسلمان اور دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اور اپنی مخصوص مذہبی روش اور سیاسی پالیسی پر کاربند ہیں.

یوں تو علامہ اقبال کے بیان کے حق میں تمام مسلم پریس تبصرے اور اداریے شائع کر رہا تھا۔ لیکن سر مرزا ظفر علی ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ لاہور نے قادیانیوں کے خلاف بعض اہم مضامین لکھے۔ 22اگست 1935ء کو ان کا ایسٹرن ٹائمز لاہور میں ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں انہوں نے احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کے دلائل دیئے۔ ان کا کہنا تھا۔

1۔ قادیانیوں نے خود اپنا الگ تشخص (مذہب) مقرر کیا ہے۔

2۔ مخالفت احمدیوں اوراحراریوں کے مابین محدود نہیں بلکہ احمدیوں اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک عرصے سے جاری ہے جس کی ذمہ داری تمام تر احمدیوں پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے عقائد اسلام کے خلاف اور اشتعال انگیز ہیں۔

3۔ مرزا صاحب نے مسلمانوں کو گالیاں دیں، بد ذات فرقہ مولویں کے الفاظ استعمال کئے۔ حضرت عیسیٰ کی شان میں گستاخیاں کیں اور دیگر انبیاء کی ہتک کی۔ قادیانیوں کے منفی کردار اور ان کے اسلام دشمن عقائد کی بنا پر مرزا ظفر علی کا استدلال تھا کہ انہیں مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے(15) اس مطالبے کی مزید تائید مشہور مترجم قرآن علامہ عبداللہ یوسف علی نے ذاتی سطح پر کی اور کے۔ایل گابا نے اسمبلی میں آواز اٹھائی۔

علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی ردعمل

علامہ اقبال کے بیان پر مجموعی قادیانی ردعمل پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم مرزا محمود کے ایک خطبے کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ احمدیت کی مخالفت کا کس طرح

تدریجی ارتقاء ہوا اور کون کون سے لوگ اس میں شامل ہوتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے کے تمام طبقات قادیانیت کی کسی نہ کسی رنگ میں مخالفت کرتے چلے آرہے تھے اور اس کو مسلمانوں اور اسلام کے لئے ایک مذہبی اور سیاسی خطرہ سمجھتے تھے۔

قادیانیت کی مخالفت کا تدریجی ارتقا

مرزا محمود احمد فرماتے ہیں:

احمدیت کی مخالفت میں پہلے احراری تھے پھر احرار کی جماعت میں امراء ذاتی بغض و عناد نکالنے اور ذاتی فوائد حاصل کرنے کے لئے شامل ہوئے پھر پیروں، گدی نشینوں اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت ان کے اندر شامل ہوگئی انہوں نے اس جنگ کو اخباروں اور تقریروں کے ذریعے ایسے گوشوں اور کونوں میں پہنچانا شروع کیا جہاں تک اس کا پہنچنا پہلے محال نظر آتا تھا۔ پھر منافقین کی جماعت شامل ہوگئی۔ جمیعتہ العلمائے ہند اس وقت تک خاموش تھی کیونکہ اس کے لیڈروں کو احراریوں کے سرکردہ لوگوں سے بغض و عناد ہے مگر جب اس نے دیکھا کہ یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرتا جاتا ہے اور مسلمانوں کی ایک خاص تعداد کی توجہ اس طرف ہے تو یہ خیال کر کے کہ ایسا نہ ہو جماعت احمدیہ کو کچلنے کا سہرا احراریوں کے سر ہے اس نے بھی اعلان کر دیا کہ مسلمانان عالم کے سامنے اس وقت سب سے بڑا فتنہ جماعت احمدیہ ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کا استیصال کریں۔ جب اس زور و شور سے اخبارات نے جماعت احمدیہ کا مقابلہ ہوتے دیکھا تو ان میں سے آریہ سماج کے اخبارات بھلا کہاں خاموش رہ سکتے تھے وہ بھی اٹھے اور ہماری جماعت کی مخالفت میں لگ گئے۔ قادیان کے آریہ اور سکھ بھی ان میں شامل ہوگئے۔

ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کا مقصد یہ رہا تھا کہ ہمیں فتنہ فساد اور آپس کے تفرقے سے بچنا چاہئے اسی طرح اعلیٰ عہدیدار خاموش تھے یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا یہ طوفان مخالفت سرد ہونے میں نہیں آتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو انہوں نے کہا ہم پیچھے کیوں رہیں اس خیال کا آنا تھا کہ سر مرزا ظفر علی صاحب نے ایک

بیان شائع کر دیا پھر ڈاکٹر سر اقبال کو خیال آ گیا کہ میں کیوں پیچھے رہوں اور اب آخر (1935)ء میں علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب جو ہمیشہ ان باتوں سے الگ رہتے تھے بول اٹھے اور سمجھا کہ اسلامیہ کالج کا پرنسپل ایسی باتوں میں کیوں دخل نہ دے اور کس لئے جماعت احمدیہ کے خلاف اپنی رائے کا اظہار نہ کرے اور پھر اس موقعہ سے عیسائیوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ بھی ہمارے مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔(16)

علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی اور لاہوری جماعت کی تنقید

علامہ اقبال کی ذات اور ان کے مضامین کے خلاف الفضل قادیان، ریویو اور لاہور جماعت کے پیغام صلح، لائٹ وغیرہ نے بہت کچھ لکھا اور مسلسل لکھتے رہے۔ ان کو یہ بنیادی مسئلہ درپیش تھا کہ علامہ اقبال کے حقیقت پسندانہ دلائل کا کیا جواب دیا جائے۔ علامہ اقبال نے ان کی دکھتی رگ کو چھیڑا تھا۔ انہوں نے اپنے دلائل کی بنیاد ٹھوس حقائق اور قادیانیوں کے مسلمہ معتقدات پر اٹھائی تھی۔ اگر یہ کوئی مذہبی بحث ہوتی، مرزا صاحب کی صداقت ثابت کرنے کا سوال ہوتا یا محمدی بیگم سے نکاح کی پیش گوئی کے پورا ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ہوتا تو قادیان کے تنخواہ دار مبلغ دلائل اور تاویلات کے انبار لگا دیتے لیکن یہاں سوال مختلف تھا مرزا محمود گذشتہ 20 سالوں (1915-1935)ء سے خود مرز اصاحب کی نبوت، ان کی نبوت تسلیم نہ کرنے والے عامتہ المسلمین کی تکفیر، ان کی معاشرتی علیحدگی اور ایسے دیگر اسلام مخالف رویوں کا اظہار کر رہے تھے۔ ان مسلمہ عقائد کے مضمرات نہ ماننے کا کوئی جواز نہ تھا انہیں کو سامنے رکھ کر علامہ اقبال نے مسلم معاشرے میں ختم نبوت کی تمدنی اہمیت اور ہندوستان میں اسلامی اقدار کے تحفظ کی ضرورت بیان کی انہوں نے ایسے ناقابل تردید حقائق پیش کئے جن سے نہ تو انکار ممکن تھا نہ فرار اس لئے قادیانی جماعت علامہ اقبال کے دلائل کے مقابلے میں روایتی مذہبی مباحث اور غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے مطالبے کے سیاسی عواقب وعواقل پر زور دیتی رہی اور یہ تبصرے اس زمانے کے سیاسی حالات کی روشنی میں کئے گئے جواب قصہ پارینہ ہیں۔ جہاں تک لاہوری جماعت کا تعلق تھا وہ

ختم نبوت کے قائل ہونے کی دعویدار تھی اور تکفیر مسلمین سے انکار کرتی تھی اس لئے وہ براہ راست اس زد میں نہ آتے تھے۔ مجدد اور مسیح موعود جیسے عقائد میں ان کے لئے میدان موجود تھا لیکن علامہ اقبال کے مضمون کا مرکزی نقطہ عقیدہ ختم نبوت تھا۔ علامہ اقبال کی مخاطب دراصل قادیان جماعت تھی۔ چونکہ انہوں نے مرزا صاحب کے نفسیاتی تجزیے کی بات کی تھی اور ان کو مذہبی سٹے باز کہا تھا، اس لئے لاہوری بھی اس بحث میں کود پڑے اور قادیانیوں کی گذشتہ 20 سالہ مخالفت کو بھلا کر ان کے ہمنوا بن بیٹھے۔ ہم نے 1935ء کے بعد شائع ہونے والے قادیانی تبصروں میں سے صرف ان کا انتخاب کیا ہے جن میں کوئی قابل غور بات ہے یا مرزا محمود کے خطبہ اور مضمون کو ان کی اہمیت کے باعث زیر بحث لائے ہیں ورنہ الفضل کی فائلوں میں لایعنی دلائل اور رطب ویابس کی کمی نہیں!

مرزا محمود احمد کا خطبہ 24 مئی 1935ء

قادیانی جماعت کے خلیفہ مرزا محمود احمد نے 24 مئی 1935ء کا پورا خطبہ جمعہ علامہ اقبال کی مخالفت کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

1- علامہ اقبال نے انہیں کشمیر کمیٹی کا صدر کیوں مقرر کیا جو اسلامی کمیٹی تھی۔ انہوں نے کیوں 1931ء میں احمدیوں کو مسلمان سمجھا اور اب ان کو کیوں محسوس ہوا کہ احمدیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دینا چاہئے۔

2- انہیں تعجب ہے کہ علامہ اقبال جیسے مسلمانوں کی ایک جماعت کے لیڈر، فلاسفر، شاعر نے جو نہایت عقل مند انسان ہیں انگریزی حکومت پر یہ اعتراض کیوں کیا کہ اس نے احمدیوں کو کیوں پنپنے دیا شروع ہی میں اس تحریک کو کیوں نہ کچل دیا۔ برطانوی حکومت سے رومی حکومت زیادہ عقلمند تھی کہ انہوں نے مسیح ناصری کو صلیب پر لٹکایا۔ انگریزوں نے اتنی جرات بھی نہ دکھائی اور بناوٹی طور پر بھی حضرت مرزا صاحب کو سزا نہ دی۔

3- مسلمانوں کا ایک طبقہ ہماری دشمنی میں بہت بڑھ گیا ہے لیکن وہ جماعت احمدیہ کو ذرہ بھر بھی

نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔(17)

مرزا محمود احمد کا مضمون 8 جولائی 1935ء

مرزا محمود احمد نے 'ڈاکٹر سر محمد اقبال اور احمدیہ جماعت' کے عنوان سے ایک مضمون الفضل 8 جولائی 1935ء کی اشاعت میں شائع کرایا۔ اس کو 18 جولائی 1935ء کو ایک ٹریکٹ کی صورت میں جاری کیا گیا۔ فرماتے ہیں۔

- پہلے علامہ اقبال جماعت احمدیہ سے تعلق، موانست اور مواخات رکھنا برا نہیں سمجھتے تھے۔ 1911ء میں فرقہ قادیانی کو پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ کہتے تھے۔ اب 1935ء میں احمدیت کو بہائیت سے بھی بدتر کہتے ہیں۔ وہ بہائیت جو قرآن کو منسوخ اور بہاءاللہ کو ظہور الٰہی کہتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کو فضیلت دیتی ہے۔ گویا ڈاکٹر اقبال کے نزدیک اگر ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو منسوخ قرار دیتا قرآن کریم سے بڑھ کر تعلیم لانے کا مدعی ہوتا نمازوں کو تبدیل کر دیتا اور قبلہ کو بدل دیتا ہے اور نیا حکم بناتا ہے اور اپنے لئے خدائی کا دعویٰ کرتا ہے حتیٰ کہ اس کی قبر پر سجدہ کیا جاتا ہے تو بھی اس کا وجود برا نہیں مگر جو شخص رسول کریم ﷺ کو خاتم النبیین قرار دیتا، آپ کی تعلیم کو آخری تعلیم بتاتا قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت کو آخر تک خدا تعالیٰ کی حفاظت میں سمجھتا ہے، اسلامی تعلیم کے ہر حکم پر عمل کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے اور آئندہ کے لئے سب روحانی ترقیات کو رسول کریم ﷺ کی فرمانبرداری اور غلامی میں محصور سمجھتا ہے وہ برا اور بائیکاٹ کرنے کے قابل ہے۔ احمدی سر محمد اقبال اور ان کے ہمنواؤں کو روحانی بیمار قرار دے کر انہیں اپنے علاج کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور ان کے ایمان کی کمزوریوں کو ان پر ظاہر کرتے ہیں۔
- سر اقبال صاحب اس عذر کی پناہ نہیں لے سکتے کہ بہائی منافق نہیں احمدی منافق ہیں۔ بہائی کھلے بندوں اپنے مذہب کی تلقین نہیں کرتے، اپنی کتب چھپاتے ہیں اور ہر ملک میں الگ

الگ عقائد پیش کرتے ہیں لیکن احمدی ایسا نہیں کرتے سر محمد اقبال کو یہ بات معلوم ہے ان کے والد مرحوم احمدی تھے ان کے بڑے بھائی عطا محمد احمدی ہیں ان کے اکلوتے بھتیجے اعجاز احمد سب جج احمدی ہیں ان کے خاندان کے کئی افراد احمدی ہیں۔ اس اعلان کے شائع کرتے وقت وہ (عطاء محمد) ان کی کوٹھی تعمیر کرا رہے ہیں۔ کیا سر محمد اقبال صاحب نے ان کی رہائش کے ایام میں انہیں منافق پایا تھا یا خود اپنی زندگی سے زیادہ پاک زندگی ان کی پائی تھی ان کے سگے بھتیجے شیخ اعجاز احمد ایسے نیک نوجوان ہیں کہ اگر سر اقبال غور کریں تو یقیناً انہیں ماننا پڑے گا کہ ان کی اپنی جوانی اس نوجوان کی زندگی سے سینکڑوں سبق لے سکتی ہے۔

مسلمان سوچیں کہ ایک شخص جو اپنے احمدی بھائی کو بلوا کر اس سے کوٹھی بنواتا ہے دوسرے مسلمانوں کو ان کے بائیکاٹ کی تعلیم دیتا ہے کہاں تک لوگوں کے لئے رہنما بن سکتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو رسول کریمؐ کی ذات پر کھلا حملہ کرنے والے کو اچھا قرار دیتا ہے کہاں تک مسلمانوں کا خیر خواہ قرار دیا جا سکتا ہے۔(18)

مرزا محمود کے خطبے اور مضمون میں علامہ اقبال کے بیانات کی بنیادی حقیقتوں اور ان کے دلائل کو چھیڑا تک نہیں گیا۔ نہ ہی ایسی واضح دلیل پیش کی گئی ہے جس سے علامہ اقبال کے قادیانیت کے بارے میں نظریات اور ان کا غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ غلط قرار دیا جائے۔ یہ خطبہ اور مضمون عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثالیں ہیں۔ لاہوری احمدی کئی سال سے اپنی تحریروں میں یہ الزام لگاتے چلے آ رہے ہیں کہ قادیانیوں کے موجودہ عقائد نبوت، تکفیر وغیرہ اسلام کے سخت خلاف ہیں اور قادیانیوں کو ان عقائد کی بناء پر بہائیوں کی طرح یا تو اسلام اور مسلمانوں سے بالکل الگ ہونا پڑے گا یا عقائد میں توازن، معقولیت اور اصلاح پیدا کر کے ان میں ایک فرقہ کے طور پر شامل ہونا پڑے گا۔ (19) لیکن وہ اپنے اعتقادات پر قائم ہیں اور اسلام کی شکست و ریخت کر کے مسلمانوں کے اندر سے ایک الگ امت تشکیل دے رہے ہیں دینی ارتداد کا زہر پھیلانے کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی طور پر مسلمانوں کی بیخ کنی اور یورپ کے باطل عزائم کی تکمیل میں اپنی ترقی

اور بقا کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

امیر جماعت احمدیہ لاہور کا جواب 1935ء

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور نے ایک پمفلٹ میں علامہ اقبال کے بیان کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

- سر محمد اقبال نے درست کہا ہے کہ امت مسلمہ کا اتحاد عقیدہ ختم نبوت پر مبنی ہے۔ اجرائے نبوت کا عقیدہ حضرت محمد ﷺ کے مشن کی عالمگیر حیثیت کے منافی ہے۔ قادیانیوں سے ان کی جماعت کا نبوت اور اس کے متعلقہ مسائل پر اختلاف ہے۔
- اسلام سے قبل انبیاء کی پے در پے آمد کا عقیدہ مجوسیت کی پیداوار نہیں، یہود مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔
- اس بحث میں پڑے بغیر کہ مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا یا نہ کیا میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میں اکتوبر 1934ء میں ڈاکٹر اقبال کی عیادت کو گیا۔ ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ وہ اور سر فضل حسین 1904ء میں مرزا صاحب سے ملے تھے۔ مرزا صاحب نے سر فضل حسین کے سوال پر کیا وہ اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں، نفی میں جواب دیا تھا۔ (20)
- مرزا صاحب کا غیر احمدیوں کے جنازے پڑھنے کے متعلق بھی یہ موقف تھا۔ (21)
- اگر ختم نبوت کے تحت کوئی نیا نبی نہیں آسکتا تو پرانا نبی (مسیح ناصری) بھی نہیں آسکتا یہی جماعت لاہور کا عقیدہ ہے۔
- آمد مسیح، دجال اور یاجوج ماجوج کے بارے میں مستند احادیث کا انکار ممکن نہیں۔ مرزا صاحب نے مسیح ناصری کے مثیل ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہود مسیح کی آمد سے پہلے ایلیاہ (الیاس) کی آمد کے منتظر تھے۔ مسیح نے بتایا کہ یوحنا (یحییٰ علیہ سلام) ایلیاہ ہے۔ (22) ایسا شخص مجدد اور محدث ہوتا ہے اس کو استعارے کے طور پر نبی کہتے ہیں اس کا الہام خدا کا حکم نہیں ہوتا۔
- حدیثِ بخاری میں ہے جو تمہاری طرح نماز پڑھے، تمہارے قبلہ کی طرف منہ کرے، تمہارا

ذبیحہ کھا لے وہ مسلمان ہے۔ احمدی (چاہے ان کا مرکز قادیان ہو یا لاہور) ایسا ہی کرتے ہیں اس لئے ان کو کافر نہیں کہا جا سکتا، ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ (23)

- علامہ اقبال نے واضح طور پر لاہور جماعت کو کافر نہیں کہا لیکن وہ دونوں کو مٹانے کے حق میں ہیں۔
- سر محمد اقبال نے مسلمانوں اور قادیانیوں کے اختلافات میں حکومت کو مداخلت کی دعوت دی ہے۔ کیا ان کا خیال ہے حکومت ہر مذہب کے کفر کے متعلق قوانین بنائے ایسا قانون مسلمان چاہے بنوالیں کیونکہ وہ رواداری کے قائل نہیں۔ حکومت علماء کے شغل تکفیر کے باعث منتشر مسلمانوں کو متحد نہیں کر سکتی نہ یہ موجودہ دور میں ممکن ہے۔
- سر محمد اقبال نے رواداری کی تلقین کی ہے لیکن مسلمانوں نے احمدیوں کو سب وشتم کا نشانہ بنایا ان کا بائیکاٹ کیا اور ان پر ظلم کیا۔ تعداد کے لحاظ سے ہر ہزار مسلمانوں میں ایک شخص احمدی ہے۔
- اسلام میں رواداری اور غیر مسلموں کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ سر محمد اقبال حضرت مسیح اور منصور کو سولی چڑھانے کو درست سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں قادیان کے ولی (مرزا صاحب) کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا لیکن انہوں نے اس مختصر جماعت کے پیروکاروں کو ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ بھی کہا تھا۔
- پہلے بیان میں انہوں نے حکومت سے احمدیوں کو کچلنے کا مطالبہ کیا پھر غور کیا اور کہا انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
- ایک وقت کے کافر آئندہ کے ولی تسلیم کئے گئے جیسے شیخ احمد سرہندیؒ تھے۔ ممکن ہے مرزا غلام احمد جنہوں نے اشاعت اسلام کے لئے ایک تحریک کی بنیاد رکھی آئندہ کسی زمانے میں ولی مان لئے جائیں۔

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور یہ بات تو تسلیم کرتے ہیں کہ ختم نبوت کا منکر کافر ہے اور

قادیانی اجرائے نبوت اور تکفیرِ مسلمین کے مجرم ہیں لیکن اس کے ساتھ قادیانیوں کو کافر قرار نہ دینے کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ (24) یہی بات قادیانی کرتے ہیں وہ لاہوریوں کی سخت ترین مخالفت کے باوجود ان کو اس طرح کافر قرار نہیں دیتے جیسے وہ باقی مسلمانوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج کہتے ہیں۔

اس پمفلٹ میں علامہ اقبال کے بنیادی دلائل کا کوئی جواب نہیں، روائتی قادیانی دلائل اور جماعتی موقف کو بیان کیا گیا ہے۔ کیا لاہور جماعت کا یہ موقف مرزا صاحب کے الہامات اور قادیانی جماعت کے اس کے رد میں شائع شدہ لٹریچر کے بعد تسلیم کیا جا سکتا ہے اسی لئے مسلمانوں نے ان کو اپنے قریب آنے کا موقع نہ دیا اور یہ بھی آخر کار غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی زد میں آ گئے۔ یہ قادیانیوں اور مسلمانوں دونوں کو اپنی تاویلات باطلہ سے دھوکہ دیتے ہیں اور خود بھی فریب خوردہ ہیں۔

لاہور جماعت کے ترجمان اخبار لائٹ لاہور کے ایڈیٹر مولوی محمد یعقوب خان کا بیان ہے کہ ان کی سید نذیر نیازی سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مرزا صاحب نے اُن پر ایمان نہ لانے والوں کو کافر نہیں کہا اس کے علاوہ علامہ نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا جو بیان اخبارات میں چھپا ہے اس کا جماعت لاہور کی طرف روئے سخن نہیں تھا، نہ ہی مرزا صاحب کے معتقدات پر تبصرہ منظور تھا۔ ایڈیٹر لائٹ کہتے ہیں کہ اس سے قبل ان کے معزز دوست راجہ حسن اختر صاحب نے بھی یہی فرمایا کہ اقبال نے کہا ہے کہ ان کے بیان کا جماعت لاہور سے تعلق نہیں اور نہ ہی مرزا صاحب کی شخصیت سے ہے بلکہ ان کے سامنے وہ احمدیت ہے جس کا نقشہ آج کل (1935)ء قادیانیت کی شکل میں دنیا میں پیش ہو رہا ہے۔(25)

مولوی محمد یعقوب خان ایک طویل عرصے تک لائٹ لاہور کے مدیر رہے۔ 36-1935ء میں جب علامہ اقبال کے قادیانیوں کے متعلق بیانات شائع ہوئے تو انہوں نے ان پر کئی اعتراضات کئے اور لاہوری جماعت کے عقیدے کا دفاع کرنے میں پیش پیش رہے۔ زندگی کے آخر سالوں میں انہوں نے مرزا ناصر احمد قادیانی خلیفہ سوم کی بیعت کر لی اور لاہور جماعت سے الگ ہو گئے۔

اس زمانے میں لاہور جماعت نے بعض پمفلٹ شائع کئے اور ان پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی کہ انہوں نے قادیانی عقیدہ اپنا لیا جس کے خلاف وہ مسلسل لکھتے رہے تھے۔ علامہ اقبال نے قادیانیوں کے متعلق جو کچھ کہا تھا وفات سے قبل وہ اس کا مورد ٹھہرے۔

اسی طرح جماعت لاہور کے مناظر اختر حسین گیلانی تھے انہوں نے 1942ء میں علامہ اقبال کے خلاف ایک طویل تقریر کی جس کو 1944ء میں لاہور جماعت نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ 1937ء میں لاہور جماعت نے قادیانیوں سے راولپنڈی میں جو مباحثہ کیا اس میں وہ لاہوری مناظر تھے۔ وہ علامہ اقبال سے ملتے رہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے سابقہ موقف سے پھر گئے۔ وہ راولپنڈی میں انشورنس کا کام کرتے تھے۔

لاہوری جماعت کے سرکردہ مصنف ممتاز احمد فاروقی کی کتاب فتح حق اور اس کا جو جواب قاضی نذیر لائل پوری نے غلبہ حق کے نام سے دیا، دونوں کتابیں لائق مطالعہ ہیں۔ ان سے دنوں جماعتوں کے اندرون خانہ حالات پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

توضیحی نوٹ (الف)

ختم نبوت

علامہ اقبال نے اپنے خطبات مدراس میں ختم نبوت کے عقیدے کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے پے در پے انبیاء مبعوث فرمائے اور ان کو وحی کے ذریعے اپنا پیغام دیا۔ وہ وحی جو پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئی وہ ہر لحاظ سے اکمل تھی اس لئے مزید وحی کی ضرورت نہیں اور وہ خاتمؐ الانبیاء اور نبی آخر الزمانؐ ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کا دینی پیشوائی کو تسلیم نہ کرنا، قرآن کا عقل و تجربے پر بار بار زور دینا، کائنات فطرت اور تاریخ عالم کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرانا یہ سب تصور خاتمیت کے مختلف پہلو ہیں۔

ختم نبوت کے بعد باطنی واردات کا خاتمہ نہیں ہوا البتہ انسانی تاریخ میں ہر اس شخصی اختیار کا خاتمہ ہوگیا جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا سرچشمہ مافوق الفطرت (وحی) ہے اور اس کی اطاعت لازم ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ اب انسان اپنے عقل و مشاہدے سے حاصل شدہ علم اور شعور کی روشنی میں اپنی زندگی کا نصب العین مقرر کرسکتا ہے یعنی اب کسی نئی وحی کی جگہ انسانی عقل اور مشاہدے نے لے لی ہے۔ الہام کشف اور دیگر باطنی واردات کا دروازہ کھلا ہے لیکن وحی محمدیؐ کے بعد یہ حجت نہیں، یہ ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ ان واردات کو قرآنی وحی کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہے اگر یہ الہامات قرآن کے خلاف ہیں تو اضعاث الاحلام ہیں اور قابل رد ہیں اگر قرآن کے مطابق ہیں تو قرآنی احکامات پہلے سے موجود ہیں اس لئے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی سوشل مفہوم یا وقعت نہیں اور اس کی حیثیت ایک سماجی۔ سیاسی ادارے social-political institution کی نہیں اور نہ ہی یہ ایسے ادارے کی بنیاد بن سکتا ہے جیسا کہ قرآنی وحی تقاضا کرتی ہے۔

ختم نبوت کے اس اجماعی عقیدے کے خلاف باطل تاویلات کا سہارا لے کر قادیانیوں نے نبوت کے جاری ہونے کا عقیدہ تراشا اور مرزا صاحب نے اپنی نبوت کا ذبہ کو مختلف ادوار میں مختلف

انداز سے پیش کیا۔

انہوں نے دعویٰ کیا "یہ مکالمہ مخاطبہ جو مجھ سے ہوتا ہے یقینی ہے اگر میں ایک دم کے لئے بھی اس میں شک کروں تو کافر ہو جاؤں اور میری آخرت تباہ ہو جائے"۔(1)

قادیانی خلیفہ دوم مرزا محمود احمد لکھتے ہیں کہ نبوت کی تین شرائط جو لغت عرب اور قرآن سے ثابت ہیں یعنی

1- کثرت سے امور غیبیہ پر اطلاع پانا۔
2- اس کا یقینی اور قطعی ہونا یعنی عظیم الشان اخبار پر جو انذار اور تبشیر کا پہلو رکھتی ہوں مشتمل ہونا۔
3- خدا تعالیٰ کا نبی کے نام سے پکارنا۔

یہ تینوں شرائط نبوت حضرت مسیح موعود میں پائی جاتی ہیں۔(2)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ کی نبوت جن دلائل اور جن الفاظ سے ثابت ہوتی ہے ان سے بڑھ کر دلائل اور صاف الفاظ حضرت مسیح موعود کی نبوت کے متعلق موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے اگر مسیح موعود نبی نہیں تو دنیا میں آج تک کبھی کوئی نبی ہوا ہی نہیں۔ (3)

قادیانی مرزا صاحب کو حقیقی معنوں میں نبی مانتے ہیں اور ان کی جعلی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔ نئی نبوت میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ قرآنی نص صریح خاتم النبیین ہے وہ خاتم النبیین کے معنی افضل اور اپنی مہر سے نبی بنانے والے کے کرتے ہیں۔(4)

اسی طرح انہوں نے ہر کلمہ گو اہل قبلہ مسلمان کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔ اگر کسی شخص نے مرزا صاحب کا نام بھی نہ سنا ہو تب بھی وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اسی بنیاد پر قادیانیوں نے دعویٰ کیا کہ خدا کی وحی کی رو سے مرزا صاحب نے مسلمانوں کا جنازہ پڑھنے، ان سے رشتہ ناطہ کرنے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے احمدیوں کو سختی سے منع کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نبوت ملت میں افتراق کا باعث بنی اور مرزا صاحب کی وحی دین میں حجت قرار پائی اور ان کو حکم کا درجہ دیا گیا۔

علامہ اقبال نے قادیانیوں کے ان عقائد کی بنیاد پر ان کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں سے اپنا علیحٰدہ وجود تسلیم کرلیں اور مطالبہ کیا کہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

خدا کی طرف سے مامور نبی و رسول کی وحی اور ایک ولی کے الہام میں فرق یہ ہے کہ

1۔ الہام کا دوسروں تک پہنچانا ضروری نہیں۔ وحی کا پہنچانا فرائض نبوت میں شامل ہوتا ہے۔
2۔ یہ انفرادی القاء ہوتا ہے اس کا حلقہ بہت ہی محدود اور تنگ ہوتا ہے، وحی ساری قوم کے لئے ہوتی ہے۔
3۔ ضروری نہیں کہ الہام کا تعلق ہدایتِ خلق سے ہو لیکن وحی کا تعلق سراسر ہدایت خلق سے ہوتا ہے۔
4۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الہام ایک بالکل رازدارانہ چیز ہو جس کے ابلاغ کا نہیں اخفا کا حکم ہو لیکن وحیِ نبوت عدم اخفاء اور بالاعلان تبلیغ کی چیز ہے کیونکہ اس کا تعلق پوری اجتماعی زندگی کے نظام سے ہے۔
5۔ ولی کا الہام حجت نہیں، وحیِ نبوت حجت ہے۔ الہام اسی کے لئے حجت ہوسکتا ہے جس پر وہ ہوا ہو لیکن وحی ہر مخاطب کے لئے حجت ہوتی ہے۔
6۔ پیغمبر وحی کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کا منکر کافر ہے لیکن اولیاء کا الہام کوئی دعوے کی چیز نہیں نہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور نہ اس کا منکر کافر ہوسکتا ہے۔(5)

لاہور جماعت مرزا صاحب کی نبوت کو ولایت کے پردے میں پیش کرتی ہے اور ان کو مجدد اور محدث کہتی ہے۔ لاہوری بعض اولیاء کے کشوف اور باطنی واردات کو اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کشف، الہام، خدا سے ہم کلامی، مجددیت وغیرہ کی جتنی چاہے مثالیں پیش کریں ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو میرے دعاوی کو نہیں مانتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ دعویٰ مرزا صاحب نے کیا اس لئے مرزا صاحب کے دعاوی کی حیثیت ان حضرات کے دعاوی سے یکسر مختلف ہے جنہیں احمدی حضرات مرزا صاحب کے دعاوی کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔(6)

توضیحی نوٹ (ب)

سکھوں کی علیحدہ حیثیت اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ

شیخ عبدالماجد نے اقبال اور احمدیت میں ایک اور نکتہ آفرینی کی ہے کہ علامہ اقبال نے اسٹیٹس مین کے لیڈنگ آرٹیکل کا جواب ایک خط کی صورت میں 10 جون 1935ء کو شائع کرایا اس میں کہا کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بنیادی اختلاف کا انتظامی طور پر نوٹس لے جیسے کہ سکھوں کو 1919ء تک انتظامی اعتبار سے ایک علیحدہ سیاسی یونٹ نہ سمجھا جاتا تھا مگر بعد میں ان کی طرف سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کے بغیر انہیں ایسا تصور کیا گیا۔ احمدیوں کو بھی مسلمانوں سے اسی طرح الگ کر دیا جائے۔ شیخ عبدالماجد کا استدلال یہ ہے کہ سکھوں کو تو انتظامی طور پر علیحدہ سیاسی یونٹ قرار دیا گیا تھا مگر احمدیوں کے بارے میں علامہ اقبال کا مطالبہ علیحدہ مذہبی جماعت کا ہے اس لیے سکھوں کی مثال یہاں چسپاں نہیں ہوتی۔ سکھ اپنی عسکری اور سیاسی اہمیت کے تحت علیحدہ قومیت کے حصول کے لئے کوشاں تھے وہ اپنے آپ کو جداگانہ قوم تصور کرتے تھے وہ اپنی قوم کے لئے ہندوؤں سے مذہباً علیحدہ کئے جانے کی نہیں بلکہ جداگانہ انتخابات Separate Electorate اسمبلی کے علیحدہ انتخابات یا علیحدہ نشستوں کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ مصنف زندہ رود کے مطابق علامہ کا خصوصی اہمیت کا نکتہ یہ تھا کہ 1919ء میں سکھوں کی سیاسی علیحدگی کے نوٹ کی روشنی میں بلا تاخیر احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا جائے۔(1)

حکومت پنجاب کے نوٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی تین الگ انتخابی فہرستیں Electoral Rolls تیار کی جائیں اور جو کوئی اپنے آپ کو سکھ ہندو یا مسلمان کہے اس کو سرکاری طور پر تحقیق کے بغیر اسی مذہب کا حامل سمجھا جائے۔(2)

شیخ عبدالماجد کا خیال ہے کہ اس نوٹ کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علامہ

اقبال کا استدلال یہ تھا کہ انگریزی حکومت نے 1919ء میں سکھوں کو انتظامی لحاظ سے الگ قرار دیا تھا لیکن قادیانیوں کی مسلمانوں سے اس لحاظ سے منفرد حیثیت ہے کہ وہ ختم نبوت کے منکر، اسلام کے اساسی نظریات کے باغی اور اپنے علیحدگی پسندانہ عقائد اور نئی نبوت پر ایمان کے باعث مسلمانوں سے مذہبی اور سماجی سطح پر الگ ہیں لیکن مسلمانوں میں اس لئے شامل رہنا چاہتے ہیں کہ سیاسی فوائد حاصل کریں چونکہ ان کی 1921ء کی مردم شماری کے مطابق کل تعداد 56 ہزار ہے اس لئے وہ مجالس قانون ساز میں ایک نشست بھی نہیں حاصل کر سکتے نہ ہی ان کی نشستیں نئے آئین (1935)ء کے تحت مخصوص کی جا سکتی ہیں اس لئے وہ سیاسی اقلیت کے زمرے میں نہیں آتے یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی اقلیت قرار دیئے جانے کا مطالبہ نہیں کرتے وہ پنجاب میں اپنی قلیل تعداد کے باعث چوتھی اقلیت (مسلم، ہندوؤں سکھوں کے بعد) کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے اس لئے حکومت ان کو ان کے الگ مذہبی عقیدے کی بنیاد پر علیحدہ مذہبی اقلیت قرار دے۔ وہ مسلمان نہیں اسلام کے باغی اور عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں جس کو مانے بغیر مسلمان نہیں کہلا سکتے۔

سکھ اپنے سیاسی مطالبات ہندوؤں سے الگ مذہبی تشخص کی بناء پر پیش کرتے تھے۔ 1921ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی پنجاب میں آبادی 22لاکھ 94ہزار تھی جو کل آبادی کا 11فی صد تھا ان کو پنجاب کونسل میں 13 نشستیں الاٹ کی گئی تھیں جو کل نشستوں کا 19فی صد تھیں۔ وہ کونسل میں 33فی صد نشستوں کا مطالبہ کرتے تھے 1919ء کی مونٹ۔فورڈ اصلاحات کے تحت ان کے جداگانہ حق نیابت separate electorate کو تسلیم کیا جا چکا تھا۔جس کی بناء پر ان کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں 19فی صد نشستیں ملیں لیکن قادیانیوں کی آبادی اتنی کم تھی کہ وہ نہ تو پنجاب کونسل میں کوئی ایک سیٹ لے سکتے تھے نہ ہی ان کی کوئی نشست مخصوص کی جا سکتی تھی وہ مسلمانوں کے حقوق پر مسلمان بن کر ڈاکہ ڈالتے تھے وہ سکھوں کی طرح کوئی سیاسی سودا بازی نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی علیحدہ سیاسی یا انتظامی یونٹ قرار دیئے جانے کے اہل تھے۔ اس لئے علامہ اقبال نے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں سے الگ قرار دیا جائے اور ان کی طرف

سے کسی مطالبہ کا انتظار نہ کیا جائے جیسا کہ سکھوں کے ساتھ کیا گیا۔ سکھ علیحدہ نمائندگی کے حق کو حاصل کرنے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہ تھے کیونکہ وہ اس میں اپنا سیاسی نقصان سمجھتے تھے وہ اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم قرار دیتے تھے اور پنجاب کونسل میں معمولی مسلم اکثریت کو نقصان پہنچانے کے لئے کانگریس سے ساز باز کر کے زائد نمائندگی اور ایک تہائی نشستوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ سکھ خود ہندوؤں سے اپنی علیحدہ حیثیت پر اصرار کرتے تھے لیکن قادیانی مسلمانوں میں شامل رہنا چاہتے تھے کیونکہ وہ تعداد کی کمی کے باعث انتظامی طور پر بھی الگ سیاسی یونٹ قرار پانے کے اہل نہ تھے اس لئے علامہ اقبال نے مطالبہ کیا کہ چونکہ وہ مسلمانوں سے الگ مذہبی اقلیت ہیں اس لئے ان کی اس حیثیت کو سرکاری سطح پر تسلیم کرلیا جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الفضل

قادیان دارالامان مورخہ ۱۰ صفر ۱۳۵۷ھ

جماعت احمدیہ کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ

[illegible] حکومت کی مخالفت [illegible] مسلمانوں [illegible] کے گروہ احمدیوں [illegible] انقلاب [illegible] اول [illegible] ذکر کی جاتی ہے [illegible] اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والا ہے [illegible] ممکن ہے۔

[illegible] میں احمدیوں کے [illegible] مسلمانوں کے [illegible] ہے۔ کہ [illegible] حکومت سے کہا [illegible]

[illegible]

ہم کہہ سکتا ہے بیشک سکھوں کو اس طرح کرنے کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طاقت اور بھی کم ہو جائے گی۔ اور وہ ان کے حقوق پہلے اور بھی کم کر دے گا [illegible] نیز ایسی حالت پیدا ہو جائے گی کہ مسلمانوں کو اندرونی جھگڑوں میں الجھانے میں وہ زیادہ کامیاب ہو جائیں گے۔ اور احمدیوں کو اس میں یہ فائدہ ہے کہ علیحدگی کی صورت میں [illegible] اور کونسل میں اپنے نمائندے منتخب کر کے بھیج سکیں گے۔ اور کسی امر کا اس مطالبہ میں ہاتھ [illegible] شکایت کی نمائندہ [illegible] ہوں گے لیکن موجودہ حالت سے تو بہت زیادہ ہوں گے۔ [illegible] ہر فرد کی [illegible] جماعت احمدیہ کے خیالات اور خیالات کا اظہار کر سکیں گے جو حالت موجودہ ممکن نہیں۔

پس [illegible] حقیقت ہے۔ کہ موجودہ [illegible] حکومت میں کسی اقلیت کا کسی اکثریت کے ساتھ شامل رہنا اس کے لئے نقصان [illegible] اور اکثریت کے لئے نفع [illegible] ہو سکتا ہے۔ لیکن [illegible] اس کے بجائے مفید اور اکثریت کے لئے [illegible] ہو سکتا ہے۔ اس لئے تو اچھوت ہندوؤں سے اور احمدی مسلمانوں سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

علیحدگی اختیار کرنے کی [illegible] شروع کر دی [illegible] [illegible] میں بھی [illegible] سے مسلمانوں میں بہت [illegible] پیدا ہو گا۔ اور [illegible] کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کہ [illegible] اتحاد نہ کریں۔

ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ کسی اکثریت سے جدا ہونا اکثریت کے لئے نقصان [illegible] اقلیت کے لئے مفید نہیں ہو سکتا یہی صورت جماعت احمدیہ کے متعلق بھی ہو سکتی ہے۔ اور جماعت احمدیہ علیحدہ اقلیت قرار پا کر موجودہ حالت کی نسبت زیادہ سیاسی حقوق حاصل کر سکتی ہے لیکن جماعت احمدیہ نے سیاسیات میں ہمیشہ مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو بڑھانے کی کوشش کی اور اپنے مفاد کو قربان کیا ہے۔

جماعت احمدیہ کی اس [illegible] اور مسلمانوں کی طاقت کو [illegible] کی قدر قیمت اگر احراری [illegible] کی نظر میں کچھ نہیں۔ تو ہم انہیں [illegible] ہیں۔ [illegible] جماعت احمدیہ سے تعلق رکھنے والا کوئی [illegible] اس [illegible] میں نظر نہیں آ رہی۔ لیکن ہر سمجھدار اور دور اندیش مسلمان جانتا ہے کہ اگر جماعت احمدیہ نے اپنے سیاسی حقوق کا علیحدہ مطالبہ شروع کر دیا تو اس سے مسلمانوں کو سیاسی طور پر کس قدر نقصان پہنچے گا۔

[illegible] اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ کہ جماعت احمدیہ علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کو [illegible] نقصان [illegible] یا محسوس کرتی ہے۔ اگر جماعت [illegible] تو آج اس کا [illegible] اسلام سے خارج کی جا سکتی۔ اگر احمدی علیحدگی کا مطالبہ کریں [illegible] تو جماعت احمدیہ کا [illegible] نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے۔ جماعت احمدیہ [illegible] اسلام کی [illegible] کے انتظام [illegible] اور اپنی طاقت [illegible] سیاسی حقوق اور [illegible]

قابل توجہ [illegible]

[illegible]

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ——— نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو الناصر

ڈاکٹر سر محمد اقبال اور احمدیہ جماعت

(نمبر اوّل)

سر محمد اقبال صاحب کو کچھ عرصہ سے میری ذات سے خصوصاً اور جماعت احمدیہ سے عموماً بغض پیدا ہو گیا ہے۔ اور اب انکی حالت یہ ہے کہ یا تو کبھی وہ انہی عقائد کی موجودگی میں جو ہماری جماعت کے اب ہیں جماعت احمدیہ سے تعلق موافقت اور مواخات رکھنا بُرا نہیں سمجھتے تھے یا اب کچھ عرصہ سے وہ اسکے خلاف خلوت و جلوت میں آواز اُٹھاتے رہتے ہیں۔ میں ان وجوہ کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جو اس تبدیلی کا سبب ہوئے ہیں۔ جس نے ۱۹۱۱ء کے اقبال کو جو علیگڑھ کالج میں مسلمان طلباء کو تعلیم دے رہا تھا کہ "پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں" ۱۹۳۵ء میں ایک دوسرے اقبال کی صورت میں بدل دیا جو یہ کہہ رہا ہے کہ

"میرے نزدیک قادیانیت سے بہائیت زیادہ ایماندار ہے کیونکہ بہائیت نے اسلام سے اپنی علیحدگی کا اعلان واشگاف طور پر کر دیا لیکن قادیانیت اپنے چہرے سے منافقت کی نقاب کو نہیں [illegible]

[illegible]

تباہ و برباد کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔" (زمیندار ۵ مئی ۳۵ء)

یعنے ۱۹۱۱ء کی احمدیہ جماعت آج ہی کے عقائد کے ساتھ صحابہؓ کا خالص نمونہ تھی۔ لیکن ۱۹۳۵ء کی احمدیت بہائیت سے بھی بدتر ہے اس بہائیت سے جو صاف لفظوں میں قرآن کریم کو منسوخ کہتی ہے جو واضح عبارتوں میں بہاء اللہ کو ظہور الٰہی قرار دیتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر انکو فضیلت دیتی ہے۔ گویا ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کے نزدیک اگر ایک شخص رسول کریم کی رسالت کو منسوخ قرار دیتا۔ قرآن کریم سے بڑھ کر تعلیم لانے کا مدعی ہوتا۔ نمازوں کو تبدیل کر دیتا اور قبلہ کو بدل دیتا ہے اور نیا کلمہ بناتا اور اپنے لئے خدائی کا دعویٰ کرتا ہے حتیٰ کہ اسکی قبر پر سجدہ کیا جاتا ہے تو بھی اس کا وجود ایسا برا نہیں مگر جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دیتا آپکی تعلیم کو آخری تعلیم بتاتا قرآن کریم کے ایک ایک لفظ ایک ایک حرکت کو آخر تک خدا تعالےٰ کی حفاظت میں سمجھتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے ہر حکم پر عمل کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے سب روحانی ترقیات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اور غلامی میں محصور سمجھتا ہے وہ برا اور بائیکاٹ کرنے کے قابل ہے +

دوسرے لفظوں میں سر محمد اقبال صاحب مسلمانوں سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو منسوخ کرے قرآن کریم کے بعد ایک نئی کتاب لانے کا مدعی ہو اپنے لئے خدائی کا مقام تجویز کرے اور اپنے سامنے سجدہ کرنے کو جائز قرار دے جسکے خلیفہ کی بیعت نامہ میں صاف لفظوں میں لکھا ہو کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ وہ بانی سلسلہ احمدیہ سے اچھا ہے جو اپنے آپکو خادم رسول اکرم صلعم قرار دیتے ہیں اور قرآن کریم کی اطاعت کو اپنے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اور کعبہ کو بیت اللہ اور کلمہ کو مدار نجات سمجھتے ہیں کیونکہ بہائی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر اور قرآن کریم پر حملہ کرتے ہیں۔ لیکن احمدی سر محمد اقبال اور انکے ہم نواؤں کو روحانی بیمار قرار دیکر انہیں اپنے علاج کیطرف توجہ دلاتے ہیں۔ اور انکے ایمان کی کمزوریوں کو ان پر ظاہر کرتے ہیں۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

سر محمد اقبال صاحب اس عذر کی پناہ نہیں لے سکتے کہ میرا صرف مطلب یہ ہے کہ بہائی منافق نہیں اور احمدی منافق ہیں کیونکہ [illegible]

[illegible]

ان فلسفی تحریکات تک سے آگاہ نہیں جیسے اسوقت کے معمولی نوشت و خواند والے لوگ آگاہ ہیں۔ سر محمد اقبال کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بہائی اپنی کتب عام طور پر لوگوں کو نہیں دیتے بلکہ انہیں چھپاتے ہیں۔ وہ ہر ملک میں الگ الگ عقائد کا اظہار کرتے ہیں وہ امریکہ میں صاف لفظوں میں بہاءاللہ کو خدا کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن اسلامی ممالک میں انکی حیثیت ایک کامل ظہور کی بتلاتے ہیں وہ اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ ملکر نمازیں پڑھ لیتے ہیں ویسا ہی وضو کرتے ہیں اور اتنی ہی رکعتیں پڑھتے ہیں جتنی کہ مسلمان۔ لیکن الگ طور پر وہ صرف تین نمازوں کے قائل ہیں اور انکے ہاں نماز پڑھنے کا طریق بھی اسلام سے مختلف ہے +

پھر یہ بھی درست نہیں کہ احمدی منافق ہیں اور لوگوں سے اپنے عقائد چھپاتے ہیں۔ اگر احمدی مداہنت سے کام لیتے تو آج سر محمد اقبال کو اس قدر اظہار غصہ کی ضرورت ہی کیوں ہوتی احمدی ہندوستان کے ہر گوشہ میں رہتے ہیں۔ دوسرے فرقوں کے لاکھوں کروڑوں مسلمان انکے حالات سے واقف ہیں وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی نماز کے مطابق نماز پڑھنے والے۔ روزے رکھنے والے حج کرنیوالے اور زکوٰۃ دینے والے ہیں وہ کونسی بات ہے جو احمدی چھپاتے ہیں۔ اور سر محمد اقبال کے پاس وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے انہوں نے یہ معلوم کیا کہ احمدیوں کے دل میں کچھ اور ہے مگر ظاہر وہ کچھ اور کرتے ہیں +

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس قدر محتاط تھے کہ جب ایک صحابی نے ایک شخص کو جس نے جنگ میں عین اسوقت کلمہ پڑھا تھا جب وہ اسے قتل کرنے لگے تھے قتل کر دیا۔ اور عذر یہ رکھا کہ اس نے ڈر سے کلمہ پڑھا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ھل شققت قلبہٗ کیا تُو نے اُس کا دل پھاڑ کر دیکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب آج دُنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ قوم جسکے افراد نے افغانستان میں اپنے عقائد چھپانے پسند نہ کئے لیکن جان دیدی۔ ساری کی ساری منافق ہے اور ظاہر کچھ اور کہتی ہے اور اس کے دل میں کچھ اور ہے +

اگر یہ الزام کوئی ایسا شخص لگاتا جسے احمدیوں سے واسطہ نہ پڑا ہوتا تو میں اسے معذور سمجھ لیتا لیکن سر محمد اقبال معذور نہیں کہلا سکتے۔ انکے والد صاحب مرحوم احمدی تھے۔ انکے بڑے بھائی صاحب شیخ عطا محمد صاحب احمدی ہیں انکے اکلوتے بھتیجے شیخ محمد اعجاز احمد صاحب سب جج

احمدی ہیں۔ اسی طرح انکے خاندان کے اور بھی افراد احمدی ہیں۔ انکے بڑے بھائی صاحب حال ہی میں کئی ماہ انکے پاس رہے ہیں بلکہ جسوقت انہوں نے یہ اعلان شائع کیا ہے۔ اسوقت بھی سر محمد اقبال صاحب کی کوٹھی وہ تعمیر کرا رہے تھے کیا سر محمد اقبال صاحب نے انکی رہائش کے ایام میں انہیں منافق پایا تھا یا خود اپنی زندگی سے زیادہ پاک زندگی انکی پائی تھی انکے سگے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب ایسے نیک نوجوان ہیں کہ اگر سر محمد اقبال غور کریں تو یقیناً انہیں ماننا پڑے گا کہ انکی اپنی جوانی اس نوجوان کی زندگی سے سینکڑوں سبق لے سکتی ہے۔ پھر ان شواہد کی موجودگی میں ان کا کہنا کہ احمدی منافق ہیں اور وہ ظاہر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں کہاں تک درست ہو سکتا ہے +

میں تمام ان شریف مسلمانوں سے جو اسلام کی محبت رکھتے ہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس صورت حالات پر غور کریں جو ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کے اعلان نے پیدا کر دی ہے اور دیکھیں کہ کیا اس قسم کے غیظ و غضب سے بھرے ہوئے اعلان مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنائینگے یا خراب کرینگے اور سوچیں کہ ایک شخص جو اپنے احمدی بھائی کو بلوا کر اس سے اپنی کوٹھی بنوانا ہے دوسرے مسلمانوں کو انکے بائیکاٹ کی تعلیم دیتا ہے کہاں تک لوگوں کیلئے راہنما بن سکتا ہے اور اسی طرح وہ شخص جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کھلا حملہ کرنیوالے کو اچھا قرار دیتا ہے اور اپنے ایمان پر اعتراض کرنیوالے کو ناقابل معافی قرار دیتا ہے کہاں تک مسلمانوں کا خیر خواہ قرار دیا جا سکتا ہے کاش سر محمد اقبال اس عمر میں ان امور کیطرف توجہ کرنیکی بجائے ذکر الٰہی اور احکام اسلام کی بجا آوری کیطرف توجہ کرتے اور پیشتر اسکے کہ توبہ کا دروازہ بند ہوتا اپنے نفس کی اصلاح کرتے تا خدا تعالیٰ ان کو موت سے پہلے صداقت کے سمجھنے کی توفیق دیتا اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے متبع کے طور پر اپنے رب کے حضور میں پیش ہو سکتے۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ والسلام

خاکسار میرزا محمود احمد امام جماعت احمدیہ

مندرجہ بالا مضمون حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے لکھا ہے جسے تمام مسلمانوں تک پہنچانے کیلئے صیغہ تحریک جدید شائع کرتا ہے •

خاکسار عبدالرحمٰن انور انچارج تحریک جدید قادیان پنجاب

باب 8:

حوالے وحواشی

(1) حرف اقبال ص: 103 تا 108

(2) ایضاً: 109

(3) ایضاً: 118

(4) زندہ رود حصہ سوم، ص: 577

(5) ایضاً

(6) حرف اقبال، ص: 134

(7) سید نذیر نیازی اقبال کے حضور، ص: 5 , 7

(8) i- مرزا محمود احمد نے اپنے خطبہ جمعہ مندرجہ الفضل قادیان، 8 نومبر 1938ء میں کہا اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہیں اتنی غیر محدود ہیں کہ کلی طور پر طے کرنے کا خیال بھی کفر ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی سب طے نہیں کیں بے شک اپنے مقام کی سب کیں اور آپ سب سے آگے ہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرلیا ہو۔ یہ غلط ہے، اس پر ایک صاحب نے بعض اعتراض کرتے ہوئے مرزا محمود احمد سے بعض سوالات کے جواب طلب کئے وہ سوال اور ان کے جواب درج ذیل ہیں۔

سوال: کیا آنحضور ﷺ کو خدا تعالیٰ کا مکمل قرب حاصل نہیں ہوا؟

جواب: اگر مکمل سے مراد یہ ہے کہ سب انسانوں سے زیادہ تو محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ قرب حاصل ہوا اور اگر مراد یہ ہے کہ اس سے آگے قرب کی راہیں بند ہیں تو یہ غلط ہے۔

سوال: کیا کسی دوسرے انسان کو اس قرب سے جو آپ ؐ کو حاصل ہوا بڑھ کر قرب حاصل ہوسکتا ہے۔

جواب: اگر یہ مراد ہے کہ کوئی بندہ ایسا موجود ہے تو جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں اگر یہ مراد ہے کہ خدا نے دوسروں کے لئے زیادہ قرب کی راہ بند کر دی ہے تو غلط ہے۔ اخبار الفضل قادیان، 10 دسمبر، 1939ء

ii- مرزا محمود احمد نے ایک خطبے میں یہ بھی کہا کہ مکہ مدینہ کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہوگیا ہے۔ (حقیقۃ الرویا)

iii- قادیانی قرآنی آیتِ میثاق سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس میں تمام انبیاء سے نبی کریم ﷺ کے

لئے اور حضور نبی کریم ﷺ سے مرزا غلام احمد کے لئے ایمان لانے اور ان کی نصرت کرنے کا عہد لیا گیا ہے۔ پیغام صلح لاہور، 17 اگست 1940ء خطبہ محمد سعید حیدر آبادی، 19، 21 ستمبر 1915ء نیز احمدیہ پاکٹ بک مرتبہ خادم گجراتی

iv- قاضی محمد ظہور اکمل نے مرزا صاحب کی زندگی میں ایک نظم کہی جو اخبار بدر میں 25 اکتوبر 1906ء کو شائع ہوئی اس کے دو شعر ہیں۔

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

یہ اشعار شاعر نے خود مرزا غلام احمد قادیانی کو متعدد قادیانیوں کی موجودگی میں پڑھ کر سنائے۔ مرزا صاحب نے سن کر جزاک اللہ کہا اور خوشخط لکھی ہوئی اس نظم کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ 1944ء میں اس نظم کے ایک شعر پر بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے قاضی اکمل نے الفضل میں لکھا:

''وہ اس نظم کا ایک حصہ ہے جو حضرت مسیح موعود کے حضور میں پڑھی گئی اور خوشخط لکھے ہوئے قطعے کی صورت میں پیش کی گئی اور حضور اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے اس وقت کسی نے اس شعر پر اعتراض نہ کیا حالانکہ مولوی محمد علی (امیر جماعت احمدیہ لاہور) اور ان کے رفقاء موجود تھے اور جہاں تک حافظہ مدد کرتا ہے باوثوق کہا جا سکتا ہے کہ سن رہے تھے اگر وہ اس سے بوجوہ مرور زمانہ انکار کر دیں تو یہ نظم ''بدر'' میں شائع ہوئی۔ اس وقت ''بدر'' کی پوزیشن وہی تھی بلکہ کچھ بڑھ کر جو اس عہد میں الفضل کی ہے مفتی محمد صادق صاحب ایڈیٹر ''بدر'' سے ان لوگوں کے محبانہ اور بے تکلفانہ تعلقات تھے وہ خدا کے فضل سے زندہ موجود ہیں ان سے پوچھ لیں اور خود کہہ دیں کہ آیا آپ میں سے کسی نے بھی اس پر ناراضگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور حضرت مسیح موعود کا شرف سماعت حاصل کرنے اور جزاک اللہ تعالیٰ کا صلہ پانے اور اس قطعے کو اندر خود لے جانے کے بعد کسی کو حق ہی کیا پہنچتا تھا کہ اس پر اعتراض کر کے اپنی کمزوری ایمان اور قلت عرفان کا ثبوت دیتا''۔ (الفضل 22 اگست 1944ء)

قاضی اکمل مزید لکھتے ہیں۔

''یہ شعر خطبہ الہامیہ پڑھ کر حضرت مسیح موعود کے زمانے میں کہا گیا اور ان کو سنا بھی دیا گیا اور چھاپا بھی گیا'' (الفضل 22 اگست 1944ء)

ہوسکتا ہے کہ عام قارئین مرزا غلام احمد قادیانی کے خطبہ الہامیہ سے واقف نہ ہوں اس لئے مطبوعہ خطبے کا متعلقہ حصہ درج کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

''اور جان لو کہ ہمارے نبی ﷺ جیسا کہ پانچویں ہزار میں مبعوث ہوئے ایسا ہی مسیح موعود کی بروزی صورت اختیار کر کے چھٹے ہزار سال کے آخر میں مبعوث ہوئے''

مرزا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ بعثتِ ثانیہ بعثتِ اولیٰ سے کہیں زیادہ طاقتور، کامل اور روشن ہے:

''بلکہ حق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی روحانیت چھٹے ہزار سال کے آخر میں یعنی ان دنوں میں بہ نسبت ان سالوں کے اقویٰ اور اکمل اور اشد ہے بلکہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے۔ (روحانی خزائن جلد 16 ص 270-271-272)

قاضی اکمل مشہور اشتراکی مصنف اے آر شبلی، مؤلف کتاب پاکستان کے دیہہ خدا کے والد تھے۔ مرزا ناصر احمد نے ایک تقریر میں کہا کہ مرزا محمود احمد اور جماعت احمدیہ نے ان اشعار کو پسند نہیں کیا۔ ان کا جو مجموعہ کلام شائع ہوا اس میں انہوں نے ان اشعار کو نکال دیا لیکن قادیانیوں کا یہ موقف ہے کہ ایسا مصلحتاً اور مجبوراً کیا گیا ورنہ جماعت کا یہی عقیدہ ہے۔

v- صاحبزادہ بشیر احمد لکھتے ہیں:

''اب معاملہ صاف ہے۔ اگر نبی کریمؐ کا انکار کفر ہے تو مسیح موعود (مرزا صاحب) کا انکار بھی کفر ہونا چاہئے چونکہ مسیح موعود نبی کریمؐ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ وہی ہے۔ اور اگر مسیح موعود کا منکر کافر نہیں تو نعوذ باللہ نبی کریمؐ کا منکر بھی کافر نہیں کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ پہلی بعثت میں تو آپ کا انکار کفر ہو مگر دوسری بعثت میں جس میں بقول مسیح موعود آپ کی روحانیت اقویٰ اور اکمل اور اشد ہے آپ کا انکار کفر نہ ہو''۔

(کلمۃ الفصل، مندرجہ رسالہ ریویو آف ریلیجنز قادیان ص 146، نمبر 3، جلد 14)

vi- مرزا محمود نے ایک خطبہ میں یہ بھی کہا کہ ایک شخص حضرت محمد ﷺ سے بڑھ سکتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ ابھی تک ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ (امکانی طور پر بھی یہ کلمات کہنا کفر سے کم نہیں۔ مصنف) (الفضل قادیان 13 فروری، 1944ء میں پورا خطبہ درج ہے)۔

vii- مرزا محمود احمد کے ایک قریبی عزیز ڈاکٹر شاہ نواز خان (جو خود بھی قادیانی تھے) نے ایک قادیانی جریدے میں لکھا:

''حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ذہنی ارتقاء آنحضرت ﷺ سے زیادہ تھا............اس زمانے میں تمدنی ترقی زیادہ ہوئی ہے اور یہ جزوی فضیلت ہے جو حضرت مسیح موعود کو آنحضرت صلعم پر حاصل ہے- نبی کریمؐ کی ذہنی استعدادوں کا پورا ظہور بوجہ تمدن کے نقص کے نہ ہوا- ورنہ قابلیت تھی- اب تمدن کی ترقی سے حضرت مسیح موعود کے ذریعے ان کا پورا ظہور ہوا ہے- اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ کو موقع ملا اور ذہنی طاقتوں کی نشوونما ہوگئی''-

(ریویو آف ریلی جنز، قادیان مئی 1929ء)

(9) حرف اقبال ص: 112
(10) الفضل قادیان، 25 مئی 1935ء
(11) حرف اقبال ص: 115
(12) تاریخ احمدیت جلد ہشتم، ص: 176-181
(13) ایضاً 181 تا 184
(14) بشیر احمد، تحریک احمدیت ـ یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، تحریک پاکستان اور قادیانی، باب 14
(15) الفضل قادیان، 30 اگست 1935ء
(16) ملخص خطبہ جمعہ مرزا محمود احمد، 30 مئی 1935ء ماخوذ از قادیانی مذہب، ص: 30
(17) تاریخ احمدیت، جلد ہشتم، ص: 188
(18) ایضاً: 188-192
(19) مولوی محمد علی، امیر جماعت لاہور تحریک احمدیت، 1930 ص: 223
(20) Molvi Muhammad Ali, Sir Muhammad Iqbal's Statement regarding Qadianis, Lahore, 1935, Page 6.7

مرزا غلام احمد صاحب نے منافقت سے کام لیا۔ یہی سر فضل حسین 1908ء میں لاہور میں مرزا صاحب سے ملے اور یہی سوال پوچھا تو انہوں نے جواب اثبات میں دیا۔ وہ اپنے پہلے موقف سے روگردانی کر چکے تھے بلکہ پہلے بھی 1904ء میں ان کا یہی موقف تھا۔ دیکھیں مرزا بشیر احمد ایم اے کی کتاب مسئلہ کفر اسلام جس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(21) مرزا صاحب نے بعض حالات میں اس کی وقتی اجازت دی لیکن ان کا اصل مقصد ممانعت تھا۔ اس سلسلے کی بحث مرزا بشیر احمد کی کتاب مسئلہ جنازہ میں موجود ہے۔

(22) قادیانی سید احمد بریلویؒ شہیدِ بالاکوٹ کو مرزا صاحب سے پہلے آنے والا ارہاص یا الیاس (ایلیاہ) بتاتے ہیں۔ الفضل قادیان، 3 ستمبر 1938ء۔ سید صاحبؒ نے اس کے بارے میں شاید سوچا بھی نہ ہوگا۔

(23) Molvi Muhammad Ali, Amir Jamat Lahore, Sir Muhammad Iqbal's Statement regarding Qadianis, Lahore 1935, Page 19

(24) ایضاً، جس زمانے میں پاکستان میں یہ سوال زیرِ غور تھا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو لاہوری جماعت کے آرگن پیغام صلح نے اپنی 30 مئی 1973ء کی اشاعت میں لکھا:

''ان حالات میں اول تو کسی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا صحیح نہیں اور اگر اس شوق کو پورا ہی کرنا ہے..... تو کم از کم احمدیوں کے اس گروہ کو اس سے مستثنیٰ کرنا ضروری ہے جو حضرت خاتم النبیین کے بعد کسی بھی نبی کے آنے کے قائل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ہیں۔ ہمارے نزدیک قادیانی ہو یا غیر قادیانی ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ اس کو غیر مسلم قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں''۔

(25) ڈاکٹر اللہ بخش، علامہ اقبال مرحوم اور بانی سلسلہ احمدیہ، لاہور ص: 8، بیان محمد یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ، پیغام صلح لاہور، 19 نومبر 1935ء

مولوی محمد یعقوب خاں صاحب کی بات میں اتنی صداقت تو ہے کہ علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان میں مرزا غلام احمد قادیانی اور لاہور جماعت کی طرف روئے سخن نہیں ہے لیکن علامہ نے اس سلسلے میں سٹیٹس مین میں جو مراسلہ شائع کرایا اس میں بانیِ تحریکِ احمدیت پر اس حوالے سے تنقید کی کہ انہوں نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ (حرف اقبال ص: 117-118) اسی طرح اس ضمن میں پنڈت نہرو کے مضامین کا جواب دیتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں: ''بانی احمدیت کا استدلال یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبر اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے۔ لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے مساوی ہے کہ ''محمد ﷺ آخری نبی نہیں میں آخری نبی ہوں''..... ''جب میں بانیِ احمدیت

کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے''۔ (حرف اقبال ص: 127-128) وہ مزید لکھتے ہیں ''تحریک احمدیت دو جماعتوں میں منقسم ہے جو قادیانی اور لاہوری جماعتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اول الذکر جماعت بانی احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے آخر الذکر نے اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کو کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا۔'' (حرف اقبال ص: 120)

توضیحی نوٹ (الف)

(1) تجلیات الٰہیہ ص: 24

(2) حقیقۃ النبوہ، ص: 75

(3) ایضاً، ص: 201

(4) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اجرائے نبوت کے حق میں قادیانیوں کے دلائل کے مسلمان علماء نے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ لیکن قادیانی اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے علماء سلف کی کتابوں کے سیاق و سباق سے کاٹ کر حوالے دیتے رہتے ہیں۔ وہ اجرائے نبوت کی تائید میں ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ خاتم النبیین میں النبیین جمع مذکر سالم ہے اور خاتم کی طرف مضاف ہو کر آخری کے معنی نہیں دیتا۔ انہوں نے اس دلیل کو ایک چیلنج کی حیثیت دے رکھی ہے اور محاورۂ عرب سے اس کا ثبوت مانگتے ہیں [دیکھیں اللہ دتہ جالندھری کا رسالہ البرہان، ربوہ، 1950ء] اللہ دتہ جالندھری لکھتے ہیں ''میں آپ (مخالف عالمِ دین-مصنف) کو چیلنج کرتا ہوں کہ آپ اہل عربیہ کا ایک حوالہ پیش کریں جس میں لفظ خاتم کسی روحانی کمالات والی جماعت کی طرف مضاف ہو اور وہ لفظ مرکب کسی شخص کی تعریف میں مذکور ہو اور اس کے معنی بلحاظِ زمانہ آخری ہوں، ہرگز آپ اس کا جواب نہیں دے سکتے کیونکہ بلحاظِ زمانہ آخری ہونا کوئی کمال نہیں، اور نعمت کا بند ہونا کوئی کمال نہیں، ہاں سب سے افضل ہونا کمال ہے''۔ ص 12

ہم کسی مذہبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے لیکن قادیانی مناظرہ بازوں کی تسلی کے لئے اس کا جواب دے رہے ہیں جو اہل علم کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ختم نبوت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں اب تک ہمیں یہ جواب نہیں ملا۔ یہ جواب انگریزی جریدے مسلم ورلڈ کی جنوری 1936ء کی اشاعت میں قادیانی مبلغ عبدالرحیم نیرّ

کے استفسار کے ضمن میں شائع ہوا تھا۔ مسلم ورلڈ کا مضمون نگار لکھتا ہے:

''لسان العرب نے اللحیانی، ایک تیسری صدی کے ماہر لغت کی سند پر خاتَم القوم. خاتِمهم و خاتَمهم تمام محاورات کی تشریح اخرھم۔ ان کا آخری کی ہے۔ لسان العرب یا تاج العروس دونوں میں سے کسی نے اس مادے کی کسی شکل کے معنے ''افضل'' یا منتخب نہیں کئے۔ ان ہر دو مستند معاجم کے اخذ کردہ نتیجہ کی تصدیق الزمخشری کی ''اساس البلاغۃ'' اور لیال کے نسخہ ''المفضلیات''، میں مزید تحقیق سے بھی ہوتی ہے جن دونوں نے اس لفظ کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مشہور عربی شاعر الفرزدق محمد ﷺ کو خیر الخواتم یا مہروں میں سے بہترین قرار دیتا ہے۔ (نقائض جریر و الفرزدق نسخہ بیون مطبع لیڈن 07-1905ء جلد اول صفحہ 349 سطر 5) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب الفرزدق نے مہر اور ''افضل'' کے خیال کو ملانا چاہا تو اس نے دونوں لفظوں کو ایک ہی محاورہ میں استعمال کیا...... اس طرح عربی علم و ادب اور ماہرین لغت کی شہادت خاتم کے معنے افضل یا منتخب کرنے کی تائید نہیں کرتی''۔

(5) جعفر شاہ پھلواروی۔ مقام سنت، مکتبہ امتیاز، راولپنڈی، ص: 47

(6) غلام احمد پرویز، ختم نبوت اور تحریک احمدیت، طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور 1974ء ص 28

توضیحی نوٹ (ب)

(1) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت، زندہ رود پر تبصرہ، باب جس طرح سکھوں کو علیحدہ سیاسی یونٹ تصور کر لیا گیا...... اقبال، ص 12-311۔ زندہ رود ص 552

(2) راجیوا ے کپور، سکھ سپریشن لندن ص 79، بحوالہ اقبال اور احمدیت ص 312

باب 9

علامہ اقبال کے بیان پر قادیانی جرائد کے تبصرے اور پنڈت نہرو کے خطوط

قادیانی جماعت کے اخبار الفضل قادیان اور دیگر رسائل و جرائد میں علامہ اقبال کے بیان پر بہت کچھ لکھا گیا۔ ہم نے ان میں سے ان تحریروں کا انتخاب کیا ہے جو بظاہر معقولیت پر مبنی ہیں۔ قادیانی مضمون نگاروں نے زیادہ تر مذہبی نقطہ نظر سے بحث کی ہے کیونکہ ان کے لئے علامہ اقبال کے بنیادی دلائل کو جھٹلانا ممکن نہ تھا۔ مثلاً ایک قادیانی امیر عالم پٹیالوی نے الفضل 15 مئی 1935ء کی اشاعت میں ایک مضمون بعنوان ڈاکٹر اقبال کا غیر فلسفیانہ تبصرہ لکھا۔ اس میں وہ علامہ اقبال کے ایک مصرعے کو جو انہوں نے داغ دہلوی کی وفات پر کہا تھا کہ آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے بنیاد بنا کر کہتے ہیں کہ کیا دلی میں داغ کے بعد شاعر نہ ہوئے۔ اس سے وہ نبوت کے جاری ہونے کا روایتی قادیانی استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک قادیانی حقانی چکوالی ایم اے نے ڈاکٹر اقبال کے بیان پر ایک نظر کے عنوان سے الفضل قادیان میں دو قسطوں 24-25 مئی 1935ء میں ایک مضمون لکھا جس میں کہا کہ مجوسی ثقافت اور اجرائے نبوت کا عقیدہ لازم وملزوم نہیں جیسا کہ ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے بلکہ مجوسی ثقافت کی امتیازی خصوصیت ختم نبوت کا عقیدہ ہے نہ کہ اجرائے نبوت کا۔ ایسے دیگر مضامین میں کوئی بات جواب طلب دکھائی نہیں دیتی اس لئے ہم الفضل اور ریویو آف ریلی جنز کے دو اداریوں پر بحث کرتے ہیں جن میں جماعت کے موقف کو پیش کیا گیا ہے۔

الفضل کا اداریہ

الفضل 14 مئی 1935ء میں جماعت احمدیہ کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کے عنوان سے جو اداریہ شائع ہوا اس میں اخبار نے یہ دلیل پیش کی کہ جماعت احمدیہ کو جداگانہ اقلیت قرار

دینے سے وہ پنجاب کونسل اور مرکزی اسمبلی میں اپنے منتخب نمائندے بھجوا سکیں گے اور ان کی نشستیں محفوظ ہوں گی لیکن یہ دعویٰ بے بنیاد تھا کیونکہ ایکٹ آف 1935ء کے نفاذ کے بعد آئندہ انتخابات میں وہ ایسے سیاسی فوائد حاصل کرنے کے اہل قرار نہیں پا سکتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ان کی تعداد کم تھی صرف پنجاب کے بعض اضلاع خصوصاً تحصیل بٹالہ میں قادیانیوں کی بڑی تعداد تھی جہاں سے انہوں نے 1946ء کے الیکشنوں میں مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلے میں اپنے امیدوار فتح محمد سیال کو مقابلہ کے لئے کھڑا کیا دوسرے ہندوستان کے دوسرے صوبوں یوپی، سی پی وغیرہ میں وہ بری طرح بکھرے ہوئے تھے اور ان کی تعداد بہت ہی کم تھی ووٹ کے اہل افراد کی تعداد اور کم تھی اس لئے وہاں سے کوئی سیٹ حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ نہ کسی سیاسی جماعت سے انتخابی اتحاد ممکن تھا۔ ایسے میں جب تک ان کی مذہبی اور سیاسی حیثیت کا تعین نہ ہو ان کی سیٹ محفوظ نہیں ہو سکتی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل 1946ء میں جب عبوری حکومت قائم ہوئی اور اس میں پارسیوں کا ایک نمائندہ شامل کیا گیا تو مرزا محمود نے بہت احتجاج کیا اور کہا کہ ان کی تعداد پارسیوں سے زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا تم ایک پارسی لاؤ میں اس کے مقابلے میں ایک احمدی لاتا ہوں اس طرح ثابت ہو جائے گا کہ کون اکثریت میں ہے لیکن ان کی بات نہ سنی گئی۔

اس اداریے میں ان کا یہ کہنا کہ جماعت احمدیہ اقلیت قرار پانے سے ڈرتی نہیں، غلط ہے۔ وہ اس مطالبہ سے ہمیشہ خوفزدہ رہی دوسرے ان کا یہ دعویٰ کہ وہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفاد میں ان کا ساتھ دینے کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کا فیصلہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت اور باؤنڈری کمیشن میں ان کے الگ محضر نامہ پیش کرنے سے عیاں ہو گیا۔ جسٹس منیر اپنے ایک مضمون میں سوال کرتے ہیں کہ اگر احمدیوں کو مسلم لیگ کے موقف سے اتفاق تھا اور مسلم لیگ کا کیس بھی جماعت احمدیہ کا ایک ممتاز فرد سر ظفر اللہ پیش کر رہا تھا تو پھر الگ محضر نامہ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی کیونکہ قادیانیوں کی اس روش سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔

ریویو آف ریلی جنز قادیان کا تبصرہ جون 1935ء

قادیان سے شائع ہونے والے ماہنامے ریویو آف ریلی جنز نے جون 1935ء کے شمارے میں علامہ اقبال کے بیان پر ایک تبصرہ شائع کیا اس کا عنوان تھا Dr Muhammad Iqbal's Bitter Attack on The Ahmadyah Community.

ڈاکٹر علامہ اقبال کا احمدیہ جماعت پر سخت حملہ۔ اس مضمون میں مدیر ریویو ملک غلام فرید ایم۔اے نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر اقبال کا احمدیت پر حملہ زیادہ تر سیاسی وجوہات کی بنا پر ہے۔ وہ لکھتے ہیں' ڈاکٹر اقبال اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ 1914ء میں حکیم نورالدین کی وفات سے قبل وہ لاہور کی مقامی جماعت کے مرکز میں باقاعدگی سے جاتے اور جلسوں کی صدارت کرتے تھے اور ان میں تقریریں کرتے تھے۔ وہ اس وقت کی احمدیہ جماعت کے مذہبی رہنماؤں سے میل جول رکھتے ہوئے ان کی مذہبی سرگرمیوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ ایسے افراد کے ساتھ ان کے تعلقات ذاتی حیثیت میں تھے غلط ہے۔ ہم اس جواب کو درست تسلیم کر لیتے اگر 1931ء میں یہ صورت نظر نہ آتی کہ انہوں نے اس وقت موجودہ امام جماعت احمدیہ مرزا محمود احمد) کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی حقیقی معنوں میں ڈکٹیٹرشپ نہ پیش کی ہوتی، اور ان کو اپنے مکمل تعاون کی پیش کش نہ کی ہوتی اور گول میز کانفرنس میں چوہدری ظفراللہ خان صاحب جیسے ممتاز احمدی کے ساتھ گہرے اتحاد کے ساتھ ہاتھ نہ بٹایا ہوتا۔ ظفراللہ کو جو خراج تحسین پیش ہوا اس سے ڈاکٹر اقبال کے دل میں حسد اور رقابت پیدا ہوئی اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کے رہنما بننے کے لئے کوشاں ہیں'۔

انگریزی روزنامہ سٹیٹس مین نے بھی 14 مئی 1935ء کی اشاعت میں ڈاکٹر صاحب کی بات کا برا منایا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے بوجہ خاتم النبیین ہونے کے شدید وابستگی نے چوہدری ظفراللہ کے وائسرائے ہند کی کونسل کے بطور ممبر مقرر ہونے کے بعد ہی جوش مارا ہے۔ قادیانی فرقہ کشمیر کمیٹی کے معرض وجود میں آنے اور چوہدری صاحب کے تقرر سے تیس سال قبل کا

قائم شدہ ہے پنجاب کونسل کے انتخاب کے لئے چوہدری صاحب کے کھڑے ہونے کے موقع پر یا پہلی دفعہ وائسرائے کی کونسل کا ممبر مقرر ہونے پر ڈاکٹر صاحب نے کیوں صدائے احتجاج بلند نہ کی تھی۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ہی امام جماعت احمدیہ کا نام تجویز کیا تھا اور بااصرار التجا کی تھی کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر لیں۔ اس وقت کشمیر کے مسلمانوں کی خدمت کے لئے ڈاکٹر صاحب کو صرف حضرت ممدوح کی شخصیت ہی قابل نظر آتی تھی اور اب وہ جماعت کو غیر مسلم قرار دیتے ہیں۔ (1)

پنڈت نہرو کے خطوط۔ پہلا خط، 'اسلامی یک جہتی'

علامہ اقبال کے بیانات پر پنڈت جواہر لال نہرو نے تین خطوط ماڈرن ریویو کلکتہ کو لکھے۔ وہ اس وقت الموڑہ جیل میں نظر بند تھے۔ پہلے خط کا عنوان ہے اسلام کی یک جہتی(2) The Solidarity of Islam جو نومبر 1935ء کے ماڈرن ریویو کلکتہ میں شائع ہوا۔

پنڈت جی کہتے ہیں کہ انہوں نے سر محمد اقبال کا اسلام کی یک جہتی پر مضمون انتہائی دلچسپی سے پڑھا۔ سر محمد اقبال کی تحریریں ہمیشہ ان کے لئے باعث کشش رہی ہیں کیونکہ وہ انہیں اس دنیا میں جھانکنے کا موقع دیتی ہیں جسے سمجھنے میں انہیں دشواری ہوتی ہے۔ وہ مذہب کے تاریخی، تمدنی بلکہ فلسفیانہ پہلو میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس مضمون میں سر محمد اقبال کہتے ہیں کہ قادیانیوں نے اسلام کا بنیادی عقیدہ، ختم نبوت ترک کر دیا ہے اور کسی حد تک ابتدائی یہودیت اور قبل از اسلام مجوسی ثقافت کی طرف رجوع کر گئے ہیں، اس لئے اس باغی گروہ کو تخریب کارانہ پروپیگنڈہ کرنے اور کسی بھی صورت میں مسلمان کہلوانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ قادیانی ان کی دلیل نہیں مانتے اور ان کے بیان کو مسترد کرتے ہیں۔

سر محمد اقبال کا مضمون کئی مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ انہیں امید ہے کہ وہ (اقبال) اپنے بعض نکات کو آئندہ تحریروں میں واضح کریں گے کیونکہ ان پر مکمل بحث کی ضرورت ہے۔ پنڈت جی کہتے ہیں کہ وہ اس مضمون کے دلائل کی صحت یا عدم صحت پر اسلامی نقطہ نظر سے

بحث نہیں کر سکتے، یہ علماء کا کام ہے۔ ان کے نزدیک سر محمد اقبال اسلام پر ایک اتھارٹی ہیں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی درست نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو ان (پنڈت نہرو) کے خیال میں مصطفیٰ کمال کے زیر اقتدار ترکی کو کسی بھی مفہوم میں ایک اسلامی ملک قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مصر ان مذہبی مصلحین کے شدید طور پر زیر اثر آ گیا ہے جنہوں نے قدیم حقائق کو نیا لباس پہنانے کی کوشش کی ہے۔ ان (پنڈت نہرو) کے خیال میں سر اقبال جدیدیت کے اس رجحان کی تائید نہیں کرتے۔ شام اور فلسطین کے عرب کم و بیش مصر کی فکری رو کی تائید کرتے ہیں اور جزوی طور پر ترکی کی مثال سے متاثر ہیں۔ ایران یقینی طور پر قبل از اسلام مجوسی ثقافت سے تخلیقی تحریک حاصل کر رہا ہے۔ ان تمام ممالک بلکہ مغربی اور وسط ایشیا کے ہر ملک میں قوم پرستانہ تصورات تیزی سے نشو ونما پا رہے ہیں اور یہ تصورات خالص اور راسخ العقیدہ مذہبی نقطۂ نظر کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ سر اقبال ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلام نسلی اور جغرافیائی تصورات کی نفی کرتا ہے اور اس کی اساس صرف مذہبی تصور پر ہے، لیکن مغربی ایشیا کے اسلامی ممالک میں اب ہم نسلی و جغرافیائی تصورات کو انتہائی طاقتور صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ ترک تورانی نسل پر نازاں ہیں، ایرانی اپنی قدیم نسلی روایات پر فخر کرتے ہیں، مصری، شامی، فلسطینی، اردنی اور عراقی اس عرب اتحاد کا خواب دیکھ رہے ہیں جس میں مسلمان اور عرب عیسائی شریک ہوں۔ یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ سب قومیں اسلامی یک جہتی کے اس آئیڈیل سے دور چلی گئی ہیں جس کا سر اقبال ذکر کرتے ہیں، تو پھر آج اس اسلامی یک جہتی کا وجود کہاں ہے؟ وسط ایشیا میں نہیں کیونکہ سوویت خطوں میں راسخ الاعتقادی سے دوری بہت زیادہ ہے، چینی خطوں میں اغلباً قوم پرستانہ (تورانی) اور سوویت رجحانات کو بالادستی حاصل ہے۔ افغانستان اور عرب خاص ایشیا میں ہیں اور پھر مصر کے علاوہ شمالی افریقہ میں بہت سے اسلامی ممالک ہیں۔ ان ممالک میں مذہبی یک جہتی کا راسخ العقیدہ تصور کہاں تک موجود ہے، یہ انہیں نہیں معلوم، لیکن رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ قوم پرستی کے تصورات ان میں بھی نفوذ کر چکے ہیں اور قوم پرستی اور اسلام کی یک جہتی پہلو بہ پہلو نہیں چل سکتیں۔

سر محمد اقبال کے نقطۂ نظر سے عالم اسلام کی یہ صورت حال افسوسناک ہونی چاہیئے۔ قادیانی مسئلہ جو ان (اقبال) کے خیال میں اہم ہے ان عالمی واقعات کی روشنی میں غیر اہم ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قادیانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پنجاب میں کوئی حقیقی رہنما اٹھے۔ لیکن وہ اس بڑے خطرے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ آغا خان ہندوستانی مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ کیا وہ اسلام کی اس یک جہتی کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی واضح طور پر سر اقبال نے صراحت کی ہے۔ یہ سوالات ایک غیر مسلم کے لئے بھی بامقصد ہیں کیونکہ ان کا جواب ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی مقاصد کی واضح سمت متعین کرنے میں مضمر ہے اور یہ جواب ان جدید تصورات کے بارے میں ان کے ردعمل کا اظہار بھی ہوگا جس میں ہم میں سے بعض لوگ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسلام کی ایک عالمی برادری کی حیثیت سے ایک عالمی پالیسی ہونی چاہیئے تاکہ وہ اسلامی یک جہتی کا تحفظ کر سکے۔ سر اقبال کو ہمیں اس پالیسی کے بارے میں کچھ اشارے دینے چاہیں تاکہ ان قومی، سماجی اور معاشی مسائل کو حل کیا جا سکے جن کا ہر ملک اور ہر گروہ کو سامنا ہے۔

اپنے مضمون میں سر اقبال نے جو واحد اشارہ دیا ہے وہ منفی نوعیت کا ہے- ان کا کہنا ہے کہ مذہبی مصلحین کو دبا دیا جائے۔ وہ راسخ العقیدہ ہندوؤں سے اتفاق کرتے ہیں کہ مذہبی اصلاح میں سماجی اصلاح شامل کر دی جائے۔ وہ ایک عارضی تجویز پیش کرتے ہیں کہ دیہاتی اور شہری مسلمانوں میں تفریق ختم کر دی جائے کیونکہ یہ پنجاب میں اسلامی وحدت کے خلاف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کچھ مسلمان کاشتکار ہیں، کچھ بڑے زمیندار ہیں جو زمین کے کرایہ پر زندگی گذارتے ہیں، کچھ پیشہ ور افراد ہیں جو شہروں میں رہتے ہیں یا بینکار یا صنعتکار یا مزدور ہیں، کچھ لوگوں کے پاس زندگی کی وافر آسائشات ہیں جبکہ بہت سے بھوکے مرتے ہیں۔ غالباً یہ حقیقت ایسے ہی رہے گی اور اسلامی وحدت کو متاثر نہیں کرے گی۔ حال ہی میں قائم ہونے والی ہولی کونسل آف [illegible] اینڈ مسلم لیڈرز، جس کے سر اقبال ایک رکن ہیں کا غالباً مقصد یہی ہے کہ وہ اسلام کی وحدت اور یک

جہتی کو فروغ دے ایک بیرونی شخص کے لئے یہ بڑی عجیب بات ہے کہ برطانوی دارالامراء کے عیسائی ارکان اسلام کی ترقی اور یک جہتی میں اتنی دلچسپی رکھتے ہوں۔ لیکن اس کونسل کے قیام کے بعد کلیرج ہوٹل لندن میں جو لنچ دیا گیا اس موقع پر آغا خان نے اینگلو۔ مسلم اتحاد کے تصور کو منکشف کیا۔ غالباً یہ دو اکائیاں مل کر ایک وسیع تر وحدت کی تعمیر کریں گی۔ یہ سب کچھ الجھا ہوا ہے۔ میری خواہش ہے کہ سر اقبال اس پر روشنی ڈالیں۔(4)

پنڈت نہرو کا دوسرا خط، 'ہز ہائی نس آغا خان'

پنڈت نہرو نے ڈسٹرکٹ جیل الموڑہ سے ماڈرن ریویو کلکتہ کو دوسرا خط 21 اگست 1935ء کو لکھا جو نومبر 1935 کے شمارے میں ص 507-505 پر شائع ہوا۔ یہ خط ہز ہائی نس آغا خان کے بارے میں ہے جو اسماعیلی فرقے کے روحانی پیشوا تھے اور جنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور سیاسی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ سر اقبال کا اسلامی یک جہتی کے لئے استدلال اور ان (اقبال) کا تقسیم پسندانہ رجحانات پر احتجاج ان کے لئے باعث حیرت ہے کہ ان کے درمیان خط فاصل کہاں کھینچا جائے۔ ہز ہائی نس آغا خان کو ہندوستانی مسلمانوں کا ایک ممتاز رہنما سمجھا جاتا ہے اور حکومت ان کو اسی لئے عزت بخشتی ہے۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان رہنما مشکل میں ہوتے ہیں تو وہ آغا خان کے پناہ دینے والے پروں تلے پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سر اقبال بھی ان کے سیاسی جھنڈے تلے مارچ کرتے ہیں۔ راسخ العقیدہ اسلام کے تحت سیاست، عمرانیات اور معاشیات کو مذہب سے بمشکل ہی جدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایک عام آدمی یہی خیال کرتا ہے کہ آغا خان مذہبی عقائد کی یک جہتی کے مثالی نمائندے ہیں۔ وہ (پنڈت جی) نہیں جانتے کہ کیا حقیقتاً ایسا ہی ہے اور وہ اس سلسلے میں اہل دانش کی جانب سے آگہی کا خیر مقدم کریں گے۔ ان کے ایک عرصے سے اس بارے میں تصورات ہیں کہ آیا آغا خان راسخ العقیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر آغا خان کی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے حیرت انگیز

طریقے سے اپنی ذات میں نہایت متضاد صفات کو خوش اسلوبی سے یکجا کیا ہوا ہے۔ وہ انتہائی متضاد اور باہمی طور پر ہم آہنگ نہ ہونے والی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ ایک وسیع اور مالدار فرقے کے روحانی پیشوا ہیں۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ ان کے پیروکار انہیں تقریباً خدائی صفات کا حامل سمجھتے ہیں، ان کو بھاری نذرانے دیتے ہیں اور ان کی آمدنی کا بڑا حصہ روحانی برکات اور آخرت کی سزا کی معافی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہے کہ دنیا کی یہ قدیم رسوم آج بھی شدت سے جاری ہیں۔ لیکن حقیقتاً غیر معمولی بات یہ ہے کہ یہ روحانی پیشوا جو ان رسوم کی ہمت افزائی کرتے ہیں جدیدوں کے جدید ہیں، مغربی اطوار کے مطابق انتہائی متمدن ہیں، گھڑ دوڑ کے میدان کے شہزادے ہیں اور لندن اور پیرس میں رہ کر انتہائی خوش باش رہتے ہیں۔ ایک غیر معمولی شخصیت ہی یہ دوہرا بوجھ کامیابی سے اٹھا سکتی ہے۔ آغا خان یہ سب کچھ نہایت آسانی سے کرتے ہیں بلکہ اس میں بہت سی عوامی اور سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کی لیڈرشپ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز بازی گری ہے، چاہے کوئی آغا خان سے اختلاف کرے لیکن اس سلسلے میں وہ ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن سر اقبال کا اسلام کی یک جہتی پر بیان پڑھنے کے بعد جو سوال انہیں پریشان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس یکجہتی سے کس طرح مناسبت رکھتا ہے۔ اس بات کا جواز ہو سکتا ہے کہ اپنے پیروکاروں کی رقوم ریس پر صرف کی جائیں کیونکہ یہ ایک چھوٹا معاملہ ہے لیکن آیا آغا خان کا فرقہ اسلامی یکجہتی میں شامل ہے یا نہیں۔

پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ یہاں انہیں خاصے عرصے قبل پڑھا ہوا مارک ٹوین کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ وہ (مارک ٹوئن) بمبئی کے ایک ہوٹل میں ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک دن اس کا ہندوستانی ملازم شدید ہیجان کے عالم میں تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا اور کہا کہ خدا ان سے ملنے آ رہا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہو گیا اور جیسے ہی حیرت سے سنبھلا اس نے دیکھا کہ خدا آغا خان کی خوبصورت انسانی شکل وصورت میں آیا ہے۔

پنڈت جی کہتے ہیں یہ مارک ٹوین کے ملازم کی احمقانہ غلطی تھی، آغا خان کو اس کا ذمہ دار قرار

نہیں دیا جا سکتا۔ جہاں تک ان کی معلومات کا تعلق ہے وہ (آغا خانؒ) الوہیت کے مدعی نہیں ہیں۔ لیکن ایسے احمقوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو انہیں خدائی یا نیم خدائی صفات کی حامل سمجھتی ہے۔ اسماعیلی فرقے کے بعض لوگ انہیں اوتار یا خدائی تجسیم قرار دیتے ہیں۔ انہیں (پنڈت جی کو) اس بات پر کوئی شکایت نہیں، لیکن یہ سب کچھ اسلام کی یک جہتی سے کس طرح مناسبت رکھتا ہے؟

ایک امریکی سیاح الیگزنڈر پاول کی کتاب The Last Home of Mystery کے حوالے سے پنڈت جی لکھتے ہیں کہ آغا خان جس پانی سے غسل کرتے ہیں اسے محفوظ کر کے سونے کے عوض بیچا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ پاول نے اس سلسلے میں خیالی رنگ آمیزی کی ہو، لیکن یہ کہانی پرانی ہے اور اس کی تردید نہیں کی گئی، لیکن وہ دوبارہ حیران ہیں کہ یہ سب اسلام کی یکجہتی اور جمہوریت کو فروغ دیتا ہے۔

ایک اور واقعہ ان کے ذہن میں آتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو ملک سے باہر نکال کے ترکی میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا تھا۔ اس نے جو نیا خلیفہ مقرر کیا تھا اس سے اس کا سلوک لاپرواہی پر مبنی تھا، جس پر احتجاج ہوا۔ سید امیر علی اور آغا خان نے ترک وزیراعظم عصمت پاشا کے نام ایک خط میں انتہائی نرم لہجے میں خلیفہ کے اختیارات کے مسئلے پر احتجاج کیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو اس میں برطانوی سازش کی بو آئی اور اس نے اچانک برطانیہ، آغا خان، خلیفہ اور قسطنطنیہ کے بعض صحافیوں پر شدید تنقید شروع کر دی۔ اس نے آغا خان سے نرمی کا سلوک نہیں کیا اور برطانیہ اور حکمران طبقوں کے ساتھ ان کے طویل اور قریبی تعلقات کے حوالے سے غیر منصفانہ استنباط کیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ جب ترکی اور انگلستان کی جنگ چھڑی تو آغا خان سابق خلیفہ کے مذہبی فرمان پر عمل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس نے اس پر بھی زور دیا کہ آغا خان سچے مسلمان نہیں ہیں یا راسخ العقیدہ تو کسی طور نہیں ہیں کیونکہ کیا ان کا تعلق ایک زندیق فرقے سے نہیں ہے؟ یہ اور بہت کچھ اس نے کہا، اس کا مقصد تھا کہ آغا خان کو بدنام کیا جائے اور انہیں برطانوی خارجہ پالیسی میں شریک بنایا جائے، اور آغا خان کے احتجاج کو بہانہ بنا کر اتاترک

نے قدیم خلافت کا خاتمہ کردیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو مشکل ہی سے اسلام پر اتھارٹی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس نے جان بوجھ کر اسلام کے کئی اصولوں سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ اس کے محرکات خالصتاً سیاسی تھے لیکن اس کی تنقید بظاہر زوردار تھی۔

پنڈت نہرو نے اس کے بعد ایک اور واقعہ نیوسٹیٹس مین اخبار سے نقل کیا ہے جس میں آغا خان کے گھوڑے بہرام کے ڈربی ریس جیتنے کے بعد ایک خریدار ان سے اس گھوڑے کے لئے ایک سادہ چیک دیتا ہے تو آغا خاں اسے فروخت نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا وہ چاہتے ہیں کہ جب پیرانہ سالی میں وہ اپنی وہیل چیئر پر جا رہے ہوں گے تو ڈربی ریس جیتنے والے اس گھوڑے کو ساتھ جاتا دیکھ کر کہیں کہ وہ ایک مسرت بخش دن تھا۔

پنڈت جی کہتے ہیں کہ انہیں افسوس ہے کہ وہ آغا خاں سے کبھی نہیں ملے۔ انہوں نے ان کو صرف ایک دفعہ عدم تعاون کے دنوں میں خلافت ہاؤس (بمبئی) کے اجلاس میں دیکھا تھا۔ وہ ان سے زیادہ دور نہیں تھے لیکن اس پرکشش اور غیر معمولی شخصیت کو ایک نگاہ دیکھنے سے تسکین نہیں ہوتی اور انہوں نے اکثر یہ جاننا چاہا ہے کہ وہ کن عجیب وغریب صفات کے حامل ہیں جن کے ذریعے وہ مختلف کردار انتہائی کامیابی سے ادا کرتے ہیں۔ وہ تیرھویں صدی کو بیسویں صدی سے ملا دیتے ہیں، مکہ اور نیو مارکیٹ کو یکجا کردیتے ہیں، اِس دنیا اور اُس دنیا کو ایک کردیتے ہیں اور روحانیت، ریس، سیاست اور انبساط کو اکٹھا کردیتے ہیں۔ اسلام کا دائرہ واقعی وسیع ہوگا جس میں یہ اتحاد اور یک جہتی شامل ہیں۔ لیکن سر اقبال کے بیان پر نظر ڈالنے کے بعد وہ دوبارہ اس شک میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ انہیں (اقبال کو) تقلید نہ کرنے والوں کے ساتھ کوئی محبت نہیں۔ وہ (اقبال) راسخ العقادی کے سیدھے اور تنگ راستے پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جو اس راستے سے بھٹک جاتے ہیں انہیں اپنے آپ کو فوراً ان کے اندازِ فکر سے علیحدہ کرلینا چاہیئے۔ وہ اس شک اور مشکل کو کیسے دور کریں۔ کیا سر اقبال اس معمے کو حل کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔ (5)

پنڈت نہرو کا تیسرا خط 'تمام مذاہب کے راسخ الاعتقاد پیروکار و متحد ہو جاؤ!'

پنڈت نہرو کا تیسرا خط ماڈرن ریویو کلکتہ کی دسمبر 1935ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس خط میں پنڈت جی نے ایک جلوس کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جب وہ بنارس میں اپنی کار پر جا رہے تھے۔ اس جلوس میں کٹر برہمن اور مولوی شامل تھے اور ہندو مسلم ایکتا (اتحاد) کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ مشترکہ ایجی ٹیشن شاردا ایکٹ کے خلاف تھا یعنی 14 سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی کا حق اور حکومت کا اس کی اجازت نہ دینا جو دھرم یا مذہب کے خلاف قرار دیا جا رہا تھا۔

پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ دیوداس گاندھی اور بنارس کے چند ہندو دوست تھے۔ ہجوم نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا لیکن نہ خوش آمدید کہا اور نہ تعریفی نعرے لگائے۔ وہ کہتے ہیں نہ تو ہماری داڑھیاں تھیں نہ ہم نے مذہبی نشان لگا رکھے تھے، اس لئے ہمارے خلاف مخالفانہ نعرے لگائے گئے۔ ٹاؤن ہال کے قریب کسی نے جلوس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ ایک نوجوان نے کچھ پٹاخے چھوڑے۔ ان کی آواز سن کر مظاہرین نے خیال کیا کہ پولیس یا فوج نے گولی چلا دی ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے منتشر ہو گئے۔ شاردا ایکٹ کو ختم کرانے میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کے بعد بچپن کی شادیاں جاری رہیں۔

اس واقعے سے پنڈت نہرو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی مناقشت، مذہبی اختلافات کی بناء پر اتنی نہیں جتنی اقتصادی اور بیروزگاری کے خاتمے کی تگ و دو کی وجہ سے ہے۔ اس لئے دونوں مذاہب، ہندومت اور اسلام کے قدامت پسند لوگ یعنی پنڈت اور ملا اس تحریک کا جس کا مقصد معاشرتی، اقتصادی یا سیاسی اصلاح ہو مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جاتے ہیں اور دونوں طبقے ہر اس شخص کو جو موجودہ نظام میں کسی تبدیلی یا اصلاح کا خواہش مند ہو، اپنا حقیقی دشمن سمجھتے ہیں۔

پنڈت نہرو نے قوم پرستی اور اس عہد (1930ء کی دہائی) میں اسلامی ممالک میں ابھرنے والی نیشنلزم پر مبنی تحریکات کی مثال دے کر یہ تاثر دیا ہے کہ ملی استحکام اور وحدت اسلامی کا تصور ختم

ہوتا جارہا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسماعیلی فرقے کے عقائد اور اعمال اس یک جہتی کے منافی ہیں، اگر قادیانی اس جرم میں شریک ہیں تو اسماعیلی ان سے بڑھ کر ہیں۔

علامہ اقبال نے بڑے احسن انداز اور مثبت دلائل سے پنڈت جی کے سوالات کا جواب دیا ہے۔ اپنے جواب کے آخر میں علامہ نے روزنامہ اسٹار الہ آباد کے حوالے سے سر آغا خان کا بیان مطبوعہ 21 مارچ 1934ء نقل کیا ہے جس کے مطابق اسماعیلی فرقے کے عقائد وہی ہیں جو مسلمانوں کے معتقدات ہیں اور ان سے وحدت ملی میں رخنہ نہیں پڑتا۔

علامہ اقبال کا بنیادی نقطہ نظر

علامہ اقبال نے پنڈت نہرو کے ماڈرن ریویو کلکتہ میں لکھے گئے خطوط کے جواب میں 22 جنوری 1936ء کو ایک تفصیلی مضمون اسلام اینڈ احمد ازم کے عنوان سے لکھا۔ اس سلسلے میں سید نذیر نیازی نے علامہ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے بڑی نفیس بحث کی ہے۔ ہم اسے انہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

حضرت علامہ [اقبال] جماعتِ احمدیہ کے مخصوص عقائد پر تبصرہ فرماتے تو بمقابلہ امت اس کی سیاسی روش زیر بحث آتی۔ کسی سیاسی جماعت، کسی مذہبی فرقے یا ارباب سیاست میں سے کسی کی طرف اشارہ کرتے تو اس نقطۂ نظر کے ماتحت جو انہوں نے ارضِ پاک و ہند کی سیاست میں مسلمانوں کی شرکت، ان کے طرزِ عمل اور مستقبل کے بارے میں قائم کیا۔ ہمیں معلوم ہے اس نقطۂ نظر کا تعلق اسلام سے تھا، محض اختلاف مذہب و ملت، یا کسی وقتی اور مقامی مفاد و مصلحت سے نہیں تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ ارض پاک و ہند میں دو آزاد ریاستیں قائم ہوں ایک ہندو، دوسری اسلامی۔ یہ دوسری، یعنی اسلامی ریاست اس لیے کہ بہ حیثیت ایک اجتماع اسلام نے نوع انسانی کے حفظ و استحکام اور مسلسل نشوونما کے لئے ایک مخصوص نقطۂ نظر اختیار کیا۔ اسلام کی بصیرت یہ ہے کہ نوع انسانی کا مستقبل جو اساساً ایک ہے اس عالمگیر معاشرے کے قیام واستحکام سے وابستہ ہے جس کا وظیفہ یہ ہے کہ بطور ایک سیاسی اجتماعی تنظیم کے ان احوال و ظروف پر نظر رکھے جو تہذیب و ترقی کے

مساعد ہیں اور جن کے بغیر ناممکن ہے کہ فرد ہو یا جماعت اس کا قدم مراتب حیات میں آگے بڑھ سکے۔ لہٰذا حضرت علامہ کا ارشاد تھا کہ مسلمان اگر اس نکتے کو سمجھ گئے ہیں کہ امت ایک سیاسی اجتماعی ہیئت ہے، اگر انہیں معلوم ہے کہ دین عبارت ہے اس نظام حیات سے جو اس عالمگیر معاشرے کا مُقوّم اور صورت گر ہے لہٰذا امت اس کی تمہید، تو دو خطرے ہیں جن کا سدباب ہوتے رہنا چاہیئے، ایک اصولی کہ امت کی اساس جس عقیدے پر قائم ہے اس کی تعبیر و تاویل میں کسی ایسی روش کو راہ نہ ملے جس سے اس کی وحدت میں فرق آئے، یا جس سے اس کی مرکزیت اور جمعیت میں خلل پیدا ہو، بالفاظ دیگر امت میں امت در امت یا نئی نئی گروہ بندیوں کا جواز نکلتا رہے۔ ایسا ہوا تو یہ امر امت کے دوام و استحکام کے منافی ہوگا۔ دوسرا خطرہ عملی ہے اور وہ یہ کہ بطور ایک نظام حیات اسلام عبارت ہے جس ہمہ گیری اور کلیت سے، علی حالہ قائم رہے۔ ایسا نہ ہو ہم اسے محض ایک نظام اعمال و عقائد میں محدود کر دیں، حالانکہ اعمال و عقائد ہی وہ اساس ہے جس پر اسلام نے دین کی عمارت تیار کی اور دین کی غرض و غایت جیسا کہ ہمیں معلوم ہے یہ ہے کہ زندگی کی ساری وسعتوں کو ہر پہلو اور ہر جہت سے سمیٹتے ہوئے ایک مخصوص و متعین نصب العین پر مرتکز کر دے جس کا حصول ظاہر ہے بجز ایک ہمہ گیر جدوجہد کے ممکن نہیں۔ چنانچہ یہی جدوجہد ہے جسے ہم اقامت دین سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی ہمہ گیری اور کلیت میں فرق آ گیا، یا یوں کہیئے کہ اس نے اجزائے حیات کی شیرازہ بندی جس تعمیری مقصد کے لئے کی، قائم نہیں رہی تو اس کی وحدت لازماً اس ثنویت سے بدل جائے گی جسے دین و دنیا یا اصطلاحاً ریاست اور کلیسا کی تفریق کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ امر بھی اسلامی تعلیمات کے منافی ہوگا۔ یہ دو خطرے تھے، ایک اندرونی، دوسرا بیرونی جن میں ایک طرف حضرت علامہ کا روئے سخن ان حضرات سے تھا، علماء ہوں یا غیر علماء جو دانستہ یا نادانستہ، یا کسی عارضی مصلحت کے خیال سے وطنی قومیت کا رستہ اختیار کرتے ہوئے دین کو مذہب کا مترادف قرار دے رہے تھے، دوسری جانب جماعت احمدیہ سے جسے مان لینا چاہیئے کہ امت کی وحدت، مرکزیت اور جمعیت کا عمل ختم رسالت کی بدولت ہمیشہ کے لئے مکمل ہو گیا۔ امت اسلامیہ میں کہ نوع انسانی کی

آخری گروہ بندی ہے اب کسی گروہ بندی کی خواہ اس کے لئے کوئی بھی عذر پیش کیا جائے گنجائش نہیں۔ گنجائش پیدا کی گئی تو یہ ایک نئی امت کی تمہید ہوگی جس سے نہ صرف امت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، وہ اس فریضے کی ادائیگی سے قاصر رہے گی جس کے لئے اس کی تشکیل ہوئی، بلکہ ہم یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے کہ بہ حیثیت ایک دین اسلام کی دعوت کیا ہے [اور اس کا] مقصود و منتہا کیا[ہے۔] حضرت علامہ چاہتے تھے جماعت احمدیہ اور نہیں تو اسی تفریق ہی سے سبق حاصل کرے جو محض 'خلافت' کے نزاع میں چند سال پہلے خود اس کی صفوں میں رونما ہو چکا ہے۔ وہ سمجھ لے احمدیت کی تعلیمات میں اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ اس کے اندر بھی کوئی ایسی گروہ بندی ظہور کرے جس سے اس کی موجودہ گروہ بندی کا خاتمہ ہو جائے۔ پھر اگر پاکستان کی جدوجہد محض اس لئے کی گئی کہ وہ سیاسی اجتماعی ہیئت قائم ہو جسے ہم اسلامی ریاست سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کی ہستی جس متحد الخیال اور متحد العمل معاشرے سے وابستہ ہے اس میں نہ تو مذہب اور سیاست میں امتیاز کی گنجائش ہے، نہ باہم گر متخالف اور متحارب گروہ بندیوں، نہ کسی ایسی نئی گروہ بندی کی جو امت سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے باوجود اساساً اس کی نفی کر دے۔(6)

پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں تین خطوط کیوں لکھے؟

پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں نومبر۔دسمبر 1935ء کے ماڈرن ریویو میں جو تین خطوط لکھے ان کے کئی محرکات تھے جن میں ایک بڑا محرک پروفیسر کوپ لینڈ نے بیان کیا ہے۔

پروفیسر آیان کوپ لینڈ (Ian Coupland) مونشا یونیورسٹی آسٹریلیا میں پروفیسر تھے۔ رسالہ Pacific Affairs جلد 54 شمارہ نمبر 2 برائے دسمبر 1981ء میں ان کا ایک تحقیقی مقالہ Political Mobilization in Kashmir 1931-34 کے عنوان سے شائع ہوا۔

ان کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1934ء کے لگ بھگ کشمیر کمیٹی جیسے ادارے ختم ہو گئے تھے۔ قادیانیوں نے اپنی نئی تنظیم آل انڈیا کشمیر ایسوسی ایشن بنا لی جس نے کشمیر میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ شیخ عبداللہ نے احمدیوں سے روابط مضبوط سے مضبوط تر کئے اور انڈین نیشنل کانگریس

سے تعلقات پیدا کیے۔ مرزا محمود کے مشورے پر کشمیر میں چلائی جانے والی سول نافرمانی کی تحریک (1934ء) کو ختم کر دیا گیا کیونکہ قادیانیوں کو ڈر تھا کہ اس تحریک کی حمایت سے وہ برطانوی ہمدردیاں کھو دیں گے۔ کانگریس کشمیر میں شیخ عبداللہ کی سرگرمیوں میں 1931ء سے دلچسپی رکھتی تھی اگر چہ اس کی ہمدردیاں ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ تھیں۔ کانگرسی لیڈروں میں پنڈت نہرو شیخ عبداللہ کی سیاسی بصیرت کے قائل تھے۔ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس نومبر 1934ء کے خاتمے کے بعد شیخ عبداللہ نے لاہور آکر پنڈت نہرو اور کانگریسی رہنماؤں سے روابط پیدا کیے اور نیشنلسٹ خیالات اپنانے کا اعلان کیا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز بھی ان کے ہمنوا بن گئے اور انہوں نے سری نگر سے اخبار ہمدرد جاری کیا تا کہ ان خیالات کا پرچار کیا جاسکے۔ مسلم کانفرنس کے چوتھے اجلاس اکتوبر 1935ء کے بعد متحدہ قومیت کے علمبردار کشمیری ہندو شیخ عبداللہ کے بہت قریب ہوگئے، یہاں تک کہ سردار بدھ سنگھ، لالہ گردھاری لال آنند، درگا پرشاد دھر، پنڈت کاشی ناتھ، پنڈت شیام لال صراف، جے این زتشی وغیرہ شیخ صاحب کے خصوصی کارکن اور ہمنوا بن گئے۔ انہوں نے بڑے زور شور سے قوم پرستانہ نظریات اور متحدہ قومیت کا پرچار شروع کر دیا۔ ہندوؤں کا تعاون اتنا بڑھا کہ 8 جون 1936ء کو انہوں نے قوم پرست مسلمانوں کے ساتھ مل کر یوم ذمہ دار اسمبلی منایا۔ آخر کار مسلم کانفرنس نیشنل کانفرنس بن گئی۔

پنڈت نہرو نے 1935ء کے آخر میں احمدیوں کے دفاع میں ماڈرن ریویو کلکتہ کو تین خطوط لکھ کر ڈاکٹر اقبال اور دوسرے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے اعتراضات کا جواب دیا۔ اس سے قادیانیوں اور شیخ عبداللہ دونوں کو تقویت ملی جن کا طویل عرصے سے گٹھ جوڑ تھا۔ قادیانیوں کی کشمیر میں گرتی ہوئی سیاسی ساکھ سنبھل گئی اور ان کو اپنی نئی جماعت کشمیر ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے تبلیغی سرگرمیاں تیز کرنے کا موقع ملا دوسرے شیخ عبداللہ نے کھل کر کانگریس کی پالیسی اپنانے کا اعلان کیا۔ اخبار الفضل قادیان کشمیر میں بڑی تعداد میں تقسیم ہوتا تھا۔ اس میں پنڈت نہرو کی بہت تعریف کی جارہی تھی کیونکہ انہوں نے احمدیوں کی وکالت کی تھی۔ 29 مئی 1936ء کو پنڈت نہرو کا لاہور

سٹیشن پر ایک قادیانی تنظیم نیشنل لیگ نے زبردست استقبال کیا اور ان کے حق میں فخر وطن، فخر قوم کے نعرے لگائے اس طرح 1936ء کے وسط میں قادیانی اور شیخ عبداللہ جو ایک ہی کشتی کے سوار تھے کانگریس کی گود میں چلے گئے۔

ایان کوپ لینڈ لکھتا ہے کہ اس کے بعد پنڈت نہرو نے احمدیوں کی حمایت ترک کر دی جیسا کہ ان کے ڈاکٹر اقبال کے ساتھ خطوط کے تبادلے سے ظاہر ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا شیخ عبداللہ کے ساتھ تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑا جیسا کہ پنڈت نہرو کے علامہ اقبال کے نام خط مرقومہ 18 جون 1936ء اور علامہ اقبال کے جواب (21 جون 1936ء) سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے خط میں علامہ اقبال نے احمدیوں کو اسلام اور ہندوستان کے غدار کہا۔

پنڈت نہرو کا دوسرا مقصد مسلمانوں کی قادیانیت مخالف تحریک کا رخ اسماعیلیت کی طرف موڑنا تھا۔ ہندو پریس آغا خان کے خلاف وقتاً فوقتاً مضامین شائع کرتا رہتا تھا۔ 1928ء کے بعد یہ سلسلہ تیز کر دیا گیا کیونکہ دسمبر 1928ء میں نہرو رپورٹ کے خلاف ایک آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت کے لئے آغا خان کو فرانس سے آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ گول میز کانفرنسوں کے دوران بھی آغا خان نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ کیا اور ان کی نمائندگی کی۔ کانگریس ان کے خلاف تھی۔ نہرو ان کی سیاسی حیثیت کو مجروح کرنا اور مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد میں ان کی مساعی میں روڑے اٹکانا چاہتے تھے۔ اسماعیلی مسلم لیگ کی مالی امداد بھی کرتے تھے جو 1930ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں انتشار کا شکار تھی۔ آغا خان نے 21 مارچ 1934ء کے اخبار سٹار، الہ آباد میں اسلام کے بنیادی عقائد کو تسلیم کرنے سے متعلق ایک بیان شائع کروا کر اپنے خلاف اٹھنے والی مخالفت کو دبا دیا۔ چاہے یہ بیان تقیہ کی بناء پر ہی ہو جو اسماعیلیت میں جائز ہے، بہر حال اس کا مثبت اثر ہوا۔

پنڈت نہرو اشتراکیت کے حامی تھے اس لیے انہوں نے طنزیہ انداز میں ہندوستان کے تمام راسخ العقیدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہونے کا مشورہ دیا تا کہ وہ متحد ہو کر معاشی اور سماجی اصلاح

کے پروگرام کو ناکام بنادیں۔ ان کا خیال تھا کہ ذاتی مفاد کے لیے ہندو برھمن اور مسلمان ملاّ آپس میں متحد ہو جاتے ہیں، ویسے ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ایسے اتحاد کو غیر مستحکم، منفی اور اشتراکیت اور متحدہ قومیت کی روح کے منافی سمجھتے تھے۔

پنڈت نہرو نے اسلامی ممالک میں ابھرنے والی 1930ء کی دہائی کی قوم پرستانہ تحریکات کی سیاسی اہمیت پر زور دیا اور ان کو اس ملی وحدت اور اسلامی استحکام کے منافی قرار دیا جس کا علامہ اقبال پرچار کر رہے تھے۔ ان کی تنقید اس عہد کی اسلامی دنیا کے تناظر میں کسی قدر و قیمت کی حامل سمجھی جا سکتی تھی لیکن حالات کے تغیر کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ علامہ اقبال نے قادیانیت کا جس انداز سے فکری محاسبہ کیا اور جن حقائق کی نشاندہی کی ان کی صداقت اب تک قائم ہے اور ان ہی کے مطالبے کو 1974ء میں عملی شکل دی گئی۔

بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں:

''ان مضامین کے لکھنے کے مختلف محرکات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان دنوں ہندوستان (قبل تقسیم) میں سیاسی ہلچل تھی نئے آئین کے تحت انتخابات کی تیاریاں ہر طرف ہو رہی تھیں۔ مسلم لیگ کا نیا دور شروع ہو رہا تھا بدقسمتی سے مسلمانوں میں ہر جگہ انتشار نمایاں تھا۔ قادیانی جماعت نے کانگریس سے گفت و شنید شروع کر رکھی تھی تاکہ مستقبل کے ہندوستان میں انہیں کوئی مخصوص مقام حاصل ہو سکے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ اقبال نے اپنے ایک خط بنام پروفیسر الیاس برنی (مولف قادیانی مذہب) مورخہ 27 جون 1936ء میں لکھا۔

''آپ نے مرزا محمود کا تازہ بیان پڑھا ہوگا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ پیغمبر قوموں کو آزادی دلانے کے لیے آتے ہیں نہ کہ غلامی سکھانے کے لئے۔ اس بناء پر اپنے پیروؤں کو سیاست میں حصہ لینے کی تاکید کی ہے۔ (اقبال نامہ حصہ اول ص 8-417)

پنڈت نہرو کا خیال ہوگا کہ قادیانیوں کی حمایت سے وہ مسلمانوں کے انتشار میں اضافہ کر سکیں گے۔(7)

پنڈت نہرو کے دیگر مقاصد کی علامہ اقبال نے اپنے جواب میں وضاحت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قادیانی اور پنڈت جی دونوں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے خصوصاً وہ نہیں چاہتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساس خود مختاری پیدا ہو۔ وہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کو بھی پسند نہیں کرتے۔

پنڈت نہرو نے قادیانیوں کی حمایت کر کے ان کو احساس دلایا کہ کانگریس جیسی قوم پرست اور سیکولر نظریے کی حامی جماعت کے جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت میں وہ اپنے عقیدے کا پرچار کر سکتے ہیں اور امن و آزادی کے ساتھ رہ سکتے ہیں، جہاں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا غلبہ ہو وہاں ان کے عقیدے، دینی نظریات اور وجود کو مسلسل خطرات درپیش رہیں گے اس طرح ان کی اقتصادی ترقی اور سیاسی مفادات متاثر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قادیانی 1936ء کے بعد کانگریس کے ہمنوا، متحدہ ہندوستان کے حامی اور تحریک پاکستان کے مخالف رہے اور قیام پاکستان کے بعد سیکولر اور سوشلسٹ عناصر سے مل کر ملک عزیز کی نظریاتی اساس، سلامتی اور یک جہتی کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

عبدالمجید سالک کا نقطہ نظر

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

''[علامہ اقبال کے مضامین] پر خدا جانے پنڈت جواہر لال نہرو کو کیا سوجھی، انھوں نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں تین مضامین ''مسلمان اور احمدیت'' کے موضوع پر گھسیٹ ڈالے۔ چوں کہ ان مضامین میں بے خبری اور جہالت فقرے فقرے سے ظاہر تھی اور اصل مقصد محض فتنہ خیزی اور افتراق انگیزی تھا، اس لیے علامہ اقبال نے پنڈت جی کے جواب میں ایک جامع مانع مضمون لکھا، جس میں اس مسئلے کا فلسفیانہ تجزیہ کر کے نہایت فاضلانہ انداز میں پنڈت نہرو کے ایک ایک فقرے کا جواب دیا۔ اس کے بعد پنڈت جی خاموش ہو گئے۔ ان مضامین کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے انتہائی اشتعال اور ناراضی کی حالت میں بھی بانیِ احمدیت، امام جماعت احمدیہ

اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین وسنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں میں علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کیے ہیں جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا''۔ (ذکرِ اقبال، ص 211)

یہ کہنا کہ پنڈت جی کے مضامین میں بے خبری اور جہالت فقرے فقرے سے ظاہر تھی، زیادتی ہے۔ پنڈت جی نے اپنے خیال میں جو مناسب سمجھا وہ لکھا، اس کی ایک قدر و قیمت ہے لیکن علامہ اقبال نے نہایت عمدہ طریقے سے ان کے دلائل کو رد کر دیا۔

علامہ اقبال کے مضمون پر قادیانی جریدے ریویو آف ریلی جنز کا تبصرہ (مارچ 1936ء)

علامہ اقبال نے پنڈت نہرو کے اعتراضات کے جواب میں جو مضمون لکھا اس کی تردید میں الفضل قادیان نے 20 فروری سے 23 جون 1936ء تک ایک سلسلہ مضامین چودہ قسطوں میں شائع کیا۔ قادیانی پرچے ریویو آف ریلیجنز نے مارچ 1936ء کے شمارے میں ایک طویل مضمون 'ڈاکٹر اقبال اینڈ دی احمدیہ موومنٹ' شائع کیا۔ اس مضمون میں مدیر ریویو نے جو اہم باتیں لکھیں ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

علامہ اقبال کا مضمون اخلاص اور دیانت کی بجائے سیاست کے زیر اثر ہے۔ وہ احمدیہ نقطہ نظر کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ اسماعیلیوں کے جو عقائد ہیں ان کی بنیاد پر وہ اسلامی استحکام میں شریک نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں میں ملی وحدت ہے ہی نہیں۔ اقبال خود ایسا رہنما بننا چاہتے ہیں جس کا انہوں نے ذکر کیا ہے اور یہی احمدیہ جماعت سے جھگڑے کی بنیاد ہے۔ مسیح و مہدی کے بارے میں پیش گوئیاں موجود ہیں ان کا آنا ضروری ہے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر مسلمانوں نے اسلامی عقائد کے بارے میں دفاعی پوزیشن اختیار کی اور آریوں اور عیسائیوں نے جس زمانے میں اسلام پر اعتراض کیے اس وقت اقبال بچے تھے۔ سرسید، سید امیر علی، خدا بخش، مفتی عبدہٗ چراغ علی، شبلی نعمانی وغیرہ نے اسلام کا دفاع کیا لیکن مرزا غلام احمد نے دفاع کے ساتھ ساتھ جارحانہ طرز عمل اختیار کیا۔ خطبات مدراس میں ڈاکٹر اقبال نے اسلام کو درست طور پر پیش نہیں کیا۔

اس کے بعد ریویو ختم نبوت، آمد مسیح اور مرزا صاحب کے دعاوی کے متعلق مذہبی بحث کرتا ہے اور کہتا ہے کہ احمدی برطانیہ کی امن پسندی کے باعث جہاد کے خلاف ہیں اور ہندوستان کو دارالسلام سمجھتے ہیں انہوں نے سیاسی غلامی قبول نہیں کی حکومت انہیں تحفظ اور مذہبی آزادی فراہم کرتی ہے۔ احمدی نئی زمین اور نیا آسمان بنائیں گے۔(8)

علامہ اقبال کے مضمون 'اسلام اور احمد ازم' پر سید نذیر نیازی نے بہت عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں پنڈت نہرو نے جو اعتراضات پیش کیے ان کے نتیجہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی وحدت اور حفظ و استحکام کا دارومدار کس اصول پر ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر یہ سوال اٹھا کہ آخر مسلمان کون ہے اور کون نہیں؟ یہ سوال مذہبی بھی تھا اور سیاسی بھی۔ اس کے جواب کے لئے مذہب اور سیاست دونوں پر نظر رکھنی ضروری تھی اور یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ اسلام بیک وقت دونوں کا جامع ہے مگر لوگ اس کا جواب یا تو سیاسی پہلو سے دیتے یا مذہبی پہلو سے لہٰذا یہ مسئلہ اور الجھتا چلا گیا۔

شروع شروع میں یہ نزاع صرف پنجاب تک محدود تھا پھر اس کی غیر معمولی اہمیت کے تحت بعض ایسے حقائق کی تشریح ناگزیر ہو گئی جن کا تعلق اس وقت کی سیاست سے ہر لحاظ سے گہرا تھا تو مجبوراً علامہ اقبال کو ایک بیان دینا پڑا اس طرح اس نزاع نے ایک ملی اور قومی مسئلے کی شکل اختیار کر لی۔

اس بیان پر اخبارات و رسائل نے طرح طرح کے سوالات اٹھائے یہ اس لیے تھا کہ علامہ اقبال نے ایک ایسے نزاع کا سلسلہ جو بظاہر مذہبی عقیدے تک محدود تھا سیاست و اجتماع سے علیٰ ہذا اس وقت کی آئینی جدو جہد سے جوڑ دیا تھا جس سے ہندوستان (غیر منقسم) کی ساری ملت متاثر ہوتی تھی۔ انہوں نے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ علیٰ ہذا وحدت امت کی تعبیر ایک ایسے رنگ میں کی تھی جو سرتاپا درست ہی نہیں بلکہ اس اصول قومیت کے بھی منافی تھی جو کانگریس نے مغربی افکار سیاست سے اخذ کیا تھا۔ مگر یہ بات کانگریس کے عزائم، مقاصد اور تدابیر کے سرتاسر خلاف تھی۔ لہٰذا بیان شائع ہوا تو پنڈت جواہر لال نہرو خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی کچھ دنوں کے بعد ایک بیان

شائع کر دیا جس میں اپنے مخصوص خیالات اور تصورات کے ماتحت حضرت علامہ کے ارشادات پر تنقید کرتے ہوئے مذہب اور سیاست دونوں کو زیر بحث لے آئے۔

حضرت علامہ کے بیان کی اشاعت کے بعد بعض تصریحات کا حقیقی سبب تو وہ نزاع تھا جو بدقسمتی سے مجلس احرار اور جماعت احمدیہ کے درمیان مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں جاری تھا۔ لیکن اس نزاع کے دوران میں چونکہ وحدتِ امت کا مسئلہ بھی زیر بحث آ جاتا تھا لہٰذا اس امر کی تشریح لازم آتی تھی کہ اسلام کا نقطہ نظر سیاست و اجتماع اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں کیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بحثیں محض علمی اور فلسفیانہ تھیں۔ لیکن اُن کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جس سے اس وقت کی عملی سیاست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

ہندو اکثریت کا مفاد غالباً اس میں تھا کہ مسلمانوں کے اندر اگر عقیدۃً کچھ فرقے موجود ہیں تو جس طرح بعض مذہبی امور میں ان کا اتحاد و اشتراک ناممکن ہے، بعینہ سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے بھی اگر وہ مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کی وفاداریاں بٹ جائیں تو اس میں ازروئے مذہب کیا خرابی ہے۔ کیونکہ مذہب تو نام ہے انسان کے ذاتی عقیدے کا۔ بلکہ اگر یہ نقطہ نظر قبول کر لیا جائے تو وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ اس طرح عین ممکن ہو گا کہ ان میں سے کوئی جماعت، اسلامی اکثریت کے صوبوں میں بھی اپنی جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے لگے۔ مثلاً پنجاب ہی میں جہاں تین ملتیں یا تین قومیں۔ ہندو، مسلمان اور سکھ پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں اگر ایک یا دو ملتوں کا اضافہ ہو جائے اور وہ جداگانہ نیابت پر اصرار کریں تو اس پر اعتراض کی کونسی بات ہے، حالانکہ مذہب ہو یا سیاست جس پہلو سے دیکھا جائے مسلمانوں کی وحدت ملی علیٰ ہذا اس ملک میں ان کے مستقبل کے لئے یہ چیز بڑی خطرناک تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی مسئلہ زیر بحث کے ان پہلوؤں کو تو گویا بین السطور میں رکھا لیکن متن میں بڑے علمی انداز میں اور بظاہر سیاسیات سے بے تعلق ہو کر حضرت علامہ کے ارشادات پر تنقید اس طرح کی جس سے بعض اسلامی حقائق بہت بری طرح مجروح ہوتے تھے اور جس کے پیش نظر حضرت علامہ مجبور ہو

گئے کہ ان عمرانی، اخلاقی اور مذہبی حقائق سے پردہ اٹھائیں جن پر گویا بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام کی عمارت کھڑی ہے اور جو اگر غیر واضح رہ جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ بجائے خود ایک سیاست واجتماع اور ایک مستقل تہذیب ہے، غلط ہے۔

اس پر طرۂ یہ کہ پنڈت جی نے اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے باوجود ان مسائل پر جس انداز میں رائے زنی کی تھی وہ بڑا ناگوار تھا اور اس لیے حضرت علامہ کو دلی رنج کے ساتھ پنڈت جی کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا۔ میں لاہور ہی میں تھا جب پنڈت جی کا یہ بیان زیر بحث آیا اور تعجب ہوا کہ انہوں نے بطور ایک نظام حیات اسلام کو سمجھنے کی کوشش تو کی نہیں برعکس اس کے غلط خیالیوں اور غلط بیانیوں کا ایک طومار باندھ دیا۔ دراصل پنڈت جی نے بلاوجہ ایک ایسی بحث میں دخل اندازی کی تھی جس کے وہ اہل نہیں تھے۔ ان کی روش بھی طالب علمانہ نہیں تھی بلکہ معترضانہ تھی یوں بھی ان کا خطاب ایک طرح سے حضرت علامہ ہی سے تھا اور اس نے حضرت علامہ کے لئے بجز اس کے کہ ان سب حقائق کی تشریح فرمائیں جن کی طرف پنڈت جی نے اشارہ کیا تھا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ پنڈت جی کے بیان کو بے جواب چھوڑ دینا ایک طرح سے اعتراف شکست تھا جس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچتا۔ لہٰذا کچھ دنوں کی رد وکد کے بعد حضرت علامہ نے فیصلہ کیا کہ ایک طویل بیان شائع کریں۔ حالانکہ انہیں آرام کی سخت ضرورت تھی...... یہی بیان ہے جو بعد میں 'اسلام اور احمدیت، کے عنوان سے شائع ہوا'' (9)

خضر تمیمی نے اس مضمون اسلام اینڈ احمدازم کے شائع ہونے کے بعد علامہ اقبال سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ تمیمی صاحب کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا '' قادیانیت اور اس کے بانی کی مختلف تحریروں اور دعاوی کے پیش نظر ثانی الذکر کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لئے بہت موزوں ہے۔ صوفی صاحب (غلام مصطفےٰ تبسم) بولے کہ آپ سے بڑھ کر موصوف کا تجزیہ نفسی کون کر سکے گا، ارشاد ہوا کہ موضوع واقعی دلچسپ ہے لیکن صحت کی خرابی مانع ہے کوئی نوجوان اس کام کے لئے اٹھے تو اس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کروں گا۔

اس کے بعد آپ نے ان نقصانات کو گنایا جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں مذاہب عالم کو برداشت کرنے پڑے...... آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانیت کی تعلیم اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے کس طرح منافی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات پر آپ نے ظاہر فرمایا کہ قادیانیت کے ارکان اعلیٰ اسلاف صالحین کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں۔

مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور کا ذکر درمیان میں آتا رہا۔ آخر کار میں نے عرض کیا کہ آپ مسئلہ ختم نبوت پر کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا الیوم اکلمت لکم دینکم انھم کی صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی"۔(10)

قادیانیوں نے جس قدر مضامین علامہ اقبال کے مضامین کے جواب میں لکھے ان میں کسی مضمون میں انکے علمی اور ٹھوس دلائل کا رد نہیں ہے۔ ان تبصروں کا انداز معذرت خواہانہ ہے کہیں کہیں علامہ اقبال کی ذات گرامی پر تنقید ہے زیادہ زور مرزا صاحب کی صداقت اور ان کی اسلام کے لئے نام نہاد خدمات پر دیا گیا جو ان کے دعاوی کا ثمر بتایا گیا۔ احمدیہ جماعت کو اس بات سے خوشی اور اطمینان تھا کہ پنڈت نہرو جیسے فاضل اور صدر کانگریس نے اقبال کے مضامین کا جواب دیا ہے۔ قادیانیوں نے پنڈت نہرو کی لاہور آمد پر ان کے حق میں فخر وطن فخر قوم کے نعرے لگائے۔ وہ ان کے خیالات میں اپنی صداقت اور دفاع ڈھونڈتے رہے اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ پنڈت نہرو جیسے شخص کے جوابات کے بعد علامہ اقبال کے مضامین کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ لیکن اہل علم حضرات اور تعلیم یافتہ طبقے نے قادیانی تبصروں اور مضامین کو کوئی اہمیت نہ دی اور علامہ اقبال کے مثبت علمی دلائل کی روشنی میں انہیں پہلی بار ختم نبوت کی تمدنی اہمیت اور تحریک قادیانیت کے مذہبی اور سیاسی مضمرات سے کماحقہ شناسائی حاصل ہوئی۔

ایک اہم قادیانی بزرگ نے راقم کو بتایا کہ علامہ اقبال کے ان مضامین کی اشاعت کے وقت وہ قادیان میں تھے۔ جماعت کا ان کے خلاف سخت ردعمل تھا لوگ اقبال کو بہت برا بھلا کہتے تھے۔ بعض قادیانی اکابر کی تجویز تھی کہ ان مضامین کا جواب مشہور قادیانی مناظر یا چوہدری ظفر اللہ دیں

لیکن چوہدری صاحب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہونے کے باعث اس بحث میں الجھنے سے قاصر تھے۔ قادیانیوں نے الزام لگایا کہ اقبال احراری ہو گیا ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کا لیڈر بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ قادیانی اور لاہوری جماعت کے وہ افراد جن کی علامہ اقبال سے شناسائی تھی ایک مشترکہ وفد تشکیل دے کر ان کے پاس جانا چاہتے تھے، تاکہ ان کو احمدیہ لٹریچر پیش کریں اور اس بات پر قائل کریں کہ اگر وہ ان مضامین سے دستبردار نہیں ہوتے تو کم از کم بعض باتوں کی تشریح کر دیں اور بعض کی تردید میں ایک بیان جاری کریں لیکن اس تجویز پر عمل نہ کیا گیا۔ دراصل قادیانی علامہ اقبال کے مضمون کو اختلافی بنا کر اس کی وقعت کم کرنا چاہتے تھے آخر کار انہوں نے 1950ء کی دہائی میں ایک سازش کی، لیکن ناکام ہوئے ۔اس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال کے مضمون کے خلاف قادیانیوں کا شرانگیز پروپیگنڈا

1950ء کی دہائی کے اوائل میں قادیانیوں نے الفضل ربوہ میں یہ شرانگیز مہم شروع کی کہ علامہ اقبال کا مضمون Islam and Ahmadism جو پنڈت نہرو کے تین خطوط کے جواب میں ہے انہوں نے تحریر نہیں کیا تھا۔ الفضل نے اس سلسلے میں بعض اداریے تحریر کئے اور داخلی شواہد کی آڑ لے کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ علامہ اقبال کا مضمون ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا نے قادیانی دجل وفریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے ایسے سامان پیدا کئے کہ ان کا منہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ ہم اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

لاہور کے ایک معزز کشمیری خاندان کے تین تعلیم یافتہ افراد تھے۔ ان کے اسمائے گرامی خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش تھے۔ ان کی کوٹھی للی لاج تھڑیاں بھابھڑیاں میں تھی جو بازار حکیماں اور سید مٹھا بازار کے درمیان واقع ہے، ان میں سے خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے کے۔اے وحید (خواجہ عبدالوحید) کو تقریباً 30 سال تک علامہ اقبال کی نیازمندی کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے اپنے شب و روز کا حال بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔اس کی تلخیص پیش کی

جاتی ہے:

1934ء میں انجمن خدام الدین لاہور نے ایک انگریزی پندرہ روزہ 'اسلام' کا اجراء کیا اور اداریہ نویسی کا کام انہیں سونپا گیا۔ پرچے پر خواجہ محمد رشید وائیں کا نام بطور ایڈیٹر چھپتا تھا، جن کا لاہور کے معروف آسٹریلیا خاندان سے تعلق تھا۔خواجہ وحید چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لئے کسی پرچے کے ڈیکلریشن کی درخواست نہ دے سکتے تھے۔ وہ پندرہ روزہ اسلام کے لیے اہم ملی مسائل پرعلامہ اقبال کے بیانات حاصل کرتے رہتے تھے۔ وہ جریدہ اسلام کے اداریوں کے لئے اکثر اوقات علامہ اقبال سے ہدایات بھی لیتے تھے۔کبھی کبھی خواجہ وحید یہ چاہتے تھے کہ وہ علامہ سے ان مسائل پر ڈکٹیشن لیں جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں حل طلب تھے۔ 1930ء کی دہائی میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قادیانی مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کئے ہوئے تھا اور علامہ اقبال اس بحث میں پوری طرح شامل ہو گئے تھے۔ ان کے بیانات اور خطوط مشہور اخبارات میں چھپ رہے تھے۔ اب علامہ نے سوچا کہ اس مسئلہ پر ایک جامع مضمون لکھا جائے اور یہ رائے دی کہ خواجہ وحید اس کو ایک ہی قسط میں رسالہ اسلام میں شائع کریں۔ خواجہ وحید لکھتے ہیں علامہ نے انہیں اپنا مسودہ دیا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں اس کو ٹائپ کروں۔ میں نے وہ مسودہ ٹائپ کر دیا۔ یہ مضمون تقریباً 25 فلسکیپ کاغذوں پر مشتمل تھا۔ وہ جب اسے ٹائپ کر کے علامہ کے پاس لے گئے توانہوں نے ان کا قلم لے کر اس میں درستی کی۔ ہر صفحہ تصحیحات سے بھرا ہوا تھا۔ بعض اوقات انہوں نے پورے کا پورا صفحہ کاٹ دیا اور اسے دوبارہ یا تو حاشیہ میں یا صفحے کی پشت پر لکھا۔ خواجہ وحید لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس تصحیح شدہ مسودہ کو از سر نو ٹائپ کیا جو 'اسلام' 22 جنوری 1936ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون نے ملک میں بڑی ہلچل پیدا کی۔ اصل ٹائپ شدہ مسودہ جس کی علامہ اقبال نے تصحیح کی تھی اور جس پر دستخط کئے تھے تقریباً 20 سال تک ان (خواجہ وحید) کے پاس ہی رہا۔

1950ء کی دہائی میں خواجہ وحید نے کراچی سے پندرہ روزہ الاسلام شائع کرنا شروع کیا۔ اس

وقت قادیانی پرچے روز نامہ الفضل ربوہ نے بعض قسط وار اداریے شائع کئے جن میں دعویٰ کیا گیا کہ مضمون 'اسلام اینڈ احمد ازم، علامہ اقبال نے نہیں لکھا تھا اور بعض داخلی شواہد کی بناء پر کہا گیا کہ وہ ایسا مضمون لکھ ہی نہ سکتے تھے۔

خواجہ وحید نے الاسلام کے پہلے صفحے پر ایک مضمون شائع کیا اور بتایا کہ زیر بحث مضمون کا اصل ٹائپ شدہ مسودہ ابھی تک ان کے پاس ہے اور اس کے آخری صفحے کی فوٹو گراف چھاپ دی جس کے آخر میں علامہ اقبال کے دستخط تھے اور لکھا تھا:۔

''میں انجمن خدام الدین لاہور کو اجازت دیتا ہوں کہ درج بالا مضمون ایک پمفلٹ کی صورت میں مفت تقسیم کے لئے شائع کر دے'' محمد اقبال 7 جنوری 1936ء۔ اس پر دوبارہ ہل چل مچی۔ بعض پبلک تنظیمیں اس کو محفوظ کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے اسے اقبال اکادمی کو دے دیا جہاں دیگر اہم مسودات کے ساتھ یہ مسودہ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ (11)

علامہ اقبال کے مضامین پر اہل علم کی آراء

ملک محمد جعفر خان:

ملک محمد جعفر خان، بھٹو دور حکومت میں اقلیتی امور کے وزیر رہے۔ وہ نہات سلجھے ہوئے شخص تھے۔ ان کے خاندان کے بعض افراد احمدی تھے۔ ملک محمد جعفر خان نے احمدیت ترک کر دی اور ایک کتاب احمدیہ تحریک لکھی جس میں اس تحریک کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ احمدیہ تحریک خالص مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سیاسی اور معاشرتی سوال ہے سب سے معقول چیز جو احمدیت کی نسبت لکھی گئی وہ علامہ اقبال کے وہ مضامین وخطوط ہیں جو انہوں نے عرصہ ہوا پنڈت نہرو کے ساتھ ایک سیاسی نوعیت کی بحث کے دوران لکھے۔ ملک صاحب کہتے ہیں کہ احمدی جماعت کے دو طبقے ہیں ایک مرزا صاحب کا خاندان ہے جو خلافت کے نام پر برسر اقتدار چلا آرہا ہے دوسرے احمدی مولوی ہیں جو معاشی مجبوریوں کا شکار ہیں ان میں تنخواہ دار مبلغ منافقت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ربوہ آزادی اور مذہب کی سوچ میں حائل ہے۔ ایک نظام کو

عارضی طور پر تنظیمی پابندیوں سے قائم رکھا جاسکتا ہے لیکن بالآخر اس کا ختم ہونا مقدر ہے۔(12)

خاندانی اقتدار اور وجاہت قائم کرنا مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کا لازمی جزو تھا۔ (13) مرزا صاحب وہ پہلے 'نبی' ہیں جن کی پیغمبری پیغام سے خالی ہے۔(14) ان کا سارا مشن اپنی ذات تک محدود تھا۔ جو کچھ انہوں نے لکھا اس مشن کو سامنے رکھ کر لکھا۔ انہوں نے اپنی ذاتی ضرورت کو قومی ضرورت کے طور پر پیش کیا۔

عبدالمجید سالک:

حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں (قادیانیت کے خلاف مضامین۔مصنف) میں علامہ اقبال نے بعض ایسے نکات پیش کئے ہیں جن کا جواب ابھی تک کسی سے نہیں ہوا ہے۔(15)

مرحوم مولانا عبدالقدوس ہاشمی:

مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد میں لائبریرین تھے۔ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور نہایت عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ دیندار اور متقی شخص تھے۔راقم ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور ان سے علمی استفادہ کرتا تھا۔ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ وہ حیدرآباد دکن ہی میں تھے جب علامہ اقبال کے قادیانیت کے خلاف مضامین اخبارات میں آئے۔انہوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ علامہ اقبال نے احمدیت کی حقیقی نوعیت اور اس کی سیاسی روح کو درست سمجھا ہے اور اسے مربوط اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے، اس لئے قادیانیوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان مضامین کی اشاعت کے بعد انہوں نے قادیانیوں کے جوابات ان کے رسائل و جرائد میں دیکھے جو ان کے پاس باقاعدگی سے آتے تھے۔مولانا ہاشمی نے مولانا الیاس برنی کے ساتھ حیدرآباد دکن میں کام کیا تھا۔انہوں نے مولانا برنی کی کتاب قادیانی مذہب کی تالیف میں حصہ لیا جس کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔مولانا ہاشمی نے کہا کہ انہوں نے ہندو پریس میں علامہ کے مضامین پر تبصرے پڑھے۔پنڈت نہرو کے خطوط چھپنے پر تو قادیانی بہت خوش تھے مگر

علامہ اقبال کا جواب آنے کے بعد وہ قدرے سرد پڑ گئے اور برھم ہوئے۔ اس وقت (36-1935) سے لے کر اب تک (1969) انہیں کوئی ایسا مضمون دکھائی نہیں دیا جس میں علامہ اقبال کے محکم دلائل کی دانشمندانہ انداز سے تردید کی گئی ہو۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ ان کا خیال ہے پھر فرمایا، نہیں انہیں یقین ہے کہ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکے گا، ویسے قادیانی ہر بات کا اوٹ پٹانگ جواب دینے اور خلط مبحث میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور جب کبھی پاکستان میں قادیانی غیر مسلم اقلیت قرار پا گئے تو ان مضامین کی صداقت پر مہر ثبت ہو جائے گی۔ شاید قادیانیوں کو پھر کوئی جواب دینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔(16)

میاں محمد شفیع (م۔ش)

مشہور صحافی اور علامہ اقبال کے نیاز مند میاں محمد شفیع (م۔ش) نے اپنے ایک مضمون علامہ اقبال کے آخری ایام میں پنڈت نہرو کے خطوط کے جواب میں تحریر کردہ مضمون کے متعلق درج ذیل تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

علامہ اقبال کی عظمت کا تاج ان کا وہ واضح اور روشن بیان ہے جو ایک ایسے مسئلہ کے بارے میں جاری کیا گیا جس نے ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف احمدیہ جماعت میں نہ ختم ہونے والی ایک تلخ بحث کا آغاز کر رکھا تھا۔ یہ ختم نبوت کے بنیادی عقیدے کی حقیقی اہمیت کے متعلق وضاحت تھی یعنی حضرت محمد ﷺ خدا کے فرستادہ نبیوں میں آخری نبی ہیں۔ یہ موقع پنڈت نہرو کے ماڈرن ریویو میں شائع شدہ ایک مضمون نے فراہم کر دیا جس میں انہوں نے احمدیت کی مخالفت کو فرقہ وارانہ تنگ نظری پر محمول کیا تھا۔ ایک مشہور ہندوستانی رہنما کے قلم سے نکلے اس مضمون نے مجلس احرار اور احمدیہ مبلغوں کے درمیان تلخ بحث پیدا کر دی تھی اور تمام ملکی فضا بے چینی کا شکار تھی۔ علامہ اقبال نے پہلی دفعہ کوئی جارحانہ فقرہ اور غیر شایان شان تاثر دیئے بغیر نہایت سادہ لیکن زوردار زبان میں ہندوستان جیسے ملک میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد کسی نئے نبی کی آمد سے پیدا ہونے والے تہذیبی، روحانی اور سیاسی مضمرات کو تفصیل سے واضح کیا جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا تھا۔ جو

کچھ احرار اور راسخ العقیدہ مسلمان پوری زندگی کے جہاد کے نتیجے میں حاصل نہ کر سکے وہ سب کچھ علامہ اقبال کے ایک درخشاں بیان سے حاصل ہو گیا۔ میں یہ بات لازمی طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک میں نے کسی کوارٹر سے ایک بھی ایسا بیان نہیں دیکھا جو تسلی بخش طور پر ان مناسب سوالات کے جوابات فراہم کرتا ہو جو علامہ اقبال نے اٹھائے اور کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ایک شخص کو خدا کی حاصل کردہ وحی پر مبنی نئی نبوت کی حضرت نبی کریم ﷺ کی نبوت کے بعد ضرورت کیوں پیش آئی جب کہ وحی محمدی ﷺ قران کریم میں موجود ہے اور قران ہر زمانے کے لیے انسانیت کو رہنمائی فراہم کرتا ہے۔(17)

میاں محمد شفیع (م۔ش) ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں کہ احرار مسئلہ شہید گنج میں پسپا ہو چکے تھے۔ اور سر ظفر اللہ وائسرائے کونسل کے ممبر بن گئے تھے یہ دور احمدیوں کی تاریخ میں کامرانیوں اور پھلنے پھولنے کا دور تھا لیکن اس دور میں حضرت علامہ اقبال کے احمدیت اور قادیانیت پر معرکتہ الآراء بیان نے احمدیت کے فروغ کے خلاف بند باندھ دیا۔ حضرت علامہ اقبال نے مسئلہ ختم نبوت کی ایسی عالمانہ تاریخی اور دینی نقطہ نگاہ سے تشریح کی کہ ایک عام مسلمان کو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ توحید کے ساتھ ختم رسالت کا عقیدہ کیوں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ احمدیوں کے خلاف جو تحریک مولوی محمد حسین بٹالوی سے شروع ہو کر احرار کے منظم ہاتھوں تک پہنچی تھی اور جس کے زور شور سے جاری رہنے کے باوصف احمدیت فروغ پذیر تھی اس کو اقبال نے جس طرح تاریخ کی روشنی میں پیش کر کے عقل و فہم رکھنے والے مسلمانوں کے لئے غور و فکر کا سامان بہم پہنچایا میرے خیال کے مطابق اس نے احمدیت کے فروغ کی لہر کے سامنے بند باندھ دیا تھا۔ اقبال نے نہایت سنجیدگی اور تحقیقی نقطہ نظر سے بانی سلسلہ احمدیت کے دعویٰ کا جائزہ لے کر دانشوروں کو دعوت فکر دی۔ ان کا نقطہ نگاہ اور موقف آج بھی احمدی دانشوروں اور مفکرین کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔(18)

انجمن حمایت اسلام سے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کا اخراج

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ (1872-1936ء) کلانور گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ 5 فروری

1892ء کومرزا غلام احمد قادیانی سے بیعت کی۔ 1897ء میں ایل ایم ایس کا امتحان پاس کیا، پنجاب کے مختلف علاقوں میں بطور ڈاکٹر کام کرتے رہے 1915ء میں لاہور میں پریکٹس شروع کی۔ لاہور جماعت کے مرکز برانڈرتھ روڈ کے قریب ان کی ڈسپنسری تھی۔ انہوں نے مختلف اسلامی انجمنوں میں کام کیا، انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے ممبر تھے۔ سر شفیع لیگ کے ممبر رہے۔ 1931ء میں جب کشمیر کمیٹی بنی تو ڈاکٹر صاحب اور محمد یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ لاہور اس کے ممبروں میں شامل تھے۔ 1933ء میں جب مرزا محمود نے کمیٹی سے استعفےٰ دیا اور علامہ اقبال اس کے عارضی صدر بنے تو مرزا یعقوب بیگ نے ان کو دوبارہ صدر بنانے اور کمیٹی میں قادیانیوں کا عمل دخل قائم رکھنے کے لئے کئی سازشوں میں حصہ لیا انہوں نے گذشتہ اختلافات بھلا کر مرزا محمود اور قادیانی جماعت کا بھر پور ساتھ دیا یہی طرز عمل یعقوب خان ایڈیٹر لائٹ کا تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک طویل بیان بھی اخبارات میں شائع کرایا۔ علامہ اقبال ان کی سرگرمیوں سے آگاہ تھے۔

1936ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے انہوں نے صدارت سے استعفےٰ دے دیا اور استعفیٰ واپس لینے کے لئے یہ شرط رکھی کہ انجمن مرزائیوں کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت کرے۔ مولوی محمد علی نے 20 جنوری 1936ء کو انجمن کے سیکریٹری جنرل کے نام ایک خط لکھا جس میں لاہوری احمدیوں کے ممبر رہنے کا جواز پیش کیا۔ (19) مرزا یعقوب بیگ نے بھی ایک دردمندانہ اپیل شائع کی۔

علامہ اقبال کی تحریک پر انجمن حمایت اسلام لاہور نے 2 فروری 1936ء کو ایک قرار داد منظور کی جس کی رو سے احمدیوں کو انجمن کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا اور آئندہ کے لئے بھی ان کے ممبر بننے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

جنرل کونسل کے اجلاس کے دوران یعقوب بیگ نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی۔ مولوی غلام محی الدین قصوری کے دو تین مرتبہ ٹوکنے کے باوجود بولتے رہے۔ قادیانی یہ کہتے ہیں کہ اس رنج میں وہ فالج کے حملے کا شکار ہو کر 12 فروری 1936ء کو وفات پا گئے ہفت روزہ لائٹ لاہور نے 16 فروری 1936ء کی اشاعت میں ان کو شہید کا مرتبہ دیا۔ (20) لیکن اس واقعے سے قبل ہی وہ

بیمار چلے آ رہے تھے اور اسی بیماری سے وفات پائی۔

چونکہ وہ علامہ اقبال کے قریبی دوست رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے مولوی محمد علی امیر جماعت لاہور کو ایک خط لکھا جس میں کہا:

ابھی اخبار انقلاب میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت رنج ہوا۔ وہ شرافت کا پیکر مجسم تھے اور فطرتاً بنی نوع انسان کے ہمدرد۔ خدا تعالیٰ ان پر رحمت کرے۔ مجھے معلوم نہیں ان کے صاحبزادے کہاں ہیں آپ از راہ عنایت میرا پیغام ہمدردی ان تک پہنچا دیں میں کئی روز سے نزلہ کی وجہ سے صاحب فراش ہوں ورنہ اس مقصد کے لئے خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

والسلام محمد اقبال (21)

اقبال دشمنی کے دیگر انداز

قادیانیوں کے اقبال دشمن کردار کے متنوع پہلوؤں میں ایک ان کے خلاف شاعری کا سہارا لینا ہے اور دوسرا ان کے فلسفے اور پیغام کی وقعت کو کم کرنا ہے۔ الفضل قادیان اور پیغام صلح لاہور میں تلاش کرنے پر ان موضوعات پر کافی مواد مل سکتا ہے۔ تنگ دامنی کے باعث ہم ایک نظم اور مختصر مواد بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اقبال شناسوں کو چاہیے کہ وہ قادیانی اخبارات و رسائل کو کھنگال کر تمام مواد ایک جگہ جمع کریں اور اس کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیں۔

اقبال کے خلاف نظم

حسن رہتاسی قادیانیوں کے ایک 'نامور' شاعر تھے، اپنے نسیم سیفی اور ثاقب زیروی کی طرح۔ بعض قادیانی ان کو اقبال کا ہم پلہ شاعر سمجھتے ہیں اور بعض انہیں عوامی شاعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ 'کلام حسن' شائع ہو چکا ہے جس میں چیدہ چیدہ نظمیں قطعے وغیرہ ہیں۔ ہم ان قادیانیوں کے خیال سے متفق ہیں جو ان کو عوامی شاعر کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے صابن کی ٹکیہ اور بیوی کی انگیہ پر بھی مزاحیہ نظمیں کہی ہیں۔

1935ء میں جب علامہ اقبال کے قادیانیت کے خلاف مضامین پر تعلیم یافتہ طبقہ ان کو خراج عقیدت پیش کر رہا تھا تو قادیان میں چگی داڑھی اور منفی چہروں والی ایک کھیپ ان کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھی، اس زمانے میں حسن رہتاسی نے یہ نظم کہی۔(22)

اقبال وحسن

قاتل و سفاک یا خونخوار باش | رہزن و قزاق و طلق آزار باش
مے پرست و میخور میخوار باش | بے حیا و بے وفا غدار باش
دربدر آوارہ و بے کار باش | رخت فتنہ پوش و در بازار باش
قومِ چوں بیدار باشد تو بخسپ | چوں بخسپد قومِ تو بیدار باش
کار بند قشقہ و زنار شو | زرد پوش و خالصہ سردار باش
کاذب و کذاب باش و مفتری | حیلہ ساز و حیلہ جو مکار باش
پر حذر شو از صف کرپانیاں | باشریفاں بر سر پیکار باش
گر بیفتد 'مسجدے' پروا مکن | تو بفکر درہم و دینار باش
تا نشستِ کونسلے آمد بدست | غور کن در مشتری ہوشیار باش
زیں مہمات عظیمہ فرصتے | عزم بیت اللہ کن و زوّار باش
از خدا ہم از نبی بیزار باش | در ہمہ اوصاف برخوردار باش
چوں شوی کامل بہر نوع کمال | برجہادِ قادیاں، تیار باش،

تا توانی باجماعت یار باش
رونق ہنگامۂ احرار باش،

(اقبال)

حسن رہتاسی

عطیہ بھوپال بہ سر اقبال

واہ! کیا شان ہے تیری بھوپال
اور بھی ہو بلند جاہ و جلال
تا دم زیست پائیں گے تجھ سے
پانصد ماہوار سر اقبال

قادیانی کہتے ہیں مغربی اقوام کو دجال اور یاجوج ماجوج سب سے پہلے مرزا غلام احمد نے کہا علامہ اقبال نے بھی اپنے شعر میں یہی کہا ہے۔

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیر حرف ینسلون

2- علامہ اقبال فرماتے ہیں:

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

وہ کونسے قدسی تھے جن سے علامہ اقبال نے غلبہ و فتح اسلام کا پیغام پھر سے سنا۔ قادیانی دعویٰ کرتے ہیں کہ کیا حضرت اقدس (مرزا صاحب) اور جماعت احمدیہ کے علاوہ کوئی اور تحریک اس زمانے میں اٹھی جس نے نہ صرف غلبہ و فتح دین کا یقین اپنے پیروؤں میں پیدا کیا بلکہ ان ہی کی مساعی سے دنیا میں عالمگیر سطح پر فتح اسلام کے دروازے کھل گئے۔ (23)

3- علامہ اقبال کا شعر ہے

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

قادیانی منطق کی رو سے یہ شان جلالی اور جمالی کے ظہور کی اصطلاحیں کیا تحریک احمدیت سے

مخصوص نہیں۔ سب لوگ حضرت اقدس اور جماعت احمدیہ کے اس نظریے سے کہ اب زمانہ اسلام کی روحانی تلوار اور اخلاقی قوت کا ہے سراسر منکر ہو رہے تھے۔ پھر جائے غور ہے کہ علامہ اقبال نے اسلام اور ملت کی شان جلالی کی بجائے شان جمالی کے ظہور کے نظریہ و یقین کو کہاں سے لیا تھا۔(24)

الفضل قادیان لکھتا ہے:

مرزا صاحب اپنے ایک الہام لولاک لما خلقت الافلاک کی تشریح اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں یوں کرتے ہیں "ہر ایک عظیم الشان مصلح کے وقت روحانی طور پر نیا آسمان اور نئی زمین بنائی جاتی ہے یعنی ملائک کو اس کے مقاصد کی خدمت میں لگا دیا جاتا ہے اور زمین پر مستعد طبعیتیں پیدا کی جاتی ہیں پس یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

حال ہی (1935) میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا اردو منظوم کلام بالِ جبرئیل کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں سے چند اشعار اس نظریہ کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

پھر کہتے ہیں:

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

ع جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

The Solidarity of Islam

Some time back I read with great interest an article by Sir Mohammad Iqbal on the *Solidarity of Islam*.[2] Sir Mohammad's writings always attract me, for they give me some insight into a world which I find difficult to understand. So far as religion and the religious outlook are concerned, I live in the outer darkness, but, in spite of this deficiency in me, I am sufficiently interested in the historical, cultural and even the philosophical aspects of religion.

In his article Sir Mohammad dealt with the issue created between the *Qadianis* and the orthodox Muslims and considered this as 'extremely important' and affecting the integrity of the parent community. The *Qadianis*, according to him, had discarded the basic idea of Islam—the finality of prophethood—and had reverted to some extent to early Judaism and the pre-Islamic Magian culture. He was therefore of opinion that this 'rebellious group' should not be allowed to carry on its subversive propaganda, and, in any event, should not be permitted to masquerade as Muslims. *Qadiani* leaders did not accept Sir Mohammad's argument and vigorously repelled some of his statements.

Sir Mohammad's article raises a host of issues and makes one furiously to think in many directions. I hope that he will develop some of his points in future writings, for they deserve a full discussion. For the moment I am concerned with one aspect of his argument only. It would be impertinent of me to discuss the validity or otherwise of this argument from the point of view of Islam. That is a matter for erudite Muslims. For me Sir Mohammad is an authority on Islam worthy of respect and I must assume that he represents the orthodox viewpoint correctly.

If that is so, I presume that Turkey under the Ataturk Kemal has certainly ceased to be an Islamic country in any sense of the word. Egypt has been powerfully influenced by religious reformers who have tried to put new garments on the ancient truths, and, I imagine, that Sir Mohammad does not approve of this modernist tendency. The

1. Almora District Jail, 20 August 1935. Published in *Modern Review*, November 1935, pp. 504-505.
2. Iqbal published in 1934 the article called *Qadianis and the Orthodox Muslim*. The religious movement of *Qadianism* was started in 1889 by Mirza Ghulam Ahmed who claimed to be the "promised Prophet of every nation".

Arabs of Syria and Palestine more or less follow Egyptian thought-currents and are partly influenced by Turkey's example. Iran is definitely looking for its cultural inspiration to pre-Islamic Magian days. In all these countries, indeed in every country of western and middle Asia, nationalist ideas are rapidly growing, usually at the expense of the pure and orthodox religious outlook. Islam, as Sir Mohammad tells us, repudiates the race idea (and of course the geographical idea) and founds itself on the religious idea alone. But in the Islamic countries of western Asia we find today the race and geographical ideas all-powerful. The Turk takes pride in the Turanian race; the Iranian in his own ancient racial traditions; the Egyptian and Syrian (as well as the people of Palestine, Trans-Jordan and Iraq) dream of Arab unity in which the Muslim and Christian Arabs will share.

All this clearly shows that these nations have fallen away from the ideal of Islamic solidarity which Sir Mohammad lays down. Where then does this solidarity exist at present? Not in Central Asia, for in the Soviet parts the breakaway from orthodoxy is far greater; in the Chinese parts the predominant currents are probably nationalist (Turanian) and Soviet. Afghanistan and Arabia proper remain in Asia, and then there are a number of Islamic countries in North Africa, apart from Egypt. How far this orthodox outlook of religious solidarity is prevalent there, I do not know, but reports indicate that nationalistic ideas have penetrated even there. And nationalism and the solidarity of Islam do not fit in side by side. Each weakens the other.

From Sir Mohammad's viewpoint this situation in the Islamic world must be a deplorable one. The question of the *Qadianis*, important as he considers it, sinks into relative insignificance before these world happenings. He stresses the need of a real leader to rise in the Punjab apparently to combat the '*Qadiani* menace'. But what lead does he give in regard to the wider menace? The Aga Khan, we are told, is the leader of Indian Muslims. Does he stand for this solidarity of Islam as defined by Sir Mohammad Iqbal?

These questions are relevant even for a non-Muslim; for on the answer to them depends the political, social and economic orientation of Indian Muslims and their reactions to modern ideas and thought-currents, in which some of us are interested. Islam being a world community, its policy must also be a world policy if it is to preserve that sense of solidarity. Sir Mohammad should give us some hint of this policy to meet the nationalist, social and economic problems that confront each country and group.

The only hint he gives in the article is a negative one: that religious reformers should be put down. In this, he tells us, he cordially agrees with the orthodox Hindus, and religious reform is supposed to include all social reform. He makes a provisional suggestion also that the distinction of rural and urban Muslims be abolished, as this interferes with the unity of Islam in the Punjab. Presumably the fact that some Muslims cultivate the fields, some are big landlords and live on rent, some are professional people living in cities, or bankers, or artisans or captains of industry, or labourers, some have an abundance of good things of life while most others starve, will still remain and will not interfere with Islamic unity.

Perhaps it is the object of the recently-formed "Council of Peers and Moslem Leaders", of which Sir Mohammad Iqbal is a member, to further this unity and the solidarity of Islam. To an outsider it seems a little odd that Christian members of the British House of Lords should be so interested in the progress and solidarity of Islam. But at the lunch at Claridge's in London that followed the formation of this Council, the Aga Khan, we are told, "developed the theme of Anglo-Moslem unity." Perhaps the two unities lead into one another, and build up a wider and more embracing unity. It is all very confusiug. I wish Sir Mohammad would explain and enlighten us.

10. His Highness the Aga Khan[1]

Sir Mohammad Iqbal's earnest plea for the solidarity of Islam and his protest against fissiparous tendencies led me to wonder as to where the line should be drawn. His Highness the Aga Khan is today considered the outstanding leader of the Indian Muslims. The government treats him and honours him as such, orthodox Muslim leaders, whenever in trouble or faced with difficulty, seek refuge under his sheltering wings. Even Sir Mohammad might, so to speak, be said to march under his political banner. From the point of view of orthodox Islam and its unity of conception, politics, sociology and economics can hardly be separated from religion. One would think therefore that the Aga

1. Almora District Jail, 21 August 1935. Published in *Modern Review*, November 1935, pp. 505-507.

Khan was the ideal representative of this unity and solidarity of religious belief.

Whether this is so I do not know and I should welcome wiser people to inform me. I have long had a vague kind of idea, however, that he hardly belongs to the inner orthodox fold, and I have admired him for the truly wonderful way in which he manages to combine, and gracefully carry in his own person, the most contradictory qualities, and to take part in multifarious activities which appear to be mutually antagonistic and irreconcilable. He is the head and spiritual leader of a widespread and wealthy sect and, I am told, that almost divine attributes are assigned to him by his devoted followers. He is said to derive a vast ecclesiastical revenue from the faithful, and one of his sources of income is supposed to be the granting of spiritual favours and indulgences. It is interesting to find these old-world practices being continued today in an intensive form. But the really remarkable fact is that the spiritual head who supports and encourages these practices is a modern of moderns, highly cultured in western ways, a prince of the turf, most at home in London and Paris. Only a remarkable personality could successfully carry this double burden. The Aga Khan not only does so with supreme ease, but he adds to it many public and political activities as well as the leadership of the Indian Muslims. That is an astonishing feat which, even though one may disagree with the Aga Khan, fills one with admiration for him.

But the question that is troubling me, as a result of reading Sir Mohammad Iqbal's statement on the solidarity of Islam, is how all this fits in with that solidarity. It may be perfectly justifiable to spend the money of the faithful on racing; that, after all, is a minor matter. But is the Aga Khan's sect a partner in that Islamic solidarity or not? I remember reading long ago Mark Twain's account of a visit paid by the Aga Khan to him in Bombay. Mark Twain's Indian servant burst into his hotel room one day in a state of extreme excitement and announced that God had come to pay a call on him. Many pray to God daily—and Mark Twain was a religious type of man—and each one of us, according to his early teaching or mental and spiritual development, has his own conception of God. But the best of us are apt to be taken aback by a sudden visitation of the Almighty. Mark Twain, after he had recovered from his initial surprise, discovered that God had come to him in the handsome and corporeal shape of the Aga Khan

This characterization of the Aga Khan as God was no doubt a foolish error of Mark Twain's servant—and the Aga Khan cannot be held responsible for it. So far as I know, he does not claim divinity. But

there seem to be a large number of foolish persons about who ascribe certain divine or semi-divine attributes to him. Some of the propagandists of the sect describe him as an avatar or incarnation of the divinity. They have every right to do so if they believe in it. I have absolutely no complaint. But how does all this fit in with the solidarity of Islam?

A story that has long fascinated me is the account of the Aga Khan giving chits or notes of introduction for the archangel Gabriel to his followers, or some of them. This, so the tale runs, is to ensure their comfort and happiness in the next world. I cannot vouch for the truth of this story, but I do hope that it is based on fact. There is little of romance left in this drab and dreary world, and to correspond with an archangel is a captivating idea. It seems to bring heaven nearer, and even our life here down below assumes a rosier hue.

Then there is another story, not so attractive, but nevertheless extraordinary enough. I had heard of it previously and lately I read an account in a book by an American traveller. Colonel E. Alexander Powell, in his *The Last Home of Mystery*, referring to the Aga Khan says:

> His sanctity is so great, indeed, in the eyes of his followers, that the water in which he bathes is carefully conserved and sold annually to the representatives of the various Mohammedan sects at a ceremony held once each year at Aga Khan Hall in Bombay. The price paid for this holy water is the Aga Khan's weight in gold, the scales used for the weighing ceremony being adjusted to the fraction of an ounce troy. As the Aga Khan is a plump little man, the price paid for his used bath water is a high one.

Colonel Powell has probably added some journalistic and fancy touches of his own to this account. But the story is an old and oft-repeated one and, to my knowledge, has never been contradicted. If the Aga Khan can find a profitable use for his bath water and at the same time serve and exalt faith, surely it is no one's business to object. Tastes differ and it takes all sorts to make this world of ours. But again I am led to wonder if all this furthers the solidarity and 'democracy of Islam'.

Another incident comes to my mind. It was after the War when Kemal Pasha had driven out the Greeks and established himself firmly in power in Turkey. His casual treatment of the new Caliph, appointed by him, drew forth a protest[2]—a very polite protest—from the Aga

2. Along with Sayeed Amir Ali, the Aga Khan wrote a letter to Ismet Pasha, Prime Minister of Turkey, protesting against the threatened attacks on the powers of the Caliph. The letter was condemned as British propaganda.

Khan and Mr. Amir Ali.[3] Kemal Pasha scented an English conspiracy and suddenly started a fierce attack on England, the Aga Khan, the Caliph and some Constantinople journalists. He was not very polite to the Aga Khan and drew all manner of unjust inferences from his long and intimate association with the British Government and the ruling classes. He pointed out that the Aga Khan had not been keen on following the previous Caliph's religious mandate when war had broken out between Turkey and England. He even stressed that the Aga Khan was no true Muslim, or at any rate, not an orthodox one, for did he not belong to a heretical sect? All this and much more he said, keen on gaining his end, which was to discredit the Aga Khan and make him out to be an accomplice of British foreign policy. And making the Aga Khan's move a pretext, the Ataturk put an end to the ancient Khilafat.

Kemal Pasha can hardly be said to be an authority on Islam, for he has deliberately broken away from many of its tenets. His motives were purely political, but his criticisms were not wholly without apparent force.

As I write this, another aspect of the Aga Khan's many-sided personality comes up before me. It is given in an intimate, every day account and is thus all the more valuable and revealing. It appears in the *London Bystander* and I have come across it in a quotation in the *New Statesman*. This tells us that,

> Although the Aga Khan loves the good things of life—he is a great gourmet and has his own cook—there is a very considerable spiritual side to his life. It is hard to pin him down exactly on this point. But he will admit to a strong feeling of the battle between good and evil. At any rate, he is a wonderfully good sportsman, and when Jack Joel offered him a blank cheque the other day for Bahram he refused because he said he wanted in his decrepit old age to be wheeled alongside his Derby winner and say, 'Well, that was a jolly day!'

Much to my regret I have never met the Aga Khan. Only once have I seen him. This was in the early noncooperation days at a Khilafat meeting in Bombay, where I sat not far from him on the platform. But this glimpse of an attractive and remarkable personality was hardly satisfying, and I have often wanted to find out what curious quality he possesses which enables him to fill with distinction so many and such varied roles, combining the thirteenth century with the

(1849-1928); member, Bengal Legislative Council, 1878, judge, Calcutta High Court, 1890; appointed to the judicial committee of the Privy Council, 1909.

twentieth, Mecca and Newmarket, this world and the next, spirituality and racing, politics and pleasure. Wide indeed must be the range of Islam to include all this in its unity and solidarity.

But looking at Sir Mohammad Iqbal's statement I am again led to doubt, for Sir Mohammad seems to have little love for the non-conformists. He believes in the straight and narrow path of true orthodoxy and those who stray from this must forthwith remove themselves from his ken. How then am I to remove this doubt and difficulty? Will Sir Mohammad help in solving the riddle?

11. Orthodox of All Religions, Unite![1]

Some years ago I happened to be in Benares and as I was driving through the narrow city streets, my car was held up by a crowd. A procession was passing through and, apart from the processionists, there were many sightseers and little boys intent on sharing in the fun. Crowds interest me and I got down from the car to find out what was afoot. The procession was certainly an interesting one and it had certain unique features. We saw Brahmans, the most orthodox of their kind, with all manner of caste-marks proudly displayed on their foreheads, marching shoulder to shoulder with bearded *moulvies*; the priests from the *ghats* fraternized with the *mullahs* from the mosques, and one of the standards they carried in triumph bore the flaming device: 'Hindu Mussalman *Ekta Ki Jai*'—Victory to Hindu-Muslim Unity! Very gratifying, we thought. But still what was all this about?

We soon found out from their cries and the many other standards they carried. This was a joint protest by the orthodox of both religions against the Sarda Act (or perhaps it was a Bill at the time) which prohibited marriages of girls under fourteen. The pious and the holy of both faiths had joined ranks and hands to declare that they would not submit to this outrage on their deepest convictions and most cherished rights. Were they going to be bullied by the threats of so-called reformers into giving up their right to marry child-wives?

1. Almora District Jail, 25 August 1935. Published in *The Modern Review*, December 1935, pp. 625-631.

Never! Law or no law they would continue to marry little immature girls—for was not post puberty marriage a sin?—and thus enhance the glory of religion. Had not a noted *Vaidya* (physician) of Benares stated that in order to proclaim his adherence to the ancient *dharma* and his abhorrence of new-fangled notions like the Sarda Act, he, even he, although he was round about sixty years of age, would marry afresh a girl under the prescribed legal age? Faith and religion had built up their great structures on the sacrifice of their votaries. Surely the movement against the Sarda Act would not lack its martyrs.

We mixed with the crowd and marched along for some distance by the side of the procession. Devadas Gandhi was with me and some Benares friends and soon we were recognized by the processionists. They did not welcome us or shower greetings on us, and I am afraid we did not encourage them to do so. Our looks and attire separated us from the ranks of the faithful—we had neither beards nor caste-marks—and we carried on an irreverent and somewhat aggressive commentary on the procession and its sponsors. Offensive slogans were hurled at us and there was some jostling about. Just then the procession arrived at the Town Hall and for some reason or other started stone throwing. A bright young person thereupon pulled some crackers and this had an extraordinary effect on the serried ranks of the orthodox. Evidently thinking that the police or the military had opened fire, they dispersed and vanished with exceeding rapidity. A few crackers were enough to put the procession to flight, but not even a cracker was required to make the British Government in India surrender on this issue. A little shouting, in which oddly enough the Muslims took the leading share, was enough to kill and bury the Sarda Act. It was feeble enough at birth with all manner of provisions which hindered its enforcement and then it gave six months' grace which resulted in a very spate of child marriages. And then, after the six months were over? Nothing happened; child marriages continued as before and government and magistrates looked the other way while the Sarda Act was torn to shreds and cast to the dogs. In some instances the person who ventured to bring a breach to a court, himself got into trouble for his pains and was fined. True, in one instance a Punjab villager who had given his ten-year daughter in marriage and deliberately broken the provisions of the Sarda Act despite warning was sentenced to one month's imprisonment. But this error on the part of the magistrate was soon rectified by the Punjab Government who hastened to send a telegram ordering the release of the offender against the Act. (This case has been taken from Miss E.F. Rathbone's interesting little book, *Child Marriage.*)

Khan was the ideal representative of this unity and solidarity of religious belief.

Whether this is so I do not know and I should welcome wiser people to inform me. I have long had a vague kind of idea, however, that he hardly belongs to the inner orthodox fold, and I have admired him for the truly wonderful way in which he manages to combine, and gracefully carry in his own person, the most contradictory qualities, and to take part in multifarious activities which appear to be mutually antagonistic and irreconcilable. He is the head and spiritual leader of a widespread and wealthy sect and, I am told, that almost divine attributes are assigned to him by his dèvoted followers. He is said to derive a vast ecclesiastical revenue from the faithful, and one of his sources of income is supposed to be the granting of spiritual favours and indulgences. It is interesting to find these old-world practices being continued today in an intensive form. But the really remarkable fact is that the spiritual head who supports and encourages these practices is a modern of moderns, highly cultured in western ways, a prince of the turf, most at home in London and Paris. Only a remarkable personality could successfully carry this double burden. The Aga Khan not only does so with supreme ease, but he adds to it many public and political activities as well as the leadership of the Indian Muslims. That is an astonishing feat which, even though one may disagree with the Aga Khan, fills one with admiration for him.

But the question that is troubling me, as a result of reading Sir Mohammad Iqbal's statement on the solidarity of Islam, is how all this fits in with that solidarity. It may be perfectly justifiable to spend the money of the faithful on racing; that, after all, is a minor matter. But is the Aga Khan's sect a partner in that Islamic solidarity or not? I remember reading long ago Mark Twain's account of a visit paid by the Aga Khan to him in Bombay. Mark Twain's Indian servant burst into his hotel room one day in a state of extreme excitement and announced that God had come to pay a call on him. Many pray to God daily—and Mark Twain was a religious type of man—and each one of us, according to his early teaching or mental and spiritual development, has his own conception of God. But the best of us are apt to be taken aback by a sudden visitation of the Almighty. Mark Twain, after he had recovered from his initial surprise, discovered that God had come to him in the handsome and corporeal shape of the Aga Khan

This characterization of the Aga Khan as God was no doubt a foolish error of Mark Twain's servant—and the Aga Khan cannot be held responsible for it. So far as I know, he does not claim divinity. But

there seem to be a large number of foolish persons about who ascribe certain divine or semi-divine attributes to him. Some of the propagandists of the sect describe him as an avatar or incarnation of the divinity. They have every right to do so if they believe in it. I have absolutely no complaint. But how does all this fit in with the solidarity of Islam?

A story that has long fascinated me is the account of the Aga Khan giving chits or notes of introduction for the archangel Gabriel to his followers, or some of them. This, so the tale runs, is to ensure their comfort and happiness in the next world. I cannot vouch for the truth of this story, but I do hope that it is based on fact. There is little of romance left in this drab and dreary world, and to correspond with an archangel is a captivating idea. It seems to bring heaven nearer, and even our life here down below assumes a rosier hue.

Then there is another story, not so attractive, but nevertheless extraordinary enough. I had heard of it previously and lately I read an account in a book by an American traveller. Colonel E. Alexander Powell, in his *The Last Home of Mystery*, referring to the Aga Khan says:

> His sanctity is so great, indeed, in the eyes of his followers, that the water in which he bathes is carefully conserved and sold annually to the representatives of the various Mohammedan sects at a ceremony held once each year at Aga Khan Hall in Bombay. The price paid for this holy water is the Aga Khan's weight in gold, the scales used for the weighing ceremony being adjusted to the fraction of an ounce troy. As the Aga Khan is a plump little man, the price paid for his used bath water is a high one.

Colonel Powell has probably added some journalistic and fancy touches of his own to this account. But the story is an old and oft-repeated one and, to my knowledge, has never been contradicted. If the Aga Khan can find a profitable use for his bath water and at the same time serve and exalt faith, surely it is no one's business to object. Tastes differ and it takes all sorts to make this world of ours. But again I am led to wonder if all this furthers the solidarity and 'democracy of Islam'.

Another incident comes to my mind. It was after the War when Kemal Pasha had driven out the Greeks and established himself firmly in power in Turkey. His casual treatment of the new Caliph, appointed by him, drew forth a protest[2]—a very polite protest—from the Aga

2. Along with Sayeed Amir Ali, the Aga Khan wrote a letter to Ismet Pasha, Prime Minister of Turkey, protesting against the threatened attacks on the powers of the Caliph. The letter was condemned as British propaganda.

Khan and Mr. Amir Ali.[3] Kemal Pasha scented an English conspiracy and suddenly started a fierce attack on England, the Aga Khan, the Caliph and some Constantinople journalists. He was not very polite to the Aga Khan and drew all manner of unjust inferences from his long and intimate association with the British Government and the ruling classes. He pointed out that the Aga Khan had not been keen on following the previous Caliph's religious mandate when war had broken out between Turkey and England. He even stressed that the Aga Khan was no true Muslim, or at any rate, not an orthodox one, for did he not belong to a heretical sect? All this and much more he said, keen on gaining his end, which was to discredit the Aga Khan and make him out to be an accomplice of British foreign policy. And making the Aga Khan's move a pretext, the Ataturk put an end to the ancient Khilafat.

Kemal Pasha can hardly be said to be an authority on Islam, for he has deliberately broken away from many of its tenets. His motives were purely political, but his criticisms were not wholly without apparent force.

As I write this, another aspect of the Aga Khan's many-sided personality comes up before me. It is given in an intimate, every day account and is thus all the more valuable and revealing. It appears in the *London Bystander* and I have come across it in a quotation in the *New Statesman*. This tells us that,

> Although the Aga Khan loves the good things of life—he is a great gourmet and has his own cook—there is a very considerable spiritual side to his life. It is hard to pin him down exactly on this point. But he will admit to a strong feeling of the battle between good and evil. At any rate, he is a wonderfully good sportsman, and when Jack Joel offered him a blank cheque the other day for Bahram he refused because he said he wanted in his decrepit old age to be wheeled alongside his Derby winner and say, 'Well, that was a jolly day!'

Much to my regret I have never met the Aga Khan. Only once have I seen him. This was in the early noncooperation days at a Khilafat meeting in Bombay, where I sat not far from him on the platform. But this glimpse of an attractive and remarkable personality was hardly satisfying, and I have often wanted to find out what curious quality he possesses which enables him to fill with distinction so many and such varied roles, combining the thirteenth century with the

(1849-1928); member, Bengal Legislative Council, 1878, judge, Calcutta High Court, 1890; appointed to the judicial committee of the Privy Council, 1909.

twentieth, Mecca and Newmarket, this world and the next, spirituality and racing, politics and pleasure. Wide indeed must be the range of Islam to include all this in its unity and solidarity.

But looking at Sir Mohammad Iqbal's statement I am again led to doubt, for Sir Mohammad seems to have little love for the non-conformists. He believes in the straight and narrow path of true orthodoxy and those who stray from this must forthwith remove themselves from his ken. How then am I to remove this doubt and difficulty? Will Sir Mohammad help in solving the riddle?

11. Orthodox of All Religions, Unite![1]

Some years ago I happened to be in Benares and as I was driving through the narrow city streets, my car was held up by a crowd. A procession was passing through and, apart from the processionists, there were many sightseers and little boys intent on sharing in the fun. Crowds interest me and I got down from the car to find out what was afoot. The procession was certainly an interesting one and it had certain unique features. We saw Brahmans, the most orthodox of their kind, with all manner of caste-marks proudly displayed on their foreheads, marching shoulder to shoulder with bearded *moulvies*; the priests from the *ghats* fraternized with the *mullahs* from the mosques, and one of the standards they carried in triumph bore the flaming device: 'Hindu Mussalman *Ekta Ki Jai*'—Victory to Hindu-Muslim Unity! Very gratifying, we thought. But still what was all this about?

We soon found out from their cries and the many other standards they carried. This was a joint protest by the orthodox of both religions against the Sarda Act (or perhaps it was a Bill at the time) which prohibited marriages of girls under fourteen. The pious and the holy of both faiths had joined ranks and hands to declare that they would not submit to this outrage on their deepest convictions and most cherished rights. Were they going to be bullied by the threats of so-called reformers into giving up their right to marry child-wives?

1. Almora District Jail, 25 August 1935. Published in *The Modern Review*, December 1935, pp. 625-631.

Never! Law or no law they would continue to marry little immature girls—for was not post-puberty marriage a sin?—and thus enhance the glory of religion. Had not a noted *Vaidya* (physician) of Benares stated that in order to proclaim his adherence to the ancient *dharma* and his abhorrence of new-fangled notions like the Sarda Act, he, even he, although he was round about sixty years of age, would marry afresh a girl under the prescribed legal age? Faith and religion had built up their great structures on the sacrifice of their votaries. Surely the movement against the Sarda Act would not lack its martyrs.

We mixed with the crowd and marched along for some distance by the side of the procession. Devadas Gandhi was with me and some Benares friends and soon we were recognized by the processionists. They did not welcome us or shower greetings on us, and I am afraid we did not encourage them to do so. Our looks and attire separated us from the ranks of the faithful—we had neither beards nor caste-marks—and we carried on an irreverent and somewhat aggressive commentary on the procession and its sponsors. Offensive slogans were hurled at us and there was some jostling about. Just then the procession arrived at the Town Hall and for some reason or other started stone throwing. A bright young person thereupon pulled some crackers and this had an extraordinary effect on the serried ranks of the orthodox. Evidently thinking that the police or the military had opened fire, they dispersed and vanished with exceeding rapidity. A few crackers were enough to put the procession to flight, but not even a cracker was required to make the British Government in India surrender on this issue. A little shouting, in which oddly enough the Muslims took the leading share, was enough to kill and bury the Sarda Act. It was feeble enough at birth with all manner of provisions which hindered its enforcement and then it gave six months' grace which resulted in a very spate of child marriages. And then, after the six months were over? Nothing happened; child marriages continued as before and government and magistrates looked the other way while the Sarda Act was torn to shreds and cast to the dogs. In some instances the person who ventured to bring a breach to a court, himself got into trouble for his pains and was fined. True, in one instance a Punjab villager who had given his ten-year daughter in marriage and deliberately broken the provisions of the Sarda Act despite warning was sentenced to one month's imprisonment. But this error on the part of the magistrate was soon rectified by the Punjab Government who hastened to send a telegram ordering the release of the offender against the Act. (This case has been taken from Miss E.F. Rathbone's interesting little book, *Child Marriage*.)

The Pakistan Times , 9 Nov. 1977

In Iqbal's Company for Thirty Years

by: K.A Waheed

In the year 1934, the Anjuman Khuddam-ud-Din of Lahore launched an English fortnightly journal, 'Islaam', the editorial work of which was entrusted to me. The declared editor of 'Islaam' was Khwaja Muhammad Rashid Wyne, a scion of the well-known Australia family of Lahore. Being a Government servant, I could not apply for the declaration of a paper. For publication in 'Islaam' I used to obtain Sir Mohammad Iqbal's statements on the burning topics of the day. I also used to seek his advice very frequently on problems which I wanted to discuss in the editorial columns of this journal. Sometimes he wanted me to take down dictation from him on an important political matter then engaging the public mind. In the 1930's the Qadiani movement was agitating the mind of Muslim India, and Sir Mohammad Iqbal was in the thick of this controversy. Statements and letters were appearing from his pen in the leading English dailies like the 'Statesman'. He now began to write an exhaustive essay on this problem and suggested that I should publish it in 'Islam' in a single instalment. He gave his manuscript to me and wanted me to typewrite it myself. I did so. The article covered some twenty-five foolscap pages. When I took this typescript to him he corrected it using my pen for the purpose. Every page was full of corrections made by him. In some cases he had scored out a whole page and written it afresh either in the margin or on the reverse of the sheet. I made out a fresh copy of the long, corrected article which was published in a single special issue of 'Islam' dated Jan. 22, 1936. It caused a lot of stir in the country. The original typescript, which had been corrected and signed by the author, remained in my possession for almost twenty years.

In the early 1950's I was publishing another English fortnightly, 'Al-Islam', at Karachi. At that time the Qadiani daily 'Al-Fazl' of Rabwah published a series of editorials claiming that the article 'Islam and Ahmadism' was not written by Sir Mohammad Iqbal, and on the basis of internal evidence claimed that it could not have been written by him.

I published a front-page article in 'Al-Islam' saying that the original typescript of the article in question was still in my possession, and I published a photograph of the last page of the script at the end of which the following words appeared:

> "I authorise the Anjuman Khuddam-ud-Din, Lahore to publish the above in the form of a pamphlet for free circulation."
>
> Mohammad Iqbal
> 7-1-1936

This again caused a great stir and some public organisations wanted to have it in their safe custody. I gave it to the Iqbal Academy and it is ever since in safe custody with the National Museum at Karachi, where all the valuable documents of the Academy are kept.

The Pakistan Times, 9 Nov. 1977

Last days of the sage

by: Mian Mohammad Shafi

His crowning act of glory, of course, was his brilliant statement on an issue which for over 50 years had caused an unending acrimonious debate between orthodox Muslims, on the one hand, and the Ahmadiyya community, on the other, about the real significance of the fundamental doctrine of the Finality of Prophethood as enshrined in the person of the last of the Prophets of Allah. The occasion was provided by an article by Pandit Nehru in the 'Modern Review' in which he dubbed opposition to Ahmadiyyat as a manifestation of narrow Muslim communalism. This article by a well-known Indian leader synchronised with a bitter controversy between the leaders of the Majlis-i-Ahrar and the missionaries of the Ahmadis. The whole atmosphere in the country was reeking with uneasiness. Allama Iqbal for the first time, without using a single offensive phrase and unworthy impression in simple but forceful language, explained at length the cultural, spiritual and political implications of the advent of a prophet after Mohammad (peace be on him) in a country like India where people were held under bondage by a foreign rule. What the Ahrars and other orthodox Muslim theologians could not achieve during their life-long crusade was accomplished by Iqbal in one lucid statement. I must sa that I have not so far seen a single statement from any quarter which satisfactorily answers the relevant questions, raised by Allama Iqbal about why anyone need claim to be a prophet receiving revelation from God after Mohammad (peace be on him) whose revelations from Allah are enshrined in the Holy Quran which is the guidance for mankind for all times to come.

ختم نبوت پر ڈاکٹر اقبال کا غیر فلسفیانہ تبصرہ

[illegible] صاحب بی-اے [illegible] سیالکوٹی

ہم کو بعض اوقات [illegible] ڈاکٹر اقبال سے [illegible] اور آپ [illegible] اخلاقی [illegible] [illegible] شاعر ختم [illegible] [illegible]

[illegible] سال کا [illegible]

[illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] ڈاکٹر اقبال داغ کو جہاں آباد [illegible] تسلیم کرتا ہے [illegible] [illegible] شاعر [illegible] [illegible] کا آخری شاعر [illegible] کے متعلق [illegible] لیکن اس [illegible] کہ شاعر [illegible] ڈاکٹر [illegible] کی [illegible]

از کم ایک اور شاعر کا وجود تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

یقیناً اس کے متعلق ڈاکٹر اقبال کا جواب یہ ہوگا کہ داغ کو اس کی بعض صفات خوبیوں کے باعث آخری شاعر کہا گیا ہے۔ نہ کہ اس سے مراد شعراء کی جنس کے معدوم ہو جانے سے ہے۔ جیسا کہ وہ اسی نظم میں اس کی تشریح یوں کرتا ہے ؎

اب دکھائیں گے یہ شکلیں نہ کبھی صورت گر
اپنے فکر کی آرائش کو طلسم بنا
[illegible] کے نقشے کبھی ابھریں گے
بالکل نہ ان [illegible] دنیا میں دکھلا سکیں گے
اس چمن میں پیرو ہوں گے بلبل شیراز ہیں
سینکڑوں ساحر [illegible] کے صاحب اعجاز ہیں
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بت خانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

مضمون واضح ہو چکا ہے۔ قارئین کرام سمجھ گئے ہوں گے کہ ڈاکٹر اقبال داغ کو جہاں آباد کا آخری شاعر قرار دیتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں شعراء کے پیدا ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ جو شعر کی مختلف انواع خوبیوں اور قابلیتوں کے مالک ہوں گے۔ ہاں ان میں وہ صفات نہ ہوں گی جو داغ کے کلام میں پائی جاتی تھیں اور جن کی وجہ سے داغ کو جہاں آباد کا آخری شاعر کہا گیا ہے۔ وہ خاص صفات یہ تھیں [illegible]

[illegible] وہ [illegible] شوخی [illegible]
[illegible] کا [illegible] ہوا [illegible]

[illegible] داغ [illegible]
[illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہے [illegible] کون [illegible]
[illegible] کہ [illegible]

یعنی صنعت سے رفعت فکر کی پروازیں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

ان اوصاف کے باعث داغ اقبال کی نظر میں جہاں آباد کا آخری شاعر ہے۔ مگر سب سے زیادہ ایک اور نمایاں وجہ اس کے خاتم الشعراء ہونے کی یہ بیان کی ہے کہ

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

غرض ان اشعار سے بالکل عیاں ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے نزدیک آخری شاعر ہونے سے مراد اس کے بعد شعراء کی جنس کا ختم ہو جانا نہیں۔ بلکہ شاعری کی بعض صفات کا ختم ہو جانا ہے۔ وہ بھی ان معنوں میں کہ ایسے باکمال شاعر دوسرے نہیں ہوں گے۔ جو ان صفات کی نوعیت سے اسی طرح مالک ہوں۔ جس طرح کہ داغ تھا۔ ورنہ اقبال جیسا زبردست فصیح و بلیغ شاعر ایک ہی نظم میں ایسی غلطی کا مرتکب نہ ہوتا۔ اسی سے ہم ختم نبوت کے معنی حل ہو جاتے ہیں۔ کہ آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تشریعی نبوت ختم ہو گئی ہے آپ پر تمام کمالات نبوت ختم ہو گئے ہیں۔ نہ کوئی آپ کے کمالات کو پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی آپ کی بلندی مراتب کو حاصل کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ آپ کا خادم اور آپ سے [illegible] کوئی نبی ایسا ہو سکتا

[illegible]

ڈاکٹر صاحب نے [illegible]

"یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا" کے مصرعہ میں مولانا حالی کو ان کے کلام کی خوبی کے باعث داغ کو آخری شاعر تسلیم کر لینے کے باوجود شاعر قرار دیا ہے۔ اور آپ کی ناقدانہ نظر ان پر جا پڑی۔ جو جہاں آباد میں کافی تعداد میں موجود تھے [illegible] اقبال نے داغ کو ان سے علاوہ کی بہتر خوبیوں کے [illegible] مولانا حالی کو ان کے کلام کی خوبی کی بنا پر شعرا [illegible] [illegible] اور [illegible] ڈاکٹر اقبال کی نظر میں کوئی خوبی نہ ہونے کے باعث شاعر [illegible] نظر پڑے۔

پس معلوم ہوا کہ داغ اور حالی اقبال کی نظر میں اپنے کلام کی خوبیوں اور خوبصورتیوں کے باعث شاعر کہلانے کے مستحق ہیں اور داغ یہاں کا ایک شاعر بعض صفات کی وجہ سے اقبال کی نظر میں آخری شاعر بن گیا۔ خاتم الشعراء کا درجہ رکھتا ہے مگر حالی دوسرا شاعر اپنے کلام کی خوبیوں کے باعث اقبال کی نظر میں شاعر کہلا سکتا ہے۔

الحکم کا نمبر سیرت مسیح موعودؑ

اخبار الحکم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روایات کے جمع کرنے کا مفید کام کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں الحکم نے سیرت مسیح موعود علیہ السلام نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ تبلیغ و اشاعت کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کی اشاعت بہت اور مفید ہے۔ اس لئے میں تمام احباب کو توجہ دلاتا ہوں کہ [illegible] مضامین [illegible] حقی الوسع [illegible] اعانت کریں۔ [illegible] اعلان کیا ہے کہ [illegible] پرچہ [illegible] صفحوں کا ہوگا۔ اور فی پرچہ ۳/ قیمت [illegible] خریدار [illegible] اور [illegible] [illegible] جو احباب خریدنا چاہیں وہ نیت نقد ایڈیٹر صاحب الحکم کو بھیج دیں۔

ناظر تالیف و تصنیف قادیان

احرار کانفرنس لدھیانہ میں علماء کرام کی نوک جھونک

احرار کانفرنس کے [illegible] مولوی احمد سعید [illegible] ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے مولوی عطاء اللہ صاحب بخاری [illegible] کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا [illegible] کے سامنے [illegible] [illegible] باطل ہے [illegible] [illegible] مکمل کرلیں۔ [illegible] نے جواب [illegible] بیٹھے۔ بلکہ [illegible] تو آزاد [illegible] [illegible] طلاق [illegible]

ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کے بیان پر نظر

(۲)

(از جناب [illegible])

[illegible]

پر غالب کرے، اور اس قوم کو تمام دنیا کا حکمران بنا دے، یہی معنی ملوکیت کا عقیدہ ختم نبوت کے عقیدے کو ابھرتا بنانا، درحقیقت تاریخی طور پر غلط ہے، بلکہ وہ تمام اقوام کا عقیدہ ہے جن کی ثقافت [illegible] ہو گئے ہیں۔

علامہ اقبال اور ختم نبوت

افسوس ہے کہ یہاں اس جگہ ان تمام الجھ طبیعاتی اور عقلیاتی نظریات پر بحث نہیں کر سکتا جن کی بنیاد پر علامہ موصوف نے ختم نبوت کے عقیدے کی وضاحت کی ہے۔ [illegible] ڈاکٹر صاحب کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" Reconstruction of Religious Thought in Islam [illegible]

[illegible]

ایک انسان جو زندگی کی عمیق گہرائیوں سے نور حاصل کرتا ہے [illegible] مناسب حال شکل اختیار کر لیتا ہے، اور وہ اپنے کام و دہن کے لحاظ سے اس کی کیفیات سے متاثر ہوتا ہے۔

انسانیت کے عہد طفلی میں عقل و شعور ترقی کی اس منزل تک نہیں پہنچا تھا، جہاں یہ عقل تجربہ و دست و رشد عقل ناشناسی سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ عہد قدیم میں انسانی عقل کو بچوں کی طرح سہاروں کی ضرورت تھی، انسان اس امر کے محتاج تھے کہ انہیں بنے بنائے اخلاقی قانون اور زندگی کی شاہراہیں بتا دی جائیں، جہاں وہ چاہیں وہ چل پڑیں، تفکر و ذہنی کشمکشوں میں مبتلا ہوئے بغیر چلتے جائیں لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آخر وقت آ گیا کہ عقل تجربہ و دست نے اپنا تسلط جمایا، اور ذوق اختصار پیشہ کو حقہ غلامی پہننا پڑا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مجمع البحرین ہے۔ دو چشمے عشق اور جوئے عقل کا اتصال ان کی ذات مبارک میں ہوا، اور قرآن حکیم کی شکل میں نمودار ہوا۔ وحی قرآن عقل استقرائی کے تقاضوں کو پورا کرتی بلکہ اس امر کی تلقین کرتی ہے کہ اب اس کو اپنا رہبر بناؤ۔

اسلام کی پیدائش ۔۔۔۔۔۔۔۔

ذہن استقرائی کی پیدائش ہے۔ اسلام میں نبوت اپنے آپ کو منسوخ کرنے کی ضرورت کے دریافت کرنے میں اپنی تکمیل کو پہنچی ہے۔ اس مسئلہ ختم نبوت میں [illegible] کا دعویٰ ہے کہ کار دار حیات ہمیشہ کے لئے کھیلوں سے وابستہ نہیں رکھا جا سکتا [illegible]

[illegible]

ختم نبوت کی ثقافت اور عقیدہ

[illegible]

ساده الفاظ میں خلاصہ دلیل

[illegible]

اصلاح و ارتقاء نے نفرت اور رقیبانہ ذہنیت کا اصرار

کیا ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نظریہ قابل عمل ہے

پنڈت جواہر لال نہرو کی دلچسپ تصریحات

(۱)

[illegible] ایک مضمون [illegible]

[illegible]

اور دونوں میں ہر ایک شخص کو جو موجودہ نظام [illegible] کی اصلاحی تبدیلی کا پرجوش حامی ہے اپنا حقیقی دشمن تصور کرتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد آپ نفس مضمون کی طرف آتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ڈاکٹر سر اقبال کی دلچسپی

[illegible] اسلام کے سب سے بڑے [illegible] سر محمد اقبال [illegible] کے ساتھ [illegible] کے بعض حصے [illegible] جیسا کہ وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ

[illegible] المکرمہ [illegible] کا یہ مطلب [illegible] مذہبی تعصبات سے محفوظ رکھا جا سکے [illegible] دیکھتا ہوں [illegible] پہلے سیاسی [illegible] کو کرنا چاہئے تھا۔"

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

[illegible] ہندوستان میں موجودہ [illegible] فرقہ وارانہ [illegible] لوگوں کو مذہب سے زیادہ [illegible] جاری ہے۔ اور اگر یہی کیفیت رہی تو [illegible] نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کی [illegible] مذہب جیسی اہم اور ضروری چیز بالکل [illegible] ہو جائے گی۔ اور ہندوستانی [illegible] مذہب کا [illegible] کوئی اور [illegible] کرنے لگے گا۔ [illegible] دہریت [illegible] کا [illegible] روس میں [illegible]

اشتراکیت کا خوف

اشتراکیت کے اس خوف نے یورپ کے [illegible] اور [illegible] طبقات کو فسطائیت اور [illegible] کی طرف دھکیل [illegible]

دیا ہے۔ یہاں تک کہ آپس کے [illegible] Freemasons اور Jesuits عیسائیوں کے دو فرقے ہیں۔ اول الذکر فرقہ کی بنیاد Ignatius Loyola نے ۱۵۳۴ء میں رکھی۔ اس کا بڑا اصل مقصد [illegible]۔ اور یورپ کی کاتھولک [illegible] ہے۔ مؤخر الذکر فرقہ باہمی امداد کی ایک خفیہ سوسائٹی ہے جس کی بنیاد قرون وسطیٰ میں ڈالی گئی۔ اس گروہ سے [illegible] Grand Lodges کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں ۱۷۱۷ء میں [illegible] آئرلینڈ میں ۱۷۲۵ء میں اور سکاٹ لینڈ میں ۱۷۳۶ء میں [illegible] یورپ کی [illegible] (الفضل) [illegible] کے مقابلہ کے لئے [illegible] بالائے طاق [illegible] ہندوستان میں [illegible] فرقہ وارانہ [illegible] کے خلاف [illegible]

ہر قسم کی اصلاحات کی مخالفت

سر محمد اقبال [illegible] [illegible] کے ساتھ [illegible]

ظاہر ہے کہ ہر قسم کے [illegible] اصلاحی [illegible] اور ان کی [illegible] ڈاکٹر اقبال کا [illegible] سیاسی [illegible] ایک [illegible]

[illegible] اور حقیقت یہ ہے کہ [illegible] کے نصف [illegible] قانونی [illegible] کے خلاف ہے۔ [illegible] مذہب کے [illegible]

ڈاکٹر اقبال کے اسلام میں [illegible] تنگدلی کی تعلیم

سر محمد اقبال [illegible] اسلام [illegible] مذہب [illegible] ایک [illegible] مسئلہ [illegible] پر [illegible]

اسلام کے متعلق سر محمد اقبال کا نظریہ [illegible] مذہب [illegible] ایک [illegible] تصور [illegible] مذہب کا [illegible]

جماعت احرار ایک ملغوبہ ہے

جلد ۲۹ | یوم دوشنبہ ۳ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ | نمبر ۱۹

ڈاکٹر سر اقبال مرحوم اور مغربی فلسفہ

اقبالی مذہبِ فکری مغربی افکار کا مرقع ہے

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ایک خط

اقبال اور برگساں

اقتباسات

ڈاکٹر اقبال کی مغربی فلسفہ سے اثر پذیری

ہماری اس سال کی تحریکات

علامہ اقبال مرحوم اور احمدیت

کیا احمدیت زندگی سے گریز سکھاتی ہے

(از ... [illegible])

[illegible]

جہاں کی روح رواں لا الٰہ الا ھو

[illegible]

[illegible]

باب9:

حوالے وحواشی

(1) اس تنقیدی مضمون کا خلاصہ ملک صلاح الدین احمد نے اصحاب احمد جلد یازدھم، قادیان، دسمبر 1962ء ص 283-286 پر دیا ہے۔

(2) ماڈرن ریویو کلکتہ خط مرقومہ 20 اگست 1935ء مطبوعہ نومبر 1935ء ص 504-505

(3) Peers انگلستان کے طبقہ امراء کے رکن

(4) خط کا خلاصہ اور ترجمہ مصنف نے کیا ہے اصل انگریزی خط کتاب میں درج ہے۔

(5) خط کا خلاصہ اور ترجمہ مصنف نے کیا ہے۔ اصل انگریزی متن کتاب میں درج ہے۔

(6) سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، ص: 457-459

(7) بشیر احمد ڈار، اقبال اور احمدیت، ص: 69

(8) تلخیص و ترجمہ از مصنف

(9) بشیر احمد ڈار، حوالہ سابق، ص: 73

(10) ایضاً ص: 115 ابواللیث صدیقی 'ملفوظات اقبال ص: 193

(11) The Pakistan Times, 9 November, 1977

(12) ملک محمد جعفر خان، احمدیہ تحریک سندھ ساگر اکادمی، لاہور، جنوری 1958ء، ص: 12-14

(13) ایضاً ص: 27

(14) ایضاً ص: 39

(15) ذکر اقبال، ص: 211

(16) راقم نے اپنی یادداشت اور بعض منتشر نوٹس کی مدد سے یہ تحریر اپنے الفاظ میں مرتب کی ہے۔

(17) Mian Muhammad Shafi, The Last Days of the Sage, The Pakistan

The Pakistan Times, 9 Nov, 1977

(18) نوائے وقت لاہور، 21 اگست 1987ء

(19) مولوی محمد علی کی توجہ جب ان کی مرزا صاحب کے زمانے کی تحریرات کی طرف مبذول کرائی گئی جس میں انہوں نے مرزا غلام احمد کو ہندوستان کا مقدس نبی وغیرہ کہا تھا تو انہوں نے جواب دیا "اگر آپ احمدیہ

جماعت لاہور کے متعلق کوئی فتویٰ دینا چاہتے ہیں تو جماعت کے مطبوعہ عقائد آپ کے سامنے ہیں۔تیس سال قبل کی میری ذاتی تحریرات سے انکا کوئی تعلق نہیں۔ان عقائد پر جوفتویٰ دینا چاہیں دیں۔اگر ذاتی طور پر مجھ پرفتویٰ کا سوال ہےتو ایسا کفر کا فتویٰ،جس کوتیس سال قبل کی تحریروں سے سہارا دینے کی ضرورت ہو، شاید ہی مفید ثابت ہو''۔اخبار پیغام صلح۔3فروری 1936ء۔

مولوی محمد علی کے جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر الیاس برنی لکھتے ہیں''گویا کنایۃً مولوی محمد علی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ تیس سال قبل خود مرزا غلام احمد قادیانی کی حیات اور صحبت میں ان کے جو عقائد تھے اور جن کو وہ شائع بھی کرتے تھے تکفیر کا موجب ہو سکتے ہیں۔لیکن اس دوران میں ان کے عقائد بالکل بدل گئے'' قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ ص:59

مولوی محمد علی نے بعد میں ایک دورقہ میری تحریر میں لفظ نبی کا استعمال بھی شائع کیا اور اپنے سابقہ موقف کی وضاحت کی۔

(20) محمد حنیف شاہد، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، لاہور 1976ء ص 134

(21) آئینہ صدق وصفا، سوانح ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، تالیف . مرزا مسعود بیگ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور 1964ء ص 90

(22) الفضل، قادیان، 29 فروری 1936ء

(23) الفضل، قادیان، 9 جون 1935ء

(24) علامہ اقبال مرحوم اور بانی سلسلہ احمدیہ، ڈاکٹر اللہ بخش، احمدیہ انجمن لاہور ص 9

(25) الفضل، قادیان، 25 مارچ 1935ء

باب 10

علامہ اقبال کے آخری دو سال

کشمیر کمیٹی کی صدارت کے زمانے 1931-1932ء کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کے دوسرے خلیفہ مرزا محمود احمد عملی سیاست میں آچکے تھے یوں تو وہ اس سے پہلے ہی سیاست میں دلچسپی لے رہے تھے لیکن ایک نیم سیاسی تنظیم آل انڈیا نیشنل لیگ کے قیام کے بعد انہوں نے سیاست میں مکمل کر حصہ لینا شروع کر دیا۔

نیشنل لیگ کا قیام

25 جنوری 1935ء کو مرزا محمود احمد نے اپنی سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل لیگ قائم کر دی۔ اسے ایک محدود سیاسی پلیٹ فارم کہا گیا جو سالہا سال تک جماعت کی اہم قومی اور سیاسی ضروریات پوری کرتا رہا اس کا مرکزی دفتر لاہور میں تھا۔ اس کے پہلے صدر شیخ بشیر احمد ایڈوکیٹ تھے جو تقسیم کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے اور جنہوں نے 1947ء میں باؤنڈری کمیشن کے سامنے قادیانیوں کا الگ محضر نامہ پیش کیا۔ نیشنل لیگ کی ایک نیم فوجی تنظیم احمدیہ کورز تھی۔ جماعت احمدیہ کے وہ افراد جن پر قانونی لحاظ سے کوئی رکاوٹ نہ تھی انہیں ہدایت کی گئی کہ ان جماعتوں میں شامل ہو جائیں۔(1) پنڈت جواہر لال نہرو کے قادیانی بڑے مداح تھے کیونکہ انہوں نے علامہ اقبال کے مضامین کا رد لکھا تھا۔ 29 مئی 1936ء کو وہ لاہور تشریف لائے تو نیشنل لیگ کے قادیانی رضا کاروں نے ان کا شاندار استقبال کیا صدر نیشنل لیگ نے ان کے گلے میں ہار ڈالا۔ جواہر لال زندہ باد فخر قوم فخر وطن زندہ باد اور خوش آمدید کے نعرے لگائے۔(2) لاہور جماعت کے اخبار پیغام صلح نے لکھا کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ خلیفہ قادیان کانگریس کے اشد ترین مخالف تھے۔ کانگریس کے مقابلے میں انہوں نے حکومت کی بھر پور امداد کی اور کار خاص کی خدمات انجام دیں آج وہ کانگریس کے انتہا پسند اور اشتراکی خیالات رکھنے والے صدر کے استقبال میں حصہ لے رہے ہیں۔ قادیانیوں نے تبلیغ کے

بجائے سیاست میں بھونڈے طریقے سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے(3) مرزا محمود احمد جلسہ سالانہ (1935) کے خطبے میں کانگریس سے تعاون اور مستقبل میں اس میں شمولیت کا اعلان کرنے والے تھے لیکن بعض انگریز ہمدردوں اور سر ظفر اللہ نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کریں کسی اور وقت یہ اعلان کریں۔ پنڈت نہرو کے استقبال کے بعد قادیانیوں نے کانگریس میں شمولیت کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ قادیانیوں کا کانگریس سے تعاون خود کانگرس کے لئے ''مسرت آمیز حیرانی کا باعث تھا۔''(4) کہ وہ جماعت جو ہمیشہ آزادی کی تحریکوں کے خلاف صف آراء رہی کیسے ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ نیشنل لیگ کے پنڈت نہرو کا استقبال کرنے کے سلسلے میں مرزا محمود احمد سے کئی سوالات پوچھے گئے۔ ان کا جواب تھا چونکہ پنڈت جی نے ڈاکٹر اقبال کے ان مضامین کا رد لکھا جو انہوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دئے جانے کے لئے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراضات اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور ان کے گذشتہ رویے کے خلاف ہے''(5) اس لئے یہ شاندار استقبال کیا گیا۔

پنجاب مسلم لیگ کے خلاف قادیانی پروپیگنڈا

10 اپریل 1936ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے ایکٹ آف 1935ء کے تحت ہونے والے انتخابات کے لئے مرکزی اور صوبائی بورڈ قائم کرنے کا اعلان کیا۔ 19 اپریل کو سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو شروع کی۔ قادیانی اس پارٹی کے حامی تھے اور اس کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔(6) سر فضل حسین کی تحریک پر پارٹی کے لئے 50 ہزار روپے چندہ جمع ہوا جس میں 3 ہزار روپے سر ظفر اللہ نے دیے۔

29 اپریل 1936ء کو پنجاب مسلم لیگ صوبائی بورڈ کی تشکیل کے لئے محمد علی جناح لاہور تشریف لائے لیکن سر فضل حسین نے زور دار الفاظ میں ان کو متنبہ کیا کہ بمبئے کا وکیل پنجاب کی سیاست میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ جناح صاحب نے ان سے ملاقات کی لیکن انہوں نے مسلم لیگ بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ملک برکت علی کی کوششوں سے جناح صاحب علامہ

اقبال سے ملے اورانہوں نے پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کا صدر بننا منظور کر لیا۔ اس بورڈ میں مجلس احرار اور مولانا ظفر علی خان کی اتحاد ملت پارٹی نے بھی شمولیت پر رضا مندی کا اظہار کر دیا۔

قادیانیوں نے سر فضل حسین کے ایماء پر مسلم لیگ بورڈ اور جناح صاحب کے خلاف پروپیگنڈا مہم کا آغاز کر دیا۔ مرزا محمود نے ایک ہندو سیکولر اور قوم پرست انگریزی اخبار پیپل لاہور کے 50 ہزار روپے کے حصص خرید رکھے تھے۔ اس کا مینیجنگ ایڈیٹر لالہ فیروز چند تھا اور ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اس کا ایڈیٹر تھا۔ اخبار مسلم لیگ بورڈ اور جناح صاحب کے خلاف شذرات اور اداریے شائع کرتا تھا۔ قادیانی اخبارات و رسائل خصوصاً الفضل قادیان اس زہریلے مواد کو نقل کر کے مسلم لیگ اور محمد علی جناح کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے۔

مجلس احرار نے جب بورڈ میں شمولیت پر رضا مندی ظاہر کی تو قادیانیوں نے مسلم لیگ کو متنبہ کیا کہ احرار کے ساتھ کوئی اشتراک عمل نہ کیا جائے (7) احرار یونی نسٹ پارٹی اور سر فضل حسین کے پہلے ہی سے مخالف تھے وہ شہید گنج کے مسئلہ پر اپنی سیاسی ساکھ کھو چکے تھے قادیانیوں نے احرار کو بدنام کرنے کے لئے پورے ہندوستان میں ان کے خلاف مہم چلائی۔ اخبار الفضل نے جناح صاحب کو خبر دار کیا کہ وہ احرار سے کوئی سمجھوتہ نہ کریں ان سے کسی قسم کا اشتراک پنجاب مسلم لیگ کے رہے سہے وقار کو خاک میں ملا دے گا۔ اخبار نے جناح صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ کاش وہ پنجاب کی مقامی سیاست میں مداخلت کرنے سے پرہیز کرتے تا کہ پراگندہ مسلمانوں کا شیرازہ اور زیادہ بکھرنے نہ پاتا(8) ''الفضل'' نے جناح صاحب سے پرزور انداز میں کہا کہ وہ پنجاب میں علیحدہ مسلم لیگ پارٹی نہ بنائیں بلکہ یونی نسٹ پارٹی سے تعاون کریں۔ (9) اخبار نے مسلمانوں سے اپیل کہ کہ احرار۔ لیگ اشتراک کو ناکام بنائیں کیونکہ یہ ان کے لئے ہرگز مفید ثابت نہ ہوگا اس لئے وہ اس کے خلاف آواز اٹھائیں اور اپنی بیزاری کا اعلان کریں۔ (10) مولانا ظفر علی خان کی اتحاد ملت پارٹی جو انہوں نے مسجد شہید گنج کی تحریک (1935)ء کے زمانے میں بنائی تھی در پردہ یونینسٹوں کی حلیف تھی اور احرار کی مخالف تھی۔ اس لئے الفضل نے ان کو براہ راست تنقید کا نشانہ نہ بنایا اور اپنی پوری پروپیگنڈ مہم جناح صاحب اور مسلم لیگ پر مرکوز کر دی۔ وہ علامہ اقبال کی ان

سیاسی مساعی کو جو وہ مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کو موثر جماعت بنانے کے لئے کر رہے تھے کے سخت خلاف تھے۔

اخبار پیپل لاہور کے حوالے سے الفضل مسٹر جناح کا عجیب وغریب گروہ کے عنوان سے لکھتا ہے 'لیکن یہ واقعہ ہے کہ سر فضل حسین کی پارٹی (یونی نسٹ) غیر فرقہ وارانہ ہے اور وہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں کو ان کی پارٹی میں شامل ہو کر اس پر اثر ڈالنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی اس کے برعکس مسٹر جناح کی پارٹی خالصتاً فرقہ وارانہ پارٹی ہوگی اس میں اگر کوئی خوبی سمجھی جا سکتی ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسٹر جناح اس پارٹی میں موجود ہوں گے'۔

آگے چل کر اخبار لکھتا ہے:

مسٹر جناح کی خالص اسلامی پارٹی انتخابات میں کس طرح کام کرے گی اگر مسٹر جناح نے اپنی اعلیٰ شخصیت کو خاص غرض کے لئے استعمال کرنا چاہا ہے تو وہ یہی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے لئے ہر قسم کی تائید کا بندوبست کیا جائے اقوام کے درمیان توازن رکھنے کے متعلق وائسرائے کے اعلان سے اختلاف میں مسٹر جناح نے سر فضل حسین کے مقابلے میں بھی زیادہ تیزی اور شدت سے کام کئے ہیں اس بناء پر مسٹر جناح اور ان کے ساتھی توقع رکھتے ہیں کہ مسلم ووٹر سمجھیں گے کہ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے بہتر ضامن مسٹر جناح ہی ہو سکتے ہیں یا ان کا پارلیمنٹری بورڈ۔ مسٹر جناح اپنے حق میں مسلم ووٹروں کے سامنے اس کے سوا کچھ پیش نہیں کر سکتے۔ ہم مسٹر جناح کی مساعی کے متعلق کوئی کلمہ خیر کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور ہمیں قطعاً شبہ نہیں کہ ان کی پارٹی خود اپنی لغویت کے بوجھ کی وجہ سے ٹوٹ جائے گی اگر پارٹی اپنے بانی کے تصور کے مطابق متحدہ حیثیت میں کام نہ کرے تو اس پر ہم سے بڑھ کر کوئی خوش نہ ہوگا۔(11)

محمد علی جناح صاحب 29 اپریل کو لاہور تشریف لائے یہاں چند روز ٹھہرے اور علامہ اقبال کو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل کا کام سونپ کر راولپنڈی چلے گئے جہاں کچھ روز قیام کے بعد کشمیر روانہ ہو گئے۔ اخبار الفضل جناح صاحب کے دورے کو ناکام بتاتا ہے اور لکھتا ہے۔

''مسٹر جناح لاہور سے کامیاب گئے یا ناکام ان کا دورہ ناکام ہوا ہے کوئی قابل ذکر لیڈر ان

کو اسٹیشن پر الوداع کہنے نہ آیا''(12) ایک اور اداریے میں اخبار پنجاب میں مسٹر جناح کی ناکامی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ دورہ ہر طرح سے ناکام تھا صرف اقبال نے جناح کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور اس کی سکیم کا خیر مقدم کیا ہے۔(13)

12 مئی 1936ء کو میاں عبدالعزیز کے مکان بیرون یکی دروازہ لاہور میں پنجاب مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے ایک اجلاس بلایا گیا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی اس میں علامہ اقبال کو صدر اور ملک برکت علی کو سکریٹری چنا گیا۔

21 مئی کو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا اعلان کر دیا گیا اس میں احرار کے چار اور اتحاد ملت کے تین افراد شامل تھے۔مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام کے اعلان پر الفضل نے اپنے تبصرے میں کہا''احرار سر فضل حسین کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ دیانتدار کارکن ہیں اور ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہیں بنے اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں سر ظفر اللہ خان کے تقرر کی مخالفت نہیں کی۔احرار اتحاد پارٹی میں اس لئے شامل نہیں ہوئے کہ احمدی جنہوں نے پنجاب کونسل میں بھی یونینسٹ پارٹی کی نہایت اعلیٰ خدمات دیکھی ہیں اس کے رکن ہیں اور وہ لیگ میں بھی اس وقت تک شامل نہیں ہوں گے جب تک احمدی اس کے ممبر ہیں لیکن سر فضل حسین بخوبی جانتے ہیں کہ ایک قادیانی احرار کے سارے کے سارے گروہ سے بہتر ہے۔مسٹر جناح کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ سابقہ واقعات سے سبق حاصل کرتے ہوئے احرار کو اپنے سیاسی دائرہ سے دور رکھیں ورنہ انہیں بھی امن میں رہنا نصیب نہ ہوگا''۔(14)

مرزا محمود احمد کی سودے بازی

مرزا محمود احمد نے مسٹر محمد علی جناح کو ایک خط لکھا کہ اگر احمدیوں کو مسلم لیگ میں شامل نہ کیا گیا تو وہ کانگریس کے ساتھ مل جائیں گے۔

محمد علی جناح نے یہ خط علامہ اقبال کو بھجوا دیا۔نذیر نیازی اس خط پر علامہ اقبال کی مندرجہ ذیل رائے کا ذکر کرتے ہیں۔

ارشاد ہوا: جناح نے مرزا محمود احمد (مرزا بشیر الدین محمود، خلیفہ قادیان) کا خط مجھے بھیج دیا ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں: ہماری جماعت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے ہمیں لیگ میں شامل نہ کیا تو مجبوراً کانگرس میں شمولیت کرنا پڑے گی۔

میں نے عرض کیا: آپ کی کیا رائے ہے؟

فرمایا رائے کا کیا سوال ہے، لیگ میں شامل ہوں یا کانگریس میں، ہم ان کی شمولیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جو جی چاہے کریں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرزا صاحب کے نزدیک ہم مسلمان، مسلمان ہیں یا نہیں اور انہیں بھی اسلام کا دعویٰ ہے تو پھر لیگ یا کانگریس میں شرکت اور عدم شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں بہر حال لیگ میں شامل ہونا چاہئے۔ لیکن مرزا صاحب تو لیگ اور کانگریس سے سودا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یا تو بہ حیثیت ایک جماعت وہ مسلمانوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں یا ہمیں مسلمان ہی نہیں سمجھتے......

میں نے کہا لاہوری جماعت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ یہ جماعت تو ہماری تکفیر نہیں کرتی۔

فرمایا: یہ ٹھیک ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک اس کا جرم یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو مسلمان بلکہ بہتر مسلمان سمجھتی ہے جو مسلمانوں کی تکفیر کر رہے ہیں،۔(15)

محمد علی جناح نے جو اس وقت کشمیر میں تھے 8 جون 1936ء کو مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا لاہور میں اجلاس طلب کیا۔ قادیانی اور یونی نسٹ پارٹی کے اراکین اس اجلاس کو ناکام بنانے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے۔ یونی نسٹ عناصر اور ان کے حامی اخبارات نے ان کے خلاف ناشائستہ الفاظ استعمال کئے اور اجلاس سے پہلے ان کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کرنے کا پروگرام بنایا۔ مرزا محمود اپنی نیم فوجی تنظیم نیشنل کور کے ممبروں کو اس استقبال میں شامل کرنے پر تیار تھے تا کہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو اور مظاہرہ زوردار ہو لیکن علامہ اقبال کی ذات والا صفات اور ان کے نیاز مندوں کی اخلاقی قوت سے مرعوب ہو کر یونی نسٹ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ مرکزی بورڈ کا جب اجلاس جاری تھا تو یونی نسٹ پارٹی کی ہدایت کے مطابق مولانا ظفر علی خان نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بورڈ کی رکنیت سے استعفےٰ دے دیا۔ احرار کے چار نمائندے اجلاس میں موجود رہے لیکن

بعد میں وہ بھی بورڈ کو چھوڑ گئے۔(16)

احرار کے اصرار پر پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے حلف نامے میں یہ شق شامل کی گئی 'میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر قادیانیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کے لئے انتہائی کوشش کروں گا۔(17)

اقبال اور مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں یونی نسٹ پارٹی کے اشارے پر بورڈ سے علیحدہ ہوئے حالانکہ علامہ اقبال کو یقین تھا کہ احرار اور اتحاد ملت دوبارہ مسلم لیگ سے مل جائیں گی۔ انہوں نے اس سلسلے میں قائداعظم کو 23 مئی 1936ء کو ایک خط بھی لکھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ ظفر علی خان کے رویے سے مطمئن نہیں تھے۔

علامہ اقبال نے مولانا ظفر علی خاں اور ان کی اتحاد ملت پارٹی کے سر فضل حسین کی یونی نسٹ پارٹی اور قادیانیوں سے اشتراک پر ایکس شاعر کے قلمی نام سے چند نظمیں کم ٹومی اور لا الہٰ اللہ فرنگی وغیرہ لکھیں جو مسلم لیگی اخبار احسان میں شائع ہوئیں۔(18) ان کا انداز ویسا ہی ہے جیسا مولانا ظفر علی خاں کی ایک زمانے میں قادیان کے خلاف نظموں کا ہوتا تھا، وہی تیکھے محاورات، طنزیہ اشارے اور شگفتہ تراکیب استعمال کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں قادیان کے سیاسی کردار کو بڑی عمدگی سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

9 جولائی 1936ء کو سر فضل حسین وفات پا گئے۔ وہ قادیانیوں کے محسن اعظم تھے جن کی سرپرستی میں ظفر اللہ نے سیاست میں مقام پیدا کیا اور وائسرائے کی کونسل کے ممبر بنے لیکن ان کی محسن کشی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی جیسا کہ ظفر اللہ نے قائداعظم کی نماز جنازہ نہ پڑھ کر محسن کشی اور احسان فراموشی کا ارتکاب کیا تھا۔ ان کے جنازے کے ساتھ جو غیر مسلم ہندو اور سکھ گئے تھے قادیانی ان کے ساتھ علیحدہ کھڑے رہے۔ دراصل یہی ان کا مقام تھا اور ہے۔

انتخابات میں مسلم لیگ کو دو نشستیں ملیں راجہ غضنفر علی کامیاب ہو کر یونینسٹوں کے ساتھ مل گئے اور ملک برکت علی باقی رہ گئے۔

صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست پر مرزا محمود نے یہ تبصرہ کیا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری مخالفت بہت عام ہو گئی تھی حتیٰ کہ مسلم لیگ جس کے اجلاس بعض دفعہ نہ ہو سکتے تھے اور وہ مجھ سے روپیہ لے کر اجلاس کرتی تھی اسے بھی زکام ہوا۔ اور اس کی پنجاب شاخ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ احمدی اس کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ یہ کفران نعمت کی انتہا تھی لیکن اس کی وجہ یہی تھی کہ اس وقت ہمارے خلاف لوگوں میں اتنا جوش تھا کہ انہوں نے خیال کیا کہ اگر ہم نے احمدیوں کو شامل رکھا تو لوگ ہمیں ووٹ نہیں دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی ایک ہی نشست ہے گویا وہ بھی ہمارے برابر ہیں جو یقیناً ہماری فتح ہے۔ ہماری جماعت تو مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ایک ہی ضلع میں ہوں تو ہم دو ممبریاں بھی لے سکتے ہیں مگر ہم پھیلے ہوئے ہیں اس لئے ایک ممبری کا حصول بھی ہمارے لئے ناممکن ہے پس ایک نشست کا حاصل کر لینا بھی ہماری بڑی فتح ہے لیکن ان (مسلم لیگ) کا صرف ایک نشست حاصل کر لینا ان کی سخت شکست ہے۔ بہر حال اس وقت تک ہم مسلمانوں کا ایک حصہ سمجھے جاتے تھے مگر مسلمانوں نے گذشتہ فتنہ سے مرعوب ہو کر ہمیں اس طرح الگ کرنے کی کوشش کی جس طرح دودھ سے مکھی نکال دی جاتی ہے۔'' (19)

کانگریس میں شمولیت کے لئے قادیانیوں کی تگ و دو

1937ء کے انتخابات میں کانگریس کو کامیابی حاصل ہوئی اور یوپی، مدراس، بمبئی وغیرہ میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں مرزا محمود نے اپنے خطبوں میں کانگریسی لیڈروں سے روابط بڑھانے اور کانگریس میں باقاعدہ شمولیت کے کئی اشارے دیئے۔ الفضل نے کانگریسی وزارتوں کے قیام پر اظہار مسرت کیا اور مسلم لیگ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ (20) مرزا محمود نے قادیانی تنظیم نیشنل لیگ کے اجلاس میں کانگریس کی قومی خدمات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے عمل

اور رواداری سے مسلمانوں سے خیر خواہی ثابت کر کے انہیں مطمئن کرے۔(21)

نیشنل لیگ کے ایک اجلاس میں نیشنل کورز کے رضا کاروں کے سپاس نامے کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ پہلے سے سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔ پیغام صلح نے کہا کہ یہ درست ہے لیکن اپنی جماعت کے سیاسی کارناموں کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے ان خفیہ سرگرمیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جو قادیانی جماعت (کانگریس کے) سول نافرمانی 1930ء کے ایام میں حکومت کی امداد میں ان کے خلاف انجام دیتی رہی۔(22) اخبار نے بار بار قادیان جماعت کی سیاسی روش اور کانگریس کی حمایت کی پالیسی پر تنقید کی اور کہا جماعت قادیان سیاسی مشاغل میں منہمک ہے۔ قادیان میں کوریں اور فوجیں تیار ہو رہی ہیں، ظاہر اور پوشیدہ سیاسی کاروائیاں جاری ہیں، قادیانی نیشنل لیگ کے جلسے منعقد ہو رہے ہیں۔ خلیفہ کے پر اسرار سفر جاری ہیں۔(23)

اخبار نے 13 اکتوبر 1937ء کو قادیانی نیشنل لیگ کے ایک اجلاس کی کاروائی کی روداد شائع کی جس میں مرزا محمود نے ایک سیاسی تقریر کی تھی۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ مرزا محمود اپنے قادیانی پیروکاروں کی اندھی عقیدت کا خراج وصول کر رہا ہے۔ وہ تبلیغ کے نام پر روپیہ اکٹھا کر کے اسے بے دریغ ضائع کر رہا ہے۔ اس کی تقریر مایوس کن اور اس کی معلومات سطحی اور محدود اور خیالات مضحکہ خیز ہیں جلسے کے اختتام پر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کو بار بار یہ شعر پڑھتے سنا۔

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے

کردار بے سوز گفتار واہی (24)

پیغام صلح 'قادیان کے سیاسی مناظر' کے عنوان سے اپنے اداریے میں لکھتا ہے کہ 3 نومبر 1937ء کو قادیان میں میر اسحٰق (مرزا محمود کے ماموں۔مصنف) کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں دو پارٹیوں میں کانگریس میں شمولیت پر مباحثہ ہوا۔ حق میں تین میں سے دو ججوں نے فیصلہ دیا پیغام صلح نے اس جلسہ پر اپنے تبصرے میں کہا ''سیاسی سودوں کے دوران جماعت احمدیہ کے طلبہ اور نوجوانوں کے اس قسم کے سیاسی مناظرے قیمت بڑھانے کا موجب ہو سکتے

ہیں‘‘۔ (25)

پیغام صلح نے ایک اور اداریے ’قادیانی اور کانگریس‘ میں لکھا کہ مرزا محمود احمد خلیفہ قادیان آج تک اپنے خطبوں میں برطانوی حکومت کی عملی حمایت اور کانگریس کی تمام تحریکوں کو ناکام کرنے کا ذکر کرتے رہے اس کے لئے انہوں نے کارخاص کے علاوہ لاکھوں روپے خرچ کیئے ان کا کہنا تھا کہ حکومت مخالف تحریکوں میں ان کے لیکچرار جاتے۔ ان کے تین ہزار والینٹیر یہ کام کرتے رہے انہوں نے حکومت کی اندھی اور غیر مشروط وفاداری اور کانگریس کی مخالفت میں سرتوڑ کوشش کی لیکن آج ان کی حمایت کررہے ہیں۔ ہم (پیغام صلح) اس وقت چوکنے ہو گئے تھے جب قادیانی نیشنل لیگ نے پنڈت نہرو کو لاہور سٹیشن پر سلامی دی۔ شروع اکتوبر 1937ء میں خلیفہ صاحب لاہور آئے، نیشنل لیگ نے ایڈریس پیش کیا جواب میں انہوں نے کانگریس کی تعریف کی۔ بعض ہندو اخباروں نے اس وقت ہی قادیانیوں کی کانگریس میں شمولیت کا اعلان کر دیا تھا۔ (26)

پیغام صلح ایک اور اداریے میں لکھتا ہے:

اگر قادیانی جماعت کانگریس میں شامل ہوگئی تو دلچسپ مناظر دیکھنے میں آئیں گے۔ قصر خلافت پر سہ رنگا کانگریسی جھنڈا لہرائے گا بندے ماترم کا گیت گایا جائے گا قادیانی نیشنل لیگ کی کوریں کانگریسی لیڈروں کی آئے دن سلامی اتارا کریں گی۔ کانگریس کے حکم کی تعمیل میں وہ مارے مارے پھریں گے اس طرح ممکن ہے قیادت وخلافت کے خدائی اجارہ داروں کی رضا کاری کا تماشہ بھی دنیا دیکھ لے۔ (27)

26 نومبر 1937ء کو دو کانگریسی لیڈر لاڈو رانی زتشی اور گیانی اندر جیت سنگھ قادیان گئے شیخ بشیر احمد صدر نیشنل لیگ کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا۔ (28) جس میں انہوں نے تقریر کی اس کے علاوہ لاڈو رانی زتشی کی صدارت میں ایک مباحثہ ہوا جس میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوا کہ قادیانی جماعت کانگریس میں شامل ہو جائے اور یہ موقف قیام پاکستان تک قائم رہا۔ (29) الفضل قادیان نے مسلم لیگ پر تنقید جاری رکھی ضمنی انتخابات میں کانگریس کی کامیابی پر اظہار مسرت کیا اور مسلم لیگ کی مذمت کی۔ (30)

18 فروری 1938ء کو اخبار زمیندار لاہور نے اطلاع دی کہ قادیانیوں نے پنجاب مسلم لیگ کے خلاف ایک شکایت بھیجی ہے کہ مرزائی جماعت کو صوبائی لیگ والے کافر سمجھتے ہیں اور لیگ کا ممبر نہیں بناتے ۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سر محمد اقبال، صدر صوبائی مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ چونکہ مرزائی صرف اپنے آپ کو مسلمان اور دوسرے مسلمانوں کو کافر گردانتے ہیں اس لئے انہیں لیگ کا ممبر اس وقت تک بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جب تک وہ دوسرے مسلمانوں کو مسلمان نہ مانیں۔

پیغام صلح لاہور نے زمیندار کی اس خبر پر معاصر احسان لاہور کے 19 فروری 1938ء کے تبصرہ کا ذکر کیا جس میں کہا گیا تھا کہ قادیانی ایسا کیوں نہیں کرتے اگر وہ لیگ کا ممبر بنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پیغام صلح اپنا نقطہ نظر بیان کرتا ہے۔

'' قادیانی حضرات کا یہ فرض ہے کہ پنجاب کی مسلم لیگ اور سر محمد اقبال کے طرز عمل اور روزنامہ احسان کے اعتراض کا کوئی جواب ہے تو پیش کریں۔ بات معقول ہے اگر قادیانی حضرات باقی کلمہ گو مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے تو پھر دوسروں سے اس کی توقع کیوں رکھتے ہیں اور ان کافر مسلمانوں کی انجمنوں اور جماعتوں میں گھسنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔'' (31) واضح رہے کہ مسلم لیگ نے پنجاب پارلیمنٹری بورڈ میں یہ قرارداد منظور کرائی تھی کہ مسلم لیگ کے نمائندے اگر اسمبلی میں کامیاب ہوں گے تو ان کا مقصد مرزائیت کا استیصال ہوگا۔ اس کے بعد پنجاب کی نئی قائم ہونے والی مسلم سٹوڈینٹس فیڈریشن نے بھی یہ اصول قائم کیا کہ کوئی مرزائی اس کا رکن نہیں ہوسکتا۔ (32)

نہایت نامساعد سیاسی حالات اور اپنی علالت کے دوران علامہ اقبال نے مسلم لیگ کی قیادت کا فریضہ انجام دیا انہوں نے مختلف سیاسی مسائل پر محمد علی جناح کو 18 ماہ کے عرصے میں 13 خطوط لکھے۔ محمد شریف طوسی نے ان خطوط کو 1943ء میں شائع کر دیا ان خطوط میں علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت، محمد علی جناح کی قیادت پر اعتماد، لیگ کی تشکیل کے مسائل اور ان کی مساعی جمیلہ کی جھلک موجود ہے۔ آخر کار 1947ء میں مصور پاکستان کا خواب عظیم قائد کی انتھک محنت سے شرمندہ تعبیر ہوا۔

(19) فاروق قادیان جلد 23 نمبر 43 مورخہ 11 نومبر 1938ء

(20) پیغام صلح لاہور 8 اکتوبر 1937ء

(21) الفضل قادیان 10 اکتوبر 1937ء

(22) پیغام صلح لاہور 12 اکتوبر 1937ء

(23) پیغام صلح لاہور 15 اکتوبر 1937ء

(24) پیغام صلح لاہور، 13 اکتوبر 1937

(25) پیغام صلح، لاہور، 8 نومبر 1937ء

(26) پیغام صلح لاہور، 17 نومبر 1937ء

(27) پیغام صلح لاہور، 12 نومبر 1937ء

(28) پیغام صلح لاہور، 30 نومبر 1937ء

(29) غلام بنی مسلم، قیام پاکستان کے لئے انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کی جدوجہد لاہور، ص 18

(30) پیغام صلح لاہور 17 نومبر 1937ء

(31) پیغام صلح لاہور 21 فروری 1938ء

(32) پیغام صلح لاہور 21 اکتوبر 1938ء

باب 11

سر ظفر اللہ کی آئینی سکیم (1940)

شیخ عبدالماجد نے مسلمانوں کی جدو جہد آزادی کے ہر اہم واقعہ کو قادیانیوں کے کھاتے میں ڈالنے اور تاریخی حقائق مسخ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی انہوں نے واضح حقائق کو توڑ مروڑ کر سر ظفر اللہ اور مرزا محمود کو سیاسی معاملات میں کریڈٹ دینے کی کوشش کی ہے اور ان کو عظیم سیاسی مدبر کے طور پر پیش کیا ہے چاہے ان کا عمومی کردار منفی ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل وہ ہندوستان میں آئینی ارتقا کی تاریخ سے نا واقف ہیں انہوں نے ادھر ادھر سے سطریں جوڑ کر عجیب و غریب خیال آفرینیاں کی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اوائل مارچ 1940ء میں مرتب کی گئی ظفر اللہ کی ایک آئینی تجویز کو قرار داد لاہور بلکہ گزشتہ نصف صدی میں پیش کی جانے والی تمام دستوری سکیموں سے اعلیٰ تر قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں ''سر سید سے لے کر قرار داد لاہور تک دوصد بیانات پر ان (سر ظفر اللہ) کا ڈرافٹ یعنی Separation Scheme فوقیت رکھتا ہے۔ کیا یہ تمام خصوصیات اقبال سمیت دوصد حضرات کے بیانات میں سے کسی کے بیان میں یک جائی طور پر پائی جاتی ہیں، ہرگز نہیں''۔(1)

وہ مزید لکھتے ہیں۔

''اس مہم میں جو حضرات قائداعظم کے معاون تھے ان میں سے بعض کو بجا طور پر تاریخ میں قائد کے ساتھ لائق اکرام مقام دیا گیا ہے مگر جس شخصیت (ظفر اللہ) کا بیان علامہ اقبال سمیت سب بیانات پر بھاری اور فضیلت کا حامل ہے، اسے بلکل نظر انداز کر دینا تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔''(2)

سر ظفر اللہ کی سکیم اور ولی خان

ظفر اللہ کی علیحدگی کی سکیم Separation Scheme کا چرچا 1981ء کے آخر میں ہوا جب

بزرگ سیاست دان ولی خان نے ہفت روزہ چٹان لاہور کو دیئے گئے ایک انٹرویو (مطبوعہ 21 دسمبر 1981ء) میں الزام لگایا کہ انگریز نے قرارداد لاہور کے لئے اس مذہبی طبقے (قادیانیوں) کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ''جو انگریز ہی کا خود کاشتہ پودا تھا'' اور جو بظاہر مسلم سوسائٹی کا ایک حصہ تھا مگر درپردہ اسلام کی قوت عمل اور مسلمانوں کے ملی اقتدار کا سخت مخالف تھا اسے انگریز نے اسی کام کے لئے تیار کیا تھا کہ وہ اسلام کے گھر میں نقب لگا کر مسلمانوں کی اجتماعی رسوائی کا سامان فراہم کرے۔ اس پولیٹیکل تنظیم (جماعت احمدیہ۔ مصنف) کو انگریز کی طرف سے ہر طرح کی اعانت حاصل تھی یہ اس کی پرانی نمک خوار تنظیم تھی اس تنظیم کا لیڈر مسٹر ظفراللہ خان آگے بڑھا اور اس نے گورنمنٹ برطانیہ کی ذہنی پریشانی دور کر دی۔ اس نے برصغیر کی تقسیم کا ''قابل عمل'' فارمولا تیار کیا اس نے مسودہ وائسرائے لارڈ لنلتھگو کے سپرد کر دیا۔ وائسرائے نے اس مسودہ پر غور کیا اور اپنی سفارشات کے ہمراہ حکومت برطانیہ کے اسسٹنٹ سکریٹری کو روانہ کر دیا اس مسودے پر ان کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ مسٹر ظفراللہ نے حکومت برطانیہ سے درخواست کی کہ مسلم لیگ اور اس کے قائدین کو اس بات سے آگاہ نہ کیا جائے کہ اس مسودہ کا خالق وہ ہے کیونکہ وہ ایک ایسے اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جسے مسلمان پسندیدہ نظروں نہیں دیکھتے اگر مسلمانوں کو اس کا علم ہو گیا کہ اس فارمولا کا خالق وہ ہے تو اس سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ مقاصد حاصل نہ ہوں گے بلکہ مسلمانوں میں ایسا ردِعمل پیدا ہوگا جو اس فرقے کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا جبکہ انگریز کو اپنے مقاصد کے علاوہ اس نمک خوار فرقے سے بھی دلچسپی ہے...... راقم (ولی خان) کا خیال ہے کہ مسٹر ظفراللہ خان نے اپنے طرز عمل سے نہ صرف عام مسلمانوں کو دھوکہ دیا بلکہ قائداعظم اور ان کی جماعت مسلم لیگ سے بھی غداری کی اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید تاریخ کے فیصلے کچھ اور ہوتے بہر حال لارڈ لنلتھگو نے اس منصوبہ کی ایک نقل قائداعظم اور مسٹر حیدری (سر اکبر) کو بھیج دی لیکن ان دونوں پر ظاہر نہیں کیا کہ اس منصوبہ کا خالق کون ہے؟ یہ خط 12 مارچ 1940ء کو جاری ہوا اور 23 مارچ 1940ء کو لاہور ریزولیوشن پاس ہو گیا''۔(3)

ولی خان نے اپنی کتاب (4) میں بھی یہی الزام دہرایا ہے کہ انگریز نے ظفر اللہ سے ایک آئینی منصوبہ تیار کرایا اور اسے مسلم لیگ کو بھیج دیا تا کہ اسے 23 مارچ 1940ء کے اجلاس میں قرار داد لاہور کے طور پر منظور کرے۔ ان الزامات کو محققین نے تاریخی حقائق کی روشنی میں مسترد کر دیا ہے۔ قرار داد لاہور ایک الگ دستاویز ہے اور ظفر اللہ کی سکیم ایک الگ آئینی فارمولا ہے (5) قرار داد ایک طویل گفت وشنید اور بحث مباحثے کے بعد فروری 1940ء میں تیار ہو چکی تھی۔ ظفر اللہ کا مسودہ مارچ کے دوسرے ہفتے میں وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے محمد علی جناح اور اکبر حیدری کی معلومات کے لئے روانہ کیا۔ قرار داد لاہور کے مرتبین میں سے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے ولی خان کے الزامات کی پر زور تردید کی اور تاریخی حقائق پیش کیے۔ (6) خود ظفر اللہ نے ولی خان کے تمام الزامات کو رد کر دیا ہے اس لئے اس بحث میں ہم نہیں پڑتے۔ ہم ظفر اللہ کی سکیم کا جائزہ لیتے ہیں جس کے بارے میں شیخ عبدالماجد کا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کی ان تمام سکیموں سے برتر ہے جو انہوں نے سرسید سے لے کر 1940ء تک پیش کیں۔

سر ظفر اللہ کی سکیم سے پہلے زیر غور سکیمیں

سر ظفر اللہ نے اپنی علیحدگی کی سکیم جس کی وضاحت آگے کی جائے گی مارچ کے اوائل میں تیار کر کے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کو دے دی۔ وہ اس کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ قرار داد لاہور سے 12 روز پیشتر وائسرائے نے اس کی ایک نقل جناح صاحب کو بھجوائی اور 12 مارچ 1940ء کو سیکریٹری آف سٹیٹ لارڈ زیٹ لینڈ کو 32 صفحات پر مشتمل اس سکیم کی کاپی ایک خط کے ساتھ روانہ کی۔ اس کا نام Separation Scheme تھا۔ ظفر اللہ نے اپنے ایک وضاحتی نوٹ میں اس سکیم کی تفصیل بتائی ہے۔ اس نوٹ سے پہلے پاکستان ٹائمز میں یہ پوری سکیم شائع ہوئی (7) اور اخبار کے مدیر زیڈ اے سلہری مرحوم نے اس پر ایک عمدہ تبصرہ لکھا۔ (8)

ظفر اللہ کی سکیم ہندوستان کے برطانوی دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے ایک ڈومینین (Dominion) کی حیثیت سے اس کو خود مختار درجہ دینے کے بارے میں ان مباحث کا حصہ تھی جو

گزشتہ چوتھائی صدی سے جاری تھیں ان میں خیری برادران کی سکیم (1917)، عبدالقادر بلگرامی کا تقسیم ہند کا فارمولا (1920)، سردار گل محمد خان کی ہندوستان کی تقسیم کا خاکہ (1922)، مولانا محمد علی جوہر کی ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کا منصوبہ (1924)، لاجپت رائے کی تجویز (1924)، سر آغا خان (1928)، علامہ اقبال (1930)، چوہدری رحمت علی (1933)، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1938)، ڈاکٹر عبداللطیف، میاں کفایت علی پنجابی، علی گڑھ کے پروفیسر سید ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضال قادری اور سر سکندر حیات کی آئینی تجاویز اور سکیمیں شامل تھیں۔ ان مباحث کا پس منظر یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس (سٹے ٹیوٹ آف Statute of West Minister ویسٹ منسٹر ٹائپ) کا درجہ دینے کو تیار تھی جیسا کہ دولت مشترکہ کی دیگر ڈومینینوں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کو حاصل تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا تھا کہ ڈومینین (نیم مختار) ہندوستان میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے مقابلے میں کیا تحفظات حاصل ہوں گے اور جب تک یہ تحفظات حاصل نہ ہوں گے مسلم لیگ کسی آئینی سکیم کو تسلیم نہیں کرے گی۔ درج بالا سکیمیں ہندو اکثریت کی طرف سے ممکنہ خطرات کے ازالے کے لئے پیش کی جا رہی تھی۔ بنیادی طور پر یہ تین قسم کی سکیمیں تھیں:۔

1 پاکستان سکیم
2 مشرقی و مغربی خطوں میں علیحدہ علیحدہ وفاق کی سکیم
3 ڈومینین ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ خودمختاری پر مبنی سکیم (9)

ظفر اللہ نے ان میں سے بعض سکیموں کا نام لئے بغیر ایک جائزہ پیش کیا انہوں نے کوئی انوکھی، بے مثل یا فوقیت کی حامل تجویز پیش نہیں کی۔ (10) مسلم لیگ کی آئینی کمیٹی اور فارن کمیٹی ایسی سکیموں پر 40-1939ء میں غور کر چکی تھی اور مسلم زعماء سے طویل سلسلہ مذکرات کے بعد انہوں نے قرارداد لاہور کا ڈرافٹ تیار کر لیا تھا جو بعض ترامیم کے بعد قرار '' لاہور کی صورت میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں پیش ہوا۔ یہ ظفر اللہ کی سکیم سے مختلف ہے حالانکہ ظفر اللہ کہتے ہیں

کہ ان کی علیحدگی کی سکیم قرارداد لاہور سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ علیحدگی سے مراد ڈومینین کے اندر دو وفاق ہیں جو مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ہوں۔

سر ظفر اللہ کی سکیموں کا خلاصہ

سر ظفر اللہ نے چوہدری رحمت علی کی پاکستان سکیم کو یکسر مسترد کر دیا کیونکہ اس میں آبادی کے انتقال اور تبادلے کا ذکر تھا اور یہ بات ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے مصیبت اور پریشانی کا باعث بن سکتی تھی اس کے علاوہ ان کے خیال میں یہ مسئلہ کا کوئی آئینی حل نہ تھا۔

ظفر اللہ نے دو قسم کی سکیمیں پیش کیں ایک سکیم کو وہ علیحدگی کی سکیم Separation Scheme کہتے ہیں اور دوسری کو آل انڈیا فیڈریشن کا نام دیتے ہیں۔

علیحدگی کی سکیم

1 ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک فیڈریشن بنائی جائے جس میں پنجاب سندھ، سرحد، بلوچستان اور قبائلی علاقہ شامل ہوں۔

2 ہندوستان کے شمال مشرقی حصے میں ایک فیڈریشن قائم کی جائے جس میں آسام اور بنگال کے صوبے ہوں۔

3 اس وقت موجود صوبائی حدود کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

4 باقی ہندوستان میں ایک یا ایک سے زیادہ فیڈریشن ہوں۔

5 ان فیڈریشنوں کو اختیار حاصل ہو کہ وہ کسٹمز، ریلوے، ڈاک و تار، نشریات، شہری ہوا بازی سے متعلق معاہدات اور میثاق طے کر سکیں اور ہندوستان کے دفاع کے لئے مشترکہ فوج اور دفاعی نظام قائم کریں۔

6 شمال مشرقی اور شمال مغربی فیڈریشنوں اور ہندوستان میں قائم دوسری فیڈریشن یا فیڈریشنوں کا تاج برطانیہ سے براہ راست رابطہ ہو دوسرے لفظوں میں ایک کل ہند مرکز All India

Centre نہ ہو بلکہ برطانیہ کا ان سے براہ راست تعلق قائم رہے۔ اس سکیم سے ان کے خیال میں فرقہ وارانہ کشیدگی کم ہو گی اور درج بالا معاہدات Conventions بہت حد تک ہندوستان کا اتحاد قائم رکھ سکیں گے۔(11)

سر ظفر اللہ کی سکیم کا قرار داد لاہور سے موازنہ

مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940ء کی قرار داد سے ظفر اللہ کی علیحدگی کی سکیم کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا کہ۔

1 ظفر اللہ ایک ایسے کل ہند مرکز All India Centre کا ذکر کر رہے ہیں جو غیر مسلم صوبوں کے وفاق یا وفاقوں سے معاہدات کر سکے اور ہندوستان کے مشترکہ دفاع میں حصہ لے۔ قرارداد لاہور میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

2 ظفر اللہ ہندوستانی فیڈریشنوں کے تاج برطانیہ سے تعلقات کو برقرار رکھتے ہیں جب کہ قرارداد لاہور میں ایسے کسی تعلق کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔

3 مسلم لیگ نے قرار داد لاہور کا مسودہ 4 فروری 1940ء کو تیار کر لیا تھا اور ظفر اللہ کی سکیم ایک ماہ بعد 6 مارچ 1940ء کو مرتب کر کے وائسرائے کو بھجوائی گئی اور اس نے اس کی ایک کاپی محمد علی جناح اور اکبر حیدری کو دی۔

4 قرار داد لاہور میں کہا گیا ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے متصل اکائیوں کی ایسے خطوں کی صورت میں حد بندی کی جائے کہ جن کی تشکیل ضروری علاقائی ردو بدل کے ساتھ اس طرح ہو کہ مسلم آبادی کے اکثریتی علاقوں میں جیسا کہ ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ہے آزاد مملکتیں بن جائیں ان مملکتوں میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور آزاد مملکتیں بن جائیں ان وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی معاشی ، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی حفاظت کے لئے ان کے مشورے سے معین و موثر تحفظات مہیا کئے جائیں۔ ظفر اللہ کی سکیم میں ایسی کوئی بات نہیں اس کے باوجود ظفر اللہ کا یہ کہنا ہے کہ قرار داد

لاہور (پاکستان) ان کی درج بالا علیحدگی کی سکیم سے ملتی جلتی تھی اس کو 9اپریل 1946ء کے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ارکان کے اجلاس دہلی میں پاکستان کا نام دیا گیا۔ (12) اگر ایسی ہی مماثلت تلاش کرنی ہے تو بعض دوسری سکیموں میں بھی مل جائے گی۔ ظفراللہ کی سکیم ایک لحاظ سے کابینہ مشن منصوبہ 1946ء کی گروپنگ سکیم سے زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔

سر ظفراللہ کی متبادل سکیم

علیحدگی کی سکیم کے بعد ظفر اللہ نے اپنے 32 صفحات پر مشتمل نوٹ میں جو وائسرائے کو ارسال کیا ایک اور سکیم کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک کمزور اور غیر تسلی بخش متبادل سکیم ہے اس کو انہوں نے ڈومینین سٹیٹس کی بناء پر آل انڈیا فیڈریشن کے قیام کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شاید مسلمانوں کو قابل قبول نہ ہو پھر بھی وہ اس کو یکسر مسترد نہیں کریں گے اور اس کی بناء پر کوئی باہمی حل تلاش کرلیں گے۔ انہوں نے اپنے نوٹ کے متن کا تین چوتھائی حصہ اس کو بیان کرنے میں صرف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 1935ء کے ایکٹ میں جو فیڈرل سکیم ہے اس میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس پر بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں نمایاں انقلابی تبدیلیاں کی جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایکٹ آف 1935ء میں بڑی تفصیل سے موجود فیڈرل دفعات اور ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور وسیع پیمانے پر تحفظات تجویز کئے ہیں مثلاً متحدہ ڈومینین میں صوبوں کے لئے زیادہ سے زیادہ خود مختاری، مرکز کے پاس کم سے کم اختیارات، متحدہ ڈومینین کی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں وغیرہ تاکہ یہ مسلمانوں کے لئے متبادل سکیم کے طور پر قابل قبول ہو۔(13)

سر ظفر اللہ کی سکیم کے قابل اعتراض پہلو

ظفر اللہ اپنی آل انڈیا فیڈریشن سکیم میں دو عجیب وغریب تجاویز پیش کرتے ہیں۔

1 شمال مغربی ہندوستان سے شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقوں Tribal Areas کو علیحدہ کر دیا جائے۔

2 نہ صرف ان کو علیحدہ کر دیا جائے بلکہ بلوچستان کو بھی نکال دیا جائے اس کو یا تو سرحد، یا پنجاب یا سندھ سے ملا دیا جائے۔

معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ دو تجاویز کیوں پیش کیں اور ان کا کیا منطقی جواز تھا۔ اس کی انہوں نے نوٹ میں کوئی وضاحت نہیں کی کہ آخر وہ یہ دو عجیب وغریب تجاویز کیوں پیش کر رہے ہیں۔ یہ تجاویز مسلمانوں کو ایک بڑے علاقے سے محروم کرنے کا باعث بن سکتی تھیں۔ پروفیسر اسلم ملک کہتے ہیں کہ شاید ظفر اللہ کو اپنے ذرائع معلوم ہوا ہوگا کہ برطانوی حکومت اس اہم سیاسی دور (1940)ء میں کوئی آزاد بلوچستان ریاست کے منصوبے یا افغان بلوچ آزاد ریاست قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے اور اس کے لئے انہوں نے ایسی تجویز پیش کی دوسری بات یہ ہے کہ قادیانی تقریباً نصف صدی سے افغانستان کے خلاف مذموم پروپیگنڈا اور نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ مرزا غلام احمد کے زمانے (1903)ء میں افغان حکومت نے انگریز کے حامی دو قادیانی جاسوسوں صاحبزادہ عبداللطیف اور عبدالرحمٰن کو سنگسار کیا تھا جس پر مرزا صاحب نے ایک کتاب تذکرۃ الشہادتین (1903)ء لکھ کر انگریز کی پالیسی کی تعریف اور کابل حکومت کی سخت مذمت کی۔ انگریزوں کی کابل کے ساتھ جنگ (1919)ء میں قادیانیوں نے بھرتی، مالی امداد اور ہر طرح سے حکومت کی مدد کی۔ مرزا محمود 1924ء میں لندن میں تھے تو دو قادیانیوں کو افغان حکومت نے جاسوسی کے الزام میں سنگسار کیا۔ اس واقعے پر انہوں نے لندن میں جلسہ منعقد کیا اور کئی ممالک کو تار بھجوائے۔ 1933ء میں نادر شاہ کے قتل پر قادیانیوں نے 'آہ نادر شاہ کہاں گیا' کا قادیانی الہام پیش کر کے افغان حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ اور ایسے دوسرے کئی واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قادیانیوں کو ہمیشہ ہی

افغانوں سے نفرت رہی اسی جذبے کے تحت ظفر اللہ شمال مغربی قبائلی علاقوں کو الگ قرار دے کر اپنے فرقے کے لئے امن وسلامتی اور تحفظ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1924ء میں جب کابل میں دو قادیانیوں کو سنگسار کیا گیا تو کئی قادیانیوں نے اپنے نام بطور رضا کار قادیان بھجوائے اور استدعا کی کہ انہیں تبلیغ کے لئے افغانستان روانہ کیا جائے۔ سر ظفر اللہ ان میں پیش پیش تھے اور مصر تھے کہ ان کو کابل میں احمدیت کی تبلیغ کرنے اور احمدیہ مشن قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ افغان حکومت کے خلاف ان کی نفرت اور غم وغصہ کا اظہار ان کی خودنوشت سوانح تحدیث نعمت اور ان کی تصنیف Servant of God میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ (14) اس لئے انہوں نے اپنی متبادل سکیم میں یہ تجویز پیش کی۔

بلوچستان کو بھی وہ ہندوستان سے کاٹ دینا چاہتے تھے تا کہ وہ یا تو اپنی آزاد ریاست قائم کر لیں یا افغانستان کا حصہ بن جائیں۔ (15) جب کہ مسلم رہنماؤں نے بلوچستان اور سندھ اور شمال مغربی علاقوں کو ہمیشہ آزاد مسلم ریاست میں شامل کیا اور 23 مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور میں بھی یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریتی علاقوں کو اس طرح ملایا جائے کہ وہ آزاد مملکتیں بن جائیں اور ان مملکتوں میں شامل ہونے والی وحدتیں خودمختار اور صاحب اختیار ہوں۔ یہ بات ظفر اللہ کی سکیم سے امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ (16)

شیخ عبدالماجد ان تاریخی حقائق پر غور کریں تو ان کو ظفر اللہ کی 'فوقیت زدہ' سکیم کی حقیقت معلوم ہو جائے گی اور انہوں نے جس انداز سے تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر ایک غلط نتیجہ نکالنے کی روش اختیار کی ہے اس کی اصلیت ان پر واضح ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ظفر اللہ کے نوٹ کے صرف وہ اقتباسات اپنی کتاب میں درج کئے ہیں جو اس کی حقیقت کو سمجھنے سے متعلق نہیں اور اصل مسئلہ کو قطعاً نظر انداز کر گئے ہیں۔ (17)

ہم ظفر اللہ کی دو فیڈریشنوں پر مشتمل علیحدگی کی سکیم اور آل انڈیا فیڈریشن کے قیام کی تجویز اور ان کے اور دیگر فیڈریشنوں کے تاج برطانیہ سے تعلقات وغیرہ کے نظریات کو محض اس عہد میں پیش

کی گئی متعدد سکیموں میں سے ایک سکیم سمجھتے ہیں۔ ان کی آل انڈیا فیڈریشن کی سکیم کے متعلق خود ان کا خیال تھا کہ یہ مسلمانوں کو قابل قبول نہ ہوگی۔ ان تجاویز کو غیر معمولی اہمیت دینا غلط ہے۔ انہوں نے یہ سکیمیں برطانیہ کے سیاسی مدبروں اور برطانوی رائے عامہ کی آگاہی کے لئے مرتب کیں۔ تحریک پاکستان میں ان کا یا جماعت احمدیہ کا عملی حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان سکیموں کا ذکر انہوں نے اپنی تصانیف میں نہیں کیا(18) اگر یہ واقعی کوئی اہم کارنامہ تھا تو وہ اس کا تذکرہ کرتے، یہ تو 1981ء میں ولی خان کی تاریخ پاکستان کے متعلق غلط بیانیاں تھیں جن کے نتیجے میں سر ظفر اللہ کی سکیمیں منظر عام پر آئیں اور لوگوں کو اصل حقائق معلوم ہوئے اور خود سر ظفر اللہ نے ان کی وضاحت میں ایک بیان جاری کیا۔

باب 11:

حوالے وحواشی

(1) شیخ عبدالماجد، فکر اقبال اور تحریک احمدیہ ص 415

(2) ایضاً

(3) ولی خان کا انٹرویو ہفت روزہ چٹان لاہور، 21 دسمبر 1981ء ص 12-13 نیز محمد فاروق قریشی، ولی خان اور قرارداد پاکستان، فکشن ہاؤس لاہور 1997ء

(4) Facts Are Facts, Vikas, New Delhi, 1987

(5) زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء 308-312

(6) جنگ راولپنڈی، 22 - 25 آگست 1987

(7) The Pakistan Times, Lahore, 24 January 1982

(8) The Pakistan Times, Lahore, 29 January 1982

(9) زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء ص 296 تا 308

(10) ظفر اللہ کہتے ہیں کہ فیڈریشنوں کے قیام کا نظریہ جس تفصیل سے اور وضاحت کے ساتھ میرے نوٹ میں پیش کیا گیا یہ بات میرے ہم عصروں یا مجھ سے پہلے آنے والوں کی کسی دستاویز یا بیان میں قطعاً موجود نہیں تھا، پاکستان ٹائمز 13 فروری 1982ء

(11) Muhammad Aslam Malik, The Making of Pakistan Resolution Oxford, 2001,p.175,251

(12) ماہنامہ انصار اللہ ربوہ نومبر دسمبر 1985ء، ظفر اللہ کا نوٹ پاکستان ٹائمز 13 فروری 1982ء (اردو ترجمہ)

(13) زاہد چوہدری حوالہ سابق ص 296 تا 312

(14) تحدیث نعمت ص 219، اور Servant of God, P. 51

(15) Muhammad Aslam Malik , The Making of Pakistan Resolution, Oxford, , 2001 pp.169,175

(16) محمد اسلم ملک، حوالہ سابق ص 213 ظفر اللہ کی سکیم کا مکمل متن کتاب کے ضمیمہ جی (G) میں موجود ہے۔

(17) شیخ عبدالماجد، اقبال اور احمدیت ص 6-245، فکر اقبال اور جماعت احمدیہ باب 22 صفحات 416-401 نیز صفحات 153-152

(18) تحدیث نعمت

- The Agony of Pakistan

-Servant of God

باب 12:

قادیانی سٹیٹ کا خواب

23 مارچ 1940ء کو قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد مسلم لیگ مطالبہ پاکستان کو لے کر آگے بڑھی۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمان آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد میں جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ پنجاب میں جن دو جماعتوں کو قرارداد پاکستان کے بعد سخت خطرہ درپیش تھا ان میں ایک قادیانی اور دوسرے سکھ تھے۔ سکھ لیڈر ماسٹر تاراسنگھ نے اعلان کیا کہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے مسلمانوں کو سکھوں کے خون کے سمندر سے گزرنا پڑے گا۔ قادیانیوں نے قرارداد پاکستان اور اسلامی مملکت کے قیام کی تائید میں کوئی آواز بلند نہ کی بلکہ اپنے لئے قادیان میں پوپ کی ریاست ویٹی کن کی طرز پر آزاد ریاست کے قیام کی تگ و دو شروع کر دی۔ مرزا بشیر احمد نے اس پروجیکٹ پر کام شروع کیا۔ انہوں نے قادیان کی مجوزہ ریاست کی حدود متعین کرنے کے لیے ایک نقشہ تیار کیا۔ اصل مقصد کو چھپانے کے لئے اس کا نام ماحول قادیان رکھا جو ضلع گورداسپور کی تحصیل گورداسپور اور بٹالہ کے حصوں پر مشتمل تھا۔ اسے 15 جولائی 1940ء کو تیار کر لیا گیا۔

مصنف 'تاریخ احمدیت' لکھتے ہیں کہ مرزا بشیر احمد نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے تبلیغ، تنظیم اور خرید اراضیات کے پیش نظر مرکز احمدیت قادیان کے ماحول کا ایک مفصل نقشہ اگست 1940ء میں شائع کیا جس میں قادیان کے اردگرد کا دس دس میل تک کا علاقہ دکھایا گیا تھا اور دیہات کی حدود، اہم راستوں اور نہروں کے علاوہ تھانے، ضلعوں کے صدر مقام، موٹروں کے اڈے، ڈاک بنگلے اور سکول بھی دکھائے گئے تھے، نقشہ میں ہر گاؤں کی مسلمان، ہندو، سکھ، مخلوط اور احمدی آبادی کو ظاہر کیا گیا تھا(1)۔ احمدی آبادی مسلمان آبادی سے الگ طور پر ظاہر کی گئی تھی۔ یہ نقشہ صرف خاص خاص افراد کو مہیا کیا گیا جن کو یہ معلوم تھا کہ مجوزہ قادیانی سٹیٹ کیسی ہو گی۔ قادیانیوں کا کہنا تھا کہ یہ نقشہ تبلیغی اور تنظیمی مقاصد کے پیش نظر شائع کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے کوئی

سیاسی مصلحت کارفرما نہیں لیکن پنجاب کے طول وعرض میں یہ بات پھیل گئی کہ احمدی انگریز حکومت سے ساز باز کر کے اپنی ریاست قائم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ قادیان میں مرزا محمود کا حکم چلتا تھا اور یہ علاقہ ان کی سٹیٹ تھی۔ اس کا ذکر برطانوی سول سروس کے بعض افسران جن میں او برائن شامل تھا کر چکے تھے۔ جسٹس کھوسلہ کے فیصلے (1935) میں بھی اس کا ذکر موجود تھا۔ اکالی سکھوں نے الزام لگایا کہ چونکہ دوسری جنگ عظیم جاری ہے اس لئے قادیانیوں نے انگریز سے وفاداری، فوجی بھرتی کے وعدوں اور گزشتہ سیاسی خدمات کی بنیاد پر قادیان کے اردگرد دس دس میل تک اپنی ریاست کی حدود مقرر کر دی ہیں اور یہ ریاست جلد قائم ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں سکھ وفد قادیان آئے تا کہ حقیقت حال معلوم کریں۔ قادیانیوں کی تردید کے باوجود اکالیوں نے اپنے سکھ جتھے 17 نومبر 1940ء کو قادیان میں داخل کر دیئے اور ایک قریبی علاقے میں اکالی کانفرنس منعقد کر کے حکومت کو قادیانی ریاست قائم کرنے کے خلاف متنبہ کیا۔ سکھ۔ قادیانی نزاع بڑھتا چلا گیا۔ پنجاب کے سکھ جرائد نے مجوزہ قادیانی ریاست کے خلاف اداریے لکھے۔ جیسے جیسے پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا رہا سکھ اور قادیانی پنجاب میں اپنی ریاست قائم کرنے کے لئے انگریز سے ساز باز کرتے رہے۔ اکالی دل نے آزاد پنجاب کا نعرہ لگایا تا کہ پنجاب کی سرحدوں میں تبدیلی کر کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو الگ کر دیا جائے۔ 4 جون 1943ء کو شرومنی اکالی دل نے مزعومہ سکھ ریاست کی حدیں متعین کیں۔ 16 مئی 1946ء کو سردار بلدیو سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ لارڈ ویول سے ملے اور خالصتان کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ادھر قادیانی قادیان کی مذہبی حیثیت کی بناء پر ایک صوبہ یا سٹیٹ کا مطالبہ کرتے رہے۔

سکھ اور قادیانی دونوں اپنی اپنی ریاستوں کیلئے جدوجہد کر رہے تھے۔ سکھوں نے پہلے آزاد پنجاب کا نعرہ لگایا پھر کانگریس سے ساز باز کر کے پنجاب کی تقسیم کا اعلان کیا۔ سکھ قیادت کے قائداعظم کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ مسلم لیگ تقسیم پنجاب کے حق میں نہ تھی وہ پورے پنجاب کو پاکستان میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ قادیانی مسلم لیگ کی حمایت میں نہیں بلکہ قادیان میں اپنا

تسلط برقرار رکھنے کے لئے تقسیم پنجاب کے خلاف تھے۔ مرزا بشیر احمد نے ایک رسالہ 'خالصہ ہوشیار باش' لکھا جس میں تقسیم پنجاب کی معاشی، مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر مخالفت کی اور اس کے ساتھ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے بٹوارے کے خلاف آواز بلند کی۔ مرزا بشیر احمد نے سکھ لیڈر دریام سنگھ کے ذریعے اکالی قیادت سے سیاسی مفاہمت کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ شیخ عبدالماجد کہتے ہیں کہ 1946ء میں سکھ لیڈر دریام سنگھ نے مرزا بشیر احمد سے کہا کہ ملک بٹ رہا ہے مسلمان آپ کو اپنانے کے لئے تیار نہیں پس آپ ان کی وجہ سے سکھوں اور ہندوؤں سے نہ بگاڑیں۔ میں آپ کی ہمدردی کے خیال سے کہتا ہوں کہ آپ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر لیں ہم آپ کی جماعت کو قادیان اور اس کے ماحول میں ایک قسم کی نیم آزاد حکومت دینے کو تیار ہیں۔(2)

شیخ عبدالماجد کے بقول مرزا بشیر احمد نے اس پیش کش کو نہ مانا۔ دراصل خالصہ پنتھ اس کے خلاف تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ قادیانیوں نے اپنی مزعومہ آزاد سٹیٹ یا نیم خود مختار صوبے کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی جواز پر مبنی ایک میمورنڈم لندن مشن کے ذریعے برطانوی وزیر اعظم ایٹلی کی حکومت کو پیش کیا لیکن حکومت کے سیاسی مشیر ہیرلڈ جے لاسکی نے اس کو ناقابل عمل بتایا کیونکہ مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان زور پکڑ رہا تھا اور پنجاب اسلامی ریاست میں شامل تھا۔ دوسرے قادیانی ریاست چاروں طرف سے گھری ہوئی لینڈ لاکڈ Land-locked ریاست بنتی تھی۔ اگرچہ قادیانی انگریز کو اس بات کا یقین دلاتے تھے کہ وہ مستقبل میں برطانوی مفادات کے لئے کام کریں گے اور یہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک بفر سٹیٹ ہو گی لیکن انگریز نے اس کو نہ مانا۔ اس کے علاوہ مجوزہ نیم خود مختار قادیانی ریاست کا قیام اس لئے ممکن نہ تھا کہ احمدیوں کی علیحدہ سیاسی حیثیت کا تعین نہ ہوا تھا اور قادیان کے دس دس میل کے اندر جن علاقوں کو اس ریاست میں شامل کرنے کی تجویز تھی ان میں سے کئی علاقوں میں ہندو سکھ اکثریت تھی اور احمدیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ قادیانیوں نے ماسٹر تارا سنگھ، بلدیو سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ سے رابطہ قائم کیا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ لارڈ مونٹ بیٹن

نے جب 3 جون کا انتقال اقتدار کا منصوبہ پیش کر دیا تو قادیانی ریاست کا خواب دم توڑ گیا۔

قادیانیوں نے 46-1945ء کے انتخابات میں بعض یونینسٹ امیدواروں کی حمایت کی تھی اور ان کا ایک ممبر فتح محمد سیال آزاد حیثیت سے کامیاب ہوا تھا لیکن مسلم لیگ نے پنجاب کے مسلم حلقوں میں 86 نشستوں میں سے 75 نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ اس کامیابی سے یونینسٹ پارٹی کو سخت دھچکا لگا تھا لیکن فروری 1946ء میں یونینسٹ، اکالی اور کانگریس گٹھ جوڑ سے خضر وزارت بنالی گئی، اس میں دس مسلمان یونینسٹ شامل تھے۔ مسلم لیگ نے خضر وزارت کے خلاف تحریک چلائی 3 جون کے منصوبے کے تحت تقسیم پنجاب کو آئینی حیثیت حاصل ہو چکی تھی حکومت نے اس کے فیصلے کے لئے 23 جون 1947ء کا دن مقرر کیا۔ 17 جون 1947ء کو مرزا محمود نے سکھ قوم کے نام ایک اپیل جاری کی جس میں انہیں مشورہ دیا کہ پنجاب کی تقسیم پر راضی نہ ہوں اس سے ان کے سیاسی اور معاشی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے دعا کی کہ یہ ملک بٹے نہیں اور اگر بٹے تو اس طرح بٹے کہ پھر مل جانے کے راستے کھلے رہیں لیکن کانگریس کے ایماء پر غیر مسلم ممبران اسمبلی تقسیم پر راضی ہو گئے۔ گورنر پنجاب ایوان جینکنز بھی سکھوں کے مطالبات کا حامی تھا۔ ان حالات میں قادیان کو بچانے اور آزاد یا نیم مختار قادیانی صوبہ یا ریاست قائم کرنے کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔

اب قادیانی پاکستان اور مسلم لیگ کی طرف جھکنے لگے کیونکہ ان کے لئے اب اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ظفر اللہ نواب بھوپال کے آئینی مشیر تھے جو ہندوستانی ریاستوں کے چیمبر آف پرنسز کے چانسلر تھے۔ ابھی تک ظفر اللہ نے تحریک پاکستان کے لئے کوئی خدمت انجام نہ دی تھی لیکن لیگی قیادت کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے وہ خضر حیات سے ملے اور انہیں وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دینے کی تجویز دی تاکہ مسلم لیگ حکومت سازی کر سکے، جو اس نے مجبوراً مان لی۔ قادیانی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ حکومت پاکستان ظفر اللہ کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دے گی اور اسی منصب کے حصول کے لئے وہ زور لگا رہے تھے لیکن 25 دسمبر 1947ء کو قائد اعظم نے ان کو وزیر خارجہ بنا دیا۔ قائد

اعظم حسین شہید سہروردی کو وزیر خارجہ بنانا چاہتے تھے لیکن وہ اس بات سے ناراض تھے کہ خواجہ ناظم الدین کو مشرقی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا تھا۔ ظفر اللہ کو وزیر خارجہ مقرر کرنے کی پاکستانی پریس نے مخالفت کی کیونکہ وہ قادیانی تھے انہوں نے مسلم لیگ میں کبھی شمولیت اختیار نہ کی۔ قائد اعظم جانتے تھے کہ سر ظفر اللہ کے انگریزوں سے قریبی روابط ہیں اور مونٹ بیٹن پاکستان کے خلاف ہے اس طرح ممکن ہے کہ ظفر اللہ اپنے ذاتی رسوخ سے حکومت برطانیہ کے ساتھ معاملات کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔

مرزا محمود قادیان کے آمر مطلق تھے یہ علاقہ ان کا مذہبی اور سیاسی مرکز تھا جہاں ان کا حکم چلتا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ بے بسی کے عالم میں یہاں قیام پذیر تھے اور پاکستان آنا چاہتے تھے۔ ان کے منصوبے ناکام ہو چکے تھے۔ قادیان ہندوؤں اور سکھوں کے نرغے میں تھا۔ اگست 1947ء کے آخر میں وہ لاہور کی طرف چل پڑے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے برقعہ پہن لیا تھا۔ بعض افراد کہتے ہیں کہ انہوں نے ہندو جوگی کا روپ دھار لیا تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ [illegible] بن کر وہاں سے فرار ہوئے۔ یہ سب باتیں ان کو بدنام کرنے کے لئے ان کے [illegible] نے گھڑی ہیں۔ اس احمدی نے جس کے سامنے وہ موٹر میں بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے تھے اپنے سگے بھائی کو ان کی روانگی کا واقعہ سنایا اور اس نے راقم کو ان کی قادیان سے روانگی کا تمام واقعہ بتایا۔ اس کو اس بات پر افسوس تھا کہ حضرت صاحب احمدیوں کو آگ اور خون میں تڑپتا چھوڑ کر لاہور آ گئے لیکن وہ یہ بھی کہتا تھا کہ یہ ہجرت حضرت مرزا صاحب کے ایک الہام ''داغ ہجرت'' کے مطابق تھی۔

باب12:

حوالے وحواشی

(1) دوست محمد شاہد، تاریخ احمدیت جلد نہم ص 104

(2) اقبال اور احمدیت ص 306 الفضل 23 اپریل 1955ء

منتخب کتابیات

حرفِ اقبال	لطیف احمد شروانی
علامہ اقبال: تقریریں، تحریریں اور بیانات	مترجم اقبال احمد صدیقی
اقبال اور قادیانی	نعیم آسی
اقبال اور قادیانیت	شورش کاشمیری
اقبالی مجرم	ایضاً
فیضان اقبال	ایضاً
اقبالیات شورش	مشتاق احمد
ختم نبوت اور عقیدہ اقبال	عبدالمجید خان راجد
اقبال اور قادیانیت	خالد شبیر احمد
تاریخ محاسبہ قادیانیت	ایضاً
اقبال اور احمدیت	بشیر احمد ڈار
انوار اقبال	ایضاً
دین بہائی اور احمدیت	سید محمد علی شاد
زندہ رود (تین جلدیں)	ڈاکٹر جاوید اقبال
کلیاتِ مکاتیب اقبال حصہ اول تا چہارم	مظفر حسین برنی
اقبال نامہ (حصہ اول و دوم)	شیخ عطا اللہ
خطوط اقبال بنام جناح	مترجم حمید اللہ ہاشمی
خطوطِ اقبال	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
کتابیاتِ اقبال	ایضاً
تصانیفِ اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ	ایضاً

اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ	ڈاکٹر ایوب صابر
تصورِ پاکستان: اقبال پر اعتراضات کا جائزہ	ایضاً
معترضینِ اقبال	ایضاً
اقبال کا فکری نظام اور پاکستان کا تصور	پروفیسر فتح محمد ملک
ملفوظاتِ اقبال	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک
اساسیاتِ اقبال	ڈاکٹر وحید قریشی
اقبال کے حضور	سید نذیر نیازی
دانائے راز	ایضاً
ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ	مترجم شاہد اقبال کامران
حیاتِ اقبال میں نقدِ اقبال	ڈاکٹر تحسین فراقی
علامہ اقبال: حیات، فکر و فن	ڈاکٹر سلیم اختر
افکارِ اقبال	ڈاکٹر محمد ریاض
افکارِ اقبال	محمد حامد
نظریاتِ اقبال	کلیم نشتر
اقبال اور مسلم مفکرین	ڈاکٹر ملک حسن اختر
اقبال کا فلسفہ سیاسیات	پروین شوکت علی
مفکرِ پاکستان	محمد حنیف شاہد
اقبال اور انجمن حمایت اسلام	ایضاً
اقبال کے ملی افکار	محمود عاصم
مقالاتِ اقبال	سید عبدالواحد معینی

اقبالیات کا تنقیدی جائزہ — قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

سرسید سے اقبال تک — قاضی جاوید

عام فکری مغالطے — علی عباس جلالپوری

گفتارِ اقبال — محمد رفیق افضل

اقبال کا سیاسی کارنامہ — محمد احمد خاں

اقبال کے آخری دو سال — عاشق حسین بٹالوی

اقبال اور سیاستِ ملی — رئیس احمد جعفری

اقبال کا سیاسی سفر — محمد حمزہ فاروقی

آتشِ چنار — شیخ عبداللہ

مجلس احرار اور تاریخی تحریف کی یلغار — ماسٹر تاج الدین لدھیانوی

تحریکِ پاکستان میں پنجاب کا کردار — محمد اعظم چوہدری

پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد ۵ — زاہد چوہدری

میاں فضل حسین کے خطوط — مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد

ان کہی داستانِ کشمیر — ڈاکٹر سلام الدین نیاز

تاریخِ کشمیر — سید محمود آزاد

اقبال اور کشمیر — سلیم خان گمی

اقبال اور کشمیر — جگن ناتھ آزاد

اقبال اور تحریکِ آزادیِ کشمیر — غلام نبی خیال

روزگارِ فقیر جلد اول و دوم — فقیر وحید الدین

روایاتِ اقبال — ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

اقبال کی ابتدائی زندگی — ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین

القول الفیصل	ایضاً
مسلمانوں کے حقوق اور نہرو رپورٹ	ایضاً
ہندوستان کے مسئلہ کا سیاسی حل	ایضاً
سیرت مسیح موعود	ایضاً
آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور احرارِ اسلام	ایضاً
اقبال اور احمدیت	شیخ عبدالماجد
فکر اقبال اور تحریکِ احمدیہ	ایضاً
مظلوم اقبال	شیخ اعجاز احمد
احمدیت اقبال کی نظر میں	عبدالمالک خاں
نورالدین اعظم	شائع کردہ ینگ مین احمدیہ ایسوسی ایشن، لاہور
حیاتِ نورالدین	اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
تحریکِ احمدیت	مولوی محمد علی لاہوری
تحدیثِ نعمت	سر ظفر اللہ خاں
علامہ اقبال مرحوم اور بانی سلسلہ احمدیہ	ڈاکٹر اللہ بخش
مجددِ اعظم	ڈاکٹر بشارت احمد
مراۃ الاختلاف	ایضاً
رسالہ تبدیلیِ عقیدہ مولوی محمد علی	محمد اسماعیل
حیات طیبہ	شیخ عبدالقادر سوداگر مل
مجدد کامل	خواجہ کمال الدین
تحریکِ احمدیت اور اقبال	اختر حسین گیلانی

القول الفصل
تبلیغِ رسالت جلد اول تا ششم
سیرت المہدی
اصحابِ احمد
سوونیئر 87-1986
ماہنامہ انصار اللہ، ربوہ، سر ظفر اللہ نمبر نومبر - دسمبر 1985ء
ماہنامہ الفرقان، ربوہ، جولائی - اگست 1967ء
ضمیمہ ماہنامہ خالد، ربوہ - ستمبر 1985ء

میر حامد سیالکوٹی
میر قاسم علی قادیانی
مرزا بشیر احمد ایم اے
صلاح الدین ملک
مجلس خدام الاحمدیہ کراچی

متفرق فائل

روزنامہ الفضل، قادیان
ہفت روزہ لائٹ، لاہور
ہفت روزہ پیغام صلح، لاہور
ریویو آف ریلی جنز، قادیان (انگریزی - اردو)

SELECT BIBLIOGRAPHY

Ikram Ali Malik, A Book of Readings On the History of the Punjab,1799-1947, Research Society of Pakistan, Lahore, 1979

G. Allana (Edit), Pakistan Movement: Historic Documents, Islamic Book Service, Lahore 1977

Sarfraz Hussain Mirza, Syed Farooq Hasnat, Sohail Mahmood, The Sikh Question, Punjab University Lahore, 1986

Syed Abdul Vahid, Studies in Iqbal, Lahore 1977

M. M. Sharif, A History of Muslim Philosophy Vol. (II) Karachi 1983-chap. LXXXI

Bashir Ahmad, Ahmadiyyah Movement: British–Jewish Connections, Rawalpindi (Islamic Study Forum P.O Box 639), 1994

Yousaf Saraf, Kashmir fights for freedom, 2 Volumes, Lahore, 1997

K. Warkoo. Central Asia and Kashmir, Gian Publishing House, New Delhi, 1989

Zarina Salamat, The Punjab in 1920s, Royal Book Academy, Karachi, 1979.

W.C. Smith, Modern Islam In India, Lahore, 1943, Rev. 1954,

Dr. L.S. May, The Evolution of India – Muslim Thoughts After 1875, Lahore 1970, Chap IV, Ahmadiyyah Movement.

Sharif-ud-Din Pirzada, Foundation of Pakistan, Karachi 2 Vol, 1970.

A. M. Zaidi, Evolution of Muslim Political Thoughts, Vol, V 1929-1936.

S. A. Vahid (Edit), Thoughts And Reflections of Iqbal, Lahore.

Muhammad Aslam Malik, The Making of The Pakistan Resolution, Oxford, 2003.

V. Grover (Edit), The Story of Punjab Vol 1-3, Delhi,

Shahid Hussain Razzaqi (Edit), Discourses of Iqbal, Lahore

Iqbal – New Dimensions, A collection of unpublished and rare Iqbalian studies, compiled and annotated and translated by M. Ikram Chaghatai, Sang-e-Meel Publications, Lahore 2003

Rafiq Zakaria, Iqbal, The Poet and the Politician, Viking Delhi, 1994

Hafeez Malik (Edit), Iqbal-Poet Philosopher of Pakistan, New Delhi, 1977

Iqbal Singh, The Ardent Pilgrim, London 1951

Azim Hussain, Mian Fazl-i-Hussain, A Political Biography, London 1966

Malik Iftikhar Haider, Sikander Hyat Khan, 1892-1942, A Political Biography, Islamabad

Victoria Schofield, Kashmir In Conflict, London, 2000

B. A. Dar, Letters and Writings of Iqbal, Lahore

Y. B. Mathur, Growth of Muslim Politics in India, Lahore

Phoenix, His Holiness, Lahore

Pandit Jawaharlal Nehru, Selected Works, Longman, London.

Dr. Mahmood A. Ghazi, Islam and Qadianism.

Molvi Muhammad Ali, Sir Muhammad Iqbal's statement regarding Qadianis.

Mirza Mahmud Ahmad, The Truth About Split.

Sir Zafrullah Khan, Servant of God

Sir Zafrullah Khan, Agony of Pakistan.

A.R. Dard, Life of Ahmad.

Review of Religions, Qadian, June 1935, March 1936.